بسلسلہ تحریک جماعتِ اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ'' حصہ دوم

تاریخ جماعتِ اسلامی

کا ایک گمشدہ باب

نقضِ غزل

تالیف

ڈاکٹر اسرار احمد

شائع کردہ:

تنظیمِ اسلامی

مرکزی دفتر: A-67 علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور۔ 54000

فون: 36293939,36316638,36366638، فیکس 36313131

ای میل: markaz@tanzeem.org www.tanzeem.org

فہرست

❁ دیباچہ 4

❁ **جائزہ کمیٹی سے اجتماع ماچھی گوٹھ تک 17**

❁ ابتدائیہ 18

❁ جائزہ کمیٹی کی رپورٹ، اور
اس کے خلاف مولانا مودودی کی چارج شیٹ 19

❁ مولانا اصلاحی کا جوابی حملہ،
اور جائزہ کمیٹی کا دفاع 33

❁ مولانہ مودودی اور مولانا اصلاحی کی رفاقت کا تاریخی پس منظر
اور جماعتِ اسلامی کا تنظیمی ڈھانچہ 61

❁ مولانہ مودودی اور مالانا اصلاحی کے استعفے،
مصالحت کی نئی کوشش، اور مؤلّف کتاب کا موقف 76

❁ **اجتماع ماچھی گوٹھ اور اس کے بعد 100**

❁ ماچھی گوٹھ کا اجتماعِ ارکان 110

❁ اجتماع ماچھی گوٹھ کے بعد 148

❁ مولانا اصلاحی اور دیگر اکابر کی علیحد گی 155

❁ نقضِ غزل، کا حاصل 160

❁ **مؤلّف کا استعفاء از رکنیتِ جماعت 168**

❁ اور ڈھائی سال قبل کی درخواست رکنیت 169

مولانا اصلاحی کا استعفاء..192

اور مولانا مودودی کے ساتھ تیز و تند خطوط کا تبادلہ 194

نگاہ بازگشت اور حاصلِ کلام.................................. 228

- مؤلف، نقض غزل، کا قولِ فیصل 229
- نقض غزل، پر ردّ عمل کا جائزہ 264
- مکتوب گرامی جناب نعیم صدیقی اور جوابی وضاحت 303

ضمیمہ 319

- تحریک اسلامی کے قائد و امیر کے حقوق و اختیارات کے موضوع پر مولانا مودودی کی ایک اہم تحریر 319
- میاں طفیل محمد کی جانب سے الہدٰی اور مسئلہ خواتین کے ضمن میں تائید کا شکریہ۔ اور دعوت اتحاد پر تعاون علی البر کی پیشکش......................................336
- میاں طفیل محمد صاحب کا جواب 340

دیباچہ

'نقض' کا عنوان سورۂ نحل کی آیت نمبر ۹۲ سے ماخوذ ہے جس میں ایک ایسی حواس باختہ بڑھیا کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو محنت و مشقت جھیل کر سوت کاتتی ہے، اور پھر خود ہی اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے گویا اپنے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیتی ہے۔ جماعت اسلامی پاکستان کی تاریخ میں بھی ۵۷-۱۹۵۶ء میں ایک ایسا ہی موقع آیا تھا، جب مولانا مودودی مرحوم نے اپنے بعض غلط اقدامات سے ایسی صوت پیدا کر دی کہ مولانا عبدالجبار غازی، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا عبدالغفار حسن، مولانا عبدالرحیم اشرف، مولانا افتخار احمد بلخی، شیخ سلطان احمد، میاں فضل احمد، چودھری عبدالحمید اور جناب سعید ملک سمیت جماعت کی قیادت کی پوری صف دوم، اور راقم الحروف ایسے بہت سے نوجوان کارکن جماعت سے علیحدہ ہو گئے۔ راقم نے جب ۱۹۶۶ء میں مولانا مودودی مرحوم کے ان اقدامات اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات و واقعات کی 'روداد' قلمبند کرنے کا ارادہ کیا تو دفعۃً ذہن سورۂ نحل کی متذکرہ بالا آیت کی جانب منتقل ہوا، چنانچہ ''نقض غزل'' ہی کو اس تلخ داستان کا عنوان بنا لیا۔

اس تحریر کا آغاز ہی ان الفاظ سے ہوتا ہے کہ: 'راقم الحروف نے جو بیان جائزہ کمیٹی کی خدمت میں پیش کیا تھا وہ کمیٹی کو پیش کئے جانے والے تحریری بیانوں میں سب سے زیادہ طویل تھا''۔ لہٰذا ضروری ہ کہ سب سے پہلے ''جائزہ کمیٹی'' کا اجمالی تعارف کرا دیا جائے۔ اور اس کے لیے بجائے اس کے کہ اب کچھ لکھا جائے مناسب ہے کہ انہی الفاظ کو درج کر دیا جائے جو راقم نے ۱۹۶۶ء میں اپنے دس سال قبل کے تحریر شدہ 'بیان' کو ''تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع کرتے وقت اس کے دیباچے میں تحریر کئے تھے۔ یعنی:

''پیش نظر تحریر دراصل ایک بیان ہے جو بحیثیت رکن جماعت اسلامی راقم

الحروف نے اکتوبر ۵۶ء میں جائزہ کمیٹی کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جماعت اسلامی پاکستان کے اس کُل پاکستان اجتماع کے موقع پر جو کراچی میں نومبر ۵۵ء میں منعقد ہوا تھا، ایک اجلاس مرکزی مجلس شوریٰ کا منعقد ہوا جس کے سامنے وہ بہت سے اعتراضات اور متبادل تجاویز و مشورے پیش کیے گئے جو جماعت کی پالیسی اور نام سے متعلق جماعت کے اراکین کی جانب سے موصول ہوئے تھے اور جن پر معترضین اور مجوزین حضرات اجتماع ارکان میں بحث کرنا چاہتے تھے۔ مرکزی مجلس شوریٰ نے اس اندیشے کی بنا پر کہ اگر طریق کار اور دستور سے متعلق ان دقیق بحثوں کو ارکان کے اجتماع میں چھیڑنے کی اجازت دے دی گئی تو ہنگامہ برپا ہو جائے گا، یہ فیصلہ کیا کہ ان اعتراضات اور تجاویز پر غور کرنے کے لیے کہ جن میں نظم جماعت اور اس کے دستور میں بحث کی گئی تھی ایک مجلس تدوین دستور کا انتخاب عمل میں لایا جائے جس میں جماعت کے تمام تنظیمی حلقوں کی تعداد ارکان کے تناسب سے نمائندگی دی جائے تاکہ یہ مجلس جماعت کے لیے ایک نیا دستور مدوّن کرے (اس مجلس میں حلقہ اوکاڑہ کے دو نمائندوں میں ایک راقم الحروف بھی منتخب ہوا تھا) اور ان اعتراضات اور تجاویز پر غور کرنے کے لیے جو جماعت کے طریق کار اور پالیسی سے متعلق ہیں ایک جائزہ کمیٹی کی تشکیل کی جائے جس کے سپرد یہ خدمت ہو کہ وہ تمام پاکستان کا دورہ کر کے جماعت کے عمومی حالات کا جائزہ لے اور ارکانِ جماعت سے فرداً فرداً رابطہ قائم کر کے ان کی بے چینی کے اسباب معلوم کرے اور جو تجاویز ان کے ذہنوں میں ہوں ان کو مرتب کر کے ایک جامع رپورٹ مرکزی مجلس شوریٰ کے سامنے پیش کرے۔

یہ مجلس ابتداءً آٹھ ارکان پر مشتمل تھی، لیکن چند ماہ بعد بعض وجوہات کی بنا پر اس کو مختصر کر دیا گیا اور حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کی سرکردگی میں ان کے علاوہ مرکزی مجلس شوریٰ کے تین اور بزرگ اراکین یعنی مولانا عبدالجبار غازی صاحب، مولانا عبدالغفار حسن صاحب اور جناب شیخ سلطان احمد صاحب [۱] پر مشتمل اس ''جائزہ کمیٹی'' نے تقریباً آٹھ ماہ کے عرصے میں پورے پاکستان کا دورہ کر کے اپنے فرائض مفوضہ [۲] کو ادا کیا اور نومبر ۵۶ء میں ایک رپورٹ مرکزی مجلس شوریٰ

کی خدمت میں پیش کر دی۔

یہی وہ جائزہ کمیٹی تھی جس کی خدمت میں پیش نظر بیان پیش کیا گیا''۔

اس کے ساتھ ہی جائزہ کمیٹی کے تینوں ''بزرگ اراکن'' اور کمیٹی کے ''فرائض مفوضہ'' کے بارے میں بطور وضاحت یہ حاشیے درج کیے گئے تھے:

(ا) یہ خیال رہے کہ یہی وہ تین حضرات ہیں جن پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی کی غیر موجودگی میں وقتاً فوقتاً جماعت اسلامی پاکستان کی امارت کی ذمہ داری ڈالی گئی۔

(۲) مرکزی مجلس شوریٰ منعقدہ ۱۵ تا ۱۸/ مارچ ۵۶ء نے جائزہ کمیٹی کے معلق حسب ذیل قرارداد منظور کی تھی۔

۱۔ جماعت کی پالیسی، نظم اور حالات کے متعلق جو اعتراضات، شکایات اور تجاویز سالانہ اجتماع کے موقع پر موصول ہوئی تھیں، ان کے بھیجنے والوں سے گفتگو کر کے یہ تحقیق کریں کہ ان شکایات کی بنیاد کیا ہے اور وہ اصلاح کے لیے ایجابی صورت میں کیا تجاویز پیش کرتے ہیں۔

۲۔ جماعت کے ارکان میں اگر کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس کی پالیسی، طریق کار اور حالات کے بارے میں کچھ تبدیلی چاہتے ہیں تو ان سے تحقیق کریں کہ وہ کیا تبدیلی چاہتے ہیں۔

جائزہ کمیٹی نے اپنی رپورٹ تقریباً ایک سال کی محنت و مشقت کے بعد وسط نومبر ۱۹۵۶ء میں پیش کی اور اس پر غور کرنے کے لیے مرکزی مجلس شوریٰ کا اجلاس ۲۵/ نومبر کو شروع ہوا۔ اور اس روز سے لے کر اواخر فروری ۵۷ء میں ماچھی گوٹھ کے اجتماع ارکان کے اختتام تک جماعت ایک شدید بحران سے گزری جس نے ۱۹۴۱ء میں قائم ہونے والی جماعت کو ''ختم'' اور ایک نئی جماعت اسلامی کو ''جنم'' دیا۔ چنانچہ اسی بحران کی داستان ہے جو ''نقض غزل'' کے عوان سے پیش خدمت ہے۔ اس بحرانی دور کے بعض ''ناخوشگوار اور کریہہ واقعات'' کی جانب راقم الحروف نے رکنیت جماعت سے مستعفی ہوتے ہوئے

اپنے استعفے کے خط میں اشارہ کیا تھا جس کا اقتباس ذیل میں درج کیا جا رہا ہے، اس لیے کہ یہی گویا اس 'نقضِ غزل' کا اشاریہ یا انڈکس ہے۔ (واضح رہے کہ میری یہ تحریر اجتماعِ ماچھی گوٹھ کے کل دو ماہ بعد کی ہے، جو ۲۹ ر رمضان المبارک ۱۳۷۶ھ مطابق اپریل ۱۹۵۷ء بحالت اعتکاف لکھی گئی تھی!)

''جائزہ کمیٹی کی رپورٹ پیش ہونے سے لے کر اجتماع ماچھی گوٹھ تک جماعت اسلامی پاکستان کے حلقوں میں جن ناخوشگوار اور کریہہ واقعات کا چکر چلا ہے ان کو محض یاد کرنے ہی سے انسان کو سخت اذیت اور کرب کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اس پندرہ روزہ شوریٰ کے دوران جس میں رپورٹ پر غور ہوا، شوریٰ کے فعال عناصر کا وہ متقابل اور متحارب گروہوں میں تقسیم ہو جانا، بہت ردوقدح کے بعد اور بالآخر خوف انتشار کی بنا پر بالاکراہ کسر وانکسار کے ذریعے ایک لایعنی اور مہمل قرارداد کا پاس ہونا، پھر اس کی مختلف توجیہیں اور جماعت کے مختلف حلقوں کی طرف سے مختلف ردعمل، اس کے نتیجے کے طور پر سازشوں کی برملا تہمتیں، اکابرین جماعت کا ایک دوسرے کے بارے میں انتہائی گری ہوئی رایوں کا اظہار، سعید ملک صاحب کا سنسنی خیز استعفاء اور اس کا اسی انداز میں قیم جماعت کی طرف سے تعاقب، امیر جماعت کا جائزہ کمیٹی کے چاروں ارکان پر نجویٰ، گروہ بندی اور ''غیر شعوری'' سازش کا الزام، مولانا امین احسن صاحب کا استعفاء از رکنیت جماعت، امیر جماعت کا جذباتی انداز میں استعفاء از امارت جماعت، جماعت کے اندر ایک مہم کے انداز میں امیر جماعت پر قرارداد ہائے اعتماد، دو اراکین مرکزی شوریٰ کی رکنیت جماعت کا تعطل، مولانا عبدالجبار غازی صاحب کا استعفاء از رکنیت جماعت، مولانا عبدالغفار حسن صاحب کا استعفاء از مناصب جماعت، سلطان احمد صاحب کا استعفاء از رکنیت شوریٰ ...... یہ سارے معاملات میرے لیے اس اعتبار سے تو غیر متوقع نہ تھے کہ میری تو رائے ہی یہ تھی کہ اب جماعت ایک خالص سیاسی جماعت بن گئی ہے اور یہ اس کے ناگزیر ثمرات ہیں، لیکن اس لحاظ سے کمر توڑ دینے والے تھے کہ جماعت میں اخلاقی تنزل اور گراوٹ کے بارے میں اتنی پست رائے میں نے ابھی قائم نہیں کی تھی......''

۱۹۶۶ء میں جب راقم نے اپنی کتاب ''تحریک جماعت اسلامی'' شائع کی 'نقض غزل' کا اکثر و بیشتر حصہ تسوید و تبییض کے مراحل سے گزر چکا تھا۔ لٰہذا راقم کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ اسے بھی کتاب میں شامل کر دے۔ لیکن بوجوہ اس خیال کو ترک کر دیا گیا۔ ان 'وجوہ' میں سے ایک تو وہ ہے جس کی جانب سی تحریر میں اشارہ ہے جو 'میثاق' ستمبر ۱۹۶۶ء میں جب 'نقض غزل' کی سلسلہ وار اشاعت کا آغاز ہوا تو اس کے تعارفی نوٹ کی حیثیت سے درج کی گئی تھی، اور جسے اب بھی من و عن شامل اشاعت کیا جا رہا ہے۔ (دیکھئے 'نقض غزل' کے ٹائٹل کا اندرونی صفحہ!)

'نقض غزل' کو ''تحریک جماعت اسلامی ایک تحقیقی مطالعہ'' میں شامل نہ کرنے کا ایک دوسرا سبب یہ تھا کہ میرے ذہن میں اس کتاب کے حصہ دوم کا خاکہ مکمل ہو گیا تھا، جس کا بابِ اول اسے بننا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب 'میثاق' مین اس کی سلسلہ وار اشاعت ہوئی تو پانچویں پرچوں کی 'فہرست مضامین' اور ہر قسط کے عنوان میں اس کی صراحت موجود تھی کہ یہ ''تحریک جماعت اسلامی حصہ دوم'' کے سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔

''تحریک جماعت اسلامی'' کے اس مجوزہ حصہ دوم کو تین ابواب پر مشتمل ہونا تھا:

ایک تو یہی 'نقض غزل' جس کا حصہ اول اس وقت پیش نظر ہے، اور حصہ دوم انشاء اللہ آئندہ شمارے میں پیش کر دیا جائے گا!

دوسرا باب 'تعمیر جدید' کے عنوان سے مولانا مودودی کے ان تین نہایت اہم لیکن اسی قدر 'خطرناک' نظریات پر بحث و تنقید پر مشتمل ہوتا جن پر اجتماع ماچھی گوٹھ کے بعد ایک 'نئی جماع اسلامی' کی تعمیر جدید ہوئی۔ یعنی:

ایک یہ کہ کسی بھی تحریک کے اصول جب آغاز میں بیان ہوتے ہین تو کچھ اور ہوتے ہیں، لیکن جب عمل کی دنیا میں حقائق و واقعات کا سامنا ہوتا ہے تو ان میں 'حکمت عملی' کے تقاضوں کے مطابق لازماً تغیر و تبدل ہو جاتا ہے اور یہ 'قاعدۂ کلیہ' اتنا اٹل ہے کہ دوسروں کا تو ذکر ہی کیا خود نبی اکرم ؐ کی تحریک بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہ سکی تھی (۱)! اعاذ نا اللہ من ذالک

---

(۱): مولانا امین احسن اصلاحی نے مولانا مودودی مرحوم کے اس نظریہ حکمت عملی پر بڑی بھرپور ◄◄

دوسرے یہ کہ مشہور اور ممدوح لوگوں کی شخصیتیں جو کچھ کتابوں میں نظر آتی ہیں حقیقتاً ویسی نہیں ہوتیں بلکہ گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان ان کاغذی تصویروں سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ اور یہ اصول بھی اتنا قطعی ہے کہ خود صحابۂ کرام رضوان اللہ عنہم اجمعین بھی جیسے کچھ تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں نظر آتے ہیں واقعتاً ویسے نہیں تھے، یہاں تک کہ اگر ان کے دور میں بھی کوئی جائزہ کمیٹی تشکیل دی جاتی تو وہ اس سے بھی کہیں زیادہ گھناؤنا گند جمع کر کے لاسکتی تھی جتنا جماعت اسلامی کی جائزہ کمیٹی نے پیش کیا ہے۔ (معاذ اللہ!!)

تیسرے یہ کہ تحریکیں صرف اصولوں کی بنیاد پر نہیں چل سکتیں بلکہ ان کے لیے

ع ''نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پر سوز''

کی حامل شخصیتیں ناگزیر ضرورت کے طور پر درکار ہوتی ہیں، لہٰذا اگر عالم واقعہ میں ایسی کوئی شخصیت دستیاب نہ ہو تو ''پیراں نمے پرند، مریداں مے پرانند!'' کے مطابق ایسی کسی شخصیت کا مصنوعی طور پر تیار کرنا نہ صرف درست بلکہ لازمی ہے!

اور تیسرے اور آخری باب ''نوبت بایں جارسید'' کے عنوان سے تحریر کیا جانا مقصود تھا جس میں ''لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ'' (الکہف: ٦) کے مصداق متذکرہ بالا تینوں نظریات کے ان آثار وثمرات اور نتائج وعواقب کا اجمالی جائزہ پیش ہوتا، جنہوں نے جماعت اسلامی کی مجموعی پالیسی اور اس کے وابستگان کے مزاج کو اس درجہ تبدیل کر کے رکھ دیا ع

''کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی!''

◀◀ تنقید کی تھی لیکن اول تو اس کا جو جواب مولانا مودودی نے دیا، اور پھر جواب الجواب تھی لیکن اول تو اس کا جو جواب مولانا مودودی نے دیا، اور پھر جواب الجواب کا جو سلسلہ چلا وہ اتنا طویل ہو گیا کہ جماعت کے اکثر لوگ اس کی علمی واستدلالی بول بھلیوں میں گم ہو کر رہ گئے...... دوسرے خود مولانا نے اس پر صرف علمی تنقید پر اکتفا کی اور اس کے جو نتائج تحریکی وتنظیمی سطح پر ظاہر ہو سکتے تے، اور بالفعل ہو رہے تھے، ان کی جانب توجہ نہ کی۔ لہٰذا اس کی شناعت سے جماعت کے عام ارکان اور کارکنوں کو متنبہ کرنے کا حق ادا نہ ہو سکا!

راقم کے ذہن میں ابھی یہ مواد پک ہی رہا تھا کہ ایک بالکل نئی صورت حال پیدا ہو گئی۔ اور وہ یہ کہ جیسے ہی ''تحریک جماعت اسلامی'' شائع ہوئی ایک جانب اخبارات و رسائل اور دوسری جانب انفرادی خطوط میں تبصرے شروع ہو گئے جن میں جماعت اسلامی سے علیحدگی اختیار کرنے والوں پر ایک ''الزام'' تقریباً بالاتفاق عائد کیا گیا۔ مثلاً روزنامہ نوائے وقت لاہور نے لکھا:

''تدارک کی مؤثر ترین بلکہ اظہر من الشمس صورت یہ ہوتی ہے کہ انسان جس بات کو سچ اور درست سمجھے اس کے صرف انفرادی اظہار پر اکتفا نہ کرے بلکہ اپنے ہم رائے وہم خیال اصحاب سے مل کر اپنے نزدیک سچ اور دست کو بروئے کار بھی لائے۔ یہ عجیب بات ہے کہ جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والوں نے اپنے اس اقدام کے بارے میں لکھا تو بہت کچھ ہے لیکن اب تک کوئی مثبت اقدام نہیں کیا''۔

اسی طرح روزنامہ 'کوہستان' کے تبصرہ نگار نے تحریر کیا:

''اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک سوال قاری کے ذہن میں بڑی شدت کے ساتھ ابھرتا ہے کہ جماع اسلامی کے بارے میں جن لوگوں کو شکایت تھی کہ وہ صحیح نہج پر کام نہیں کر رہی ہے اور اسی بنا پر وہ اس سے الگ ہوئے، کیا انہوں نے علیحدگی کے بعد سے آج تک نو دس سال کے طویل مرحلہ میں اپنے انداز فکر کے مطابق کوئی کام بھی کیا۔ کیونکہ جہاں تک تحریک اسلامی کے نصب العین کا تعلق ہے ان حضرات کو پہلے بھی اس سے اتفاق تھا اور اسی بنا پر یہ اس میں شامل ہوئے تھے اور آج بھی جب یہ کتاب طبع ہو کر سامنے آئی ہے انہوں نے اس نصب العین سے اختلاف نہیں کیا۔ ایسی صورت میں علیحدگی کے بعد بھی اس نصب العین کے لیے اپنے انداز فکر اور طریق کار کے مطابق کام کرنے کی ذمہ داری سے بری الذمہ نہیں ہو جاتے ......''

اس الزام کے جواب میں، الحمد للہ کہ راقم الحروف نے کسی سخن سازی سے کام نہیں لیا بلکہ صاف 'اعتراف تقصیر' کرتے ہوئے جماعت سے علیحدہ ہونے والے حضرات کی خدمت میں گزارش کی کہ وہ اس پر برافروختہ ہونے کی بجائے سنجیدگی سے غور کریں:

''ہمیں اس کوتاہی اور تقصیر کا صاف اعتراف ہے اور ہم تسلیم کرتے ہیں کہ علیحدہ ہونے والوں پر جماعت اسلامی اور اس کے ہم خیال حضرات کا یہ الزام بالکل درست ہے کہ انہیں مجتمع ہو کر اس نہج پر عملی جدو جہد کا آغاز کر دینا چاہیے تھا جس کو وہ صحیح سمجھتے تھے......آخر میں ہم جماعت سے علیحدہ ہونے والے حضرات کی خدمت میں بھی یہ گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ مذکورہ بالا الزام پر مشتعل ہونے کے بجائے اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور واقعی جائزہ لیں کہ یہ الزام کس حد تک حقیقت پر مبنی ہے...... ہماری دیانت دارانہ رائے یہی ہے کہ اسباب خواہ کچھ بھی ہوں، بہر حال اس معاملے میں ہم سب سے مجموعی طور پر کوتاہی ہوئی ہے اور اس 'الزام' کا اصل 'جواب' ہماری جانب سے یہی ہونا چاہیے کہ جماعت اسلامی کے طریق کار میں جن غلطیوں کی نشاندہی کر کے ہم علیحدہ ہوئے تھے، ان سے پہلو بچا کر اس مقصد کے لیے اجتماعی جدو جہد شروع کی جائے جس کے لیے جماعت اسلامی قائم ہوئی تھی -----اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے ---آمین ---'' (تذکرہ وتبصرہ 'میثاق' لاہور بابت اگست ۱۹۶۶ء)

اس کے نتیجے میں بحمد اللہ ''معتزلین جماعت اسلامی'' کے حلقے میں واقعی ہلچل پیدا ہو گئی جس کے باعث پہلے ''قرارداد رحیم آباد'' منصہ شہود پر آئی اور پھر ''اجتماع رحیم یار خان'' منعقد ہوا-----اور ساتھ ہی احباب اور بزرگوں کی جانب سے ایک زوردار تقاضا ہوا کہ اب جبکہ ہم ایک مثبت تعمیر کی جانب پیش قدمی کر رہے ہیں پرانی تلخیوں کی یاد تازہ نہ کی جائے۔تو اگرچہ میرا ذہن اسے تسلیم نہیں کرتا تھا لیکن میں نے بزرگوں کی بات تسلیم کرتے ہوئے قلم روک دیا!

وہ دن اور آج کا دن، یہ داستان جو پہلے ہی دس سال پرانی ہو چکی تھی دنوں، مہینوں اور سالوں کے بوجھ تلے مزید دبتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اب اس پر پورے تینتیس ۳۳ سال بیت چکے ہیں، اور حقائق وواقعات پر ثلث صدی کا دبیز پردہ پڑ چکا ہے۔

ان حالات میں اگر اب اس دَور کے واقعات کو محض حافظے اور یادداشت کی بنیاد پر تحریر کرنے کی کوشش کی جائے تو اس میں یقیناً ذہول اور نسیان کی بنا پر بہت سی غلطیوں کا

احتمال ہے۔ غنیمت ہے کہ 'نقض غزل' کی پانچ قسطیں ۶۷-۱۹۶۶ء میں شائع ہو گئی تھیں جب اس المیے کے سارے کردار بقید حیات تھے۔ خصوصاً مولانا مودودی نہ صرف یہ کہ زندہ تھے بلکہ پوری طرح چاق و چوبند تھے۔ اور جماعت اسلامی کی قیادت کی ذمہ داری بھرپور طور پر ادا کر رہے تھے۔ لہٰذا اگر 'نقض غزل' کی کسی بات کی تردید نہ انہوں نے کی نہ کسی اور نے، جیسے کہ واقعہ ہے، تو یہ اس کے مشمولات کے مستند (Authentic) ہونے کی دلیل قاطع ہے۔ ویسے بھی اس میں اصل اہمیت کی حامل تو چند دستاویزات ہیں جن میں کسی کمی بیشی کا کوئی احتمال سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔

اس دوران میں کئی بار خیال آیا کہ تاریخ کی یہ امانت ادا کر ہی دی جائے، اور تاریخ جماعت اسلامی کے اس 'تاریک باب' کو منظر عام پر لے ہی آیا جائے خصوصاً جب ان واقعات و حوادث کو گزرے پورے تیس برس ہو گئے اور اتفاق سے یہ وہی دن تھے جب اخبارات میں مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کی کتاب کے اُن 'منجمد' (Sealed) اوراق کی 'رہائی' (Release) کا چرچا ہو رہا تھا جن کی اشاعت تیس سال کے لیے مؤخر کر دی گئی تھی تب تو یہی داعیہ شدت کے ساتھ پیدا ہوا کہ اب ان دستاویزات کو بھی 'رہا' کر ہی دیا جائے۔ چنانچہ تقریباً دو سال قبل اس کا حتمی فیصلہ کر بھی لیا گیا تھا، مگر بعض اسباب کی بنا پر معاملہ پھر التوا میں پڑ گیا۔ اسی طرح لگ بھگ ایک سال قبل تو نہ صرف یہ کہ دوبارہ فیصلہ ہو گیا بلکہ اس کا اعلان بھی کر دیا گیا لیکن اللہ کی مشیت پھر آڑے آ گئی۔ یہ اعلان اور اس کا پس منظر 'میثاق' بابت فروری ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا تھا، جو من و عن درج ذیل ہے:

> ''جدوہ میں ایک مفصل ملاقات برنی برادران سے بھی ہوئی جس کا ذکر ایک خاص اعتبار سے ضروری ہے۔ یہ دونوں بھائی، ڈاکٹر شجاعت حسین برنی اور ڈاکٹر فرحت حسین برنی، جدید فنی تعلیم کی اعلیٰ ترین ڈگریاں رکھنے کے ساتھ ساتھ (ڈاکٹر شجاعت معالجہ امراض نفسیاتی میں ڈاکٹریٹ کے حامل ہیں اور ڈاکٹر فرحت انجینئر نگ میں) نہایت نیک طبیعت اور گہرے مذہبی مزاج کے حامل ہیں،

----- اور دونوں ہی نے نہایت قلیل مدت میں قرآن مجید کے ساتھ گہرے شغف کے علاوہ درس قرآن کی عمدہ صلاحیت حاصل کرلی ہے!

ان میں سے فرحت صاحب کی جماعت اسلامی کی تحریک کے ساتھ وابستگی نہایت گہری اور جذباتی ہے، ----- اور وہ غالباً اس وقت جماعت کے جدہ کے حلقے کے سربراہ ہیں!

انہوں نے اثناء گفتگو میں نہایت حسرت کے ساتھ کہا کہ آپ کو جماعت اسلامی سے علیحدہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا! اور جب میں نے عرض کیا کہ اصل واقعہ یہ ہے کہ ہم لوگ خود علیحدہ نہیں ہوئے تھے، ----- بلکہ ہمیں جبراً علیحدہ کیا گیا تھا اور حالات ایسے پیدا کر دئے گئے تھے کہ اگر ہم جماعت سے علیحدہ نہ ہوتے تو ہماری معنوی موت واقع ہو جاتی، اس لیے کہ اجتماعِ ماچھی گوٹھ (فروری ۱۹۵۷ء) میں طے یہ پایا تھا کہ جو لوگ جماعت کی موجودہ پالیسی سے اختلاف رکھتے ہوں وہ اپنی رائے کا اظہار نہ تحریری طور پر کر سکتے ہیں ----- نہ زبانی طور پر، ----- انہیں صرف جماعت کے کُل پاکستان اجتماعِ ارکان میں اظہار رائے کا حق حاصل ہوگا ----- اس کے علاوہ نہ وہ جماعت کے مقامی یا حلقہ وار اجتماعات میں اپنی رائے کا اظہار کرسکیں گے نہ ارکان جماعت سے نجی گفتگوؤں میں! ----- اور ارکان کے کل پاکستان اجتماع کے بارے میں نہ یہ یقینی ہوتا ہے کہ وہ کتنے وقفے کے بعد ہوسکے گا، نہ ہی اس میں کسی اختلافی نقطۂ نظر کو تفصیلاً پیش کرنے کا موقع یا محل ہوتا ہے! ----- گویا جماعت اسلامی میں اظہار رائے کی آزادی ہاتھی کے اُن دانتوں کے مانند ہے جو دیکھنے میں تو بہت بڑے بڑے نظر آتے ہیں لیکن کھانے کے کام نہیں آسکتے!!

اس پر جس حیرت اور تعجب کا اظہار برنی صاحب نے کیا اس پر خیال آیا کہ جماعت اسلامی کی تاریخ کے اس گمشدہ باب کو اب منظر عام پر ہی آنا چاہیے جو ۵۶ء تا ۵۸ کے واقعات پر مشتمل ہے اور جس کا ایک اہم حصہ راقم نے بائیس سال قبل ۶۷-۶۶ء میں ''نقض غزل'' کے عنوان سے تحریر بھی کر دیا تھا اس لیے کہ اس کے بغیر جماعت کے بہی خواہوں پر ہمارا موقف صحیح طور پر واضح نہیں ہوسکتا ----- اور ویسے بھی ان حوادث پر اب تیس سال سے زیادہ کا عرصہ بیت چکا ہے ----- اور

اتنے عرصے کے بعد تو دنیا میں حساس ترین دستاویزات کو بھی شائع کر دیا جاتا ہے -----تاکہ حقائق و واقعات کا علم صفحۂ ہستی سے بالکل گم ہی نہ ہو جائے اور بعد میں آنے والے لوگ ماضی کے حوادث کے بارے میں صحیح رائے قائم کرسکیں اور مستقبل کے بارے میں صحیح فیصلے کرسکیں-----اس پر یہ بھی یاد آیا کہ یہ فیصلہ ہم نے تقریباً ایک سال قبل کر بھی لیا تھا لیکن پھر دوسری مصروفیات مانع ہوتی رہیں۔

بہرحال اب قارئین 'میثاق' نوٹ فرمالیں کہ 'میثاق' کی آئندہ اشاعت بابت مارچ ۸۹ء میں ''نقض غزل'' کی وہ پانچ قسطیں یکجا شائع کردی جائیں گی جو ۶۷-۶۶ء میں شائع ہوئی تھیں اور انشاء اللہ اپریل کے پرچے میں اس کی تکمیل کر دی جائے گی۔ واللہ الموفق والمستعان!''

اتنے حتمی وعدے کی تعمیل جس سبب سے نہ ہوسکی وہ یہ تھا کہ قریبی رفقاء کا اصرار تھا کہ اس مضمون کو قسط وار شائع کرنے کی بجائے یکمشت کتابی صورت میں شائع کیا جائے، اور اس کے لیے جو فرصت اور یکسوئی درکار تھی وہ کسی صورت میسر نہیں آرہی تھی۔ چنانچہ معاملہ لیت ولعل ہی میں تھا کہ اچانک ہفت روزہ ''آئین'' نے مشکل حل کردی۔ کہ ایک جانب تو مولانا مودودی مرحوم کی وہ مبینہ تقریر شائع کردی جس سے مولانا کا پورا فلسفۂ قیادت و امارت ان کے اپنے الفاظ میں سامنے آگیا اور اس طرح راقم کو وہ گوہر مقصود حاصل ہوگیا جس کی وہ ایک عرصے سے تلاش میں تھا (یہ تقریر یا تحریر گزشتہ ''میثاق'' میں اس وعدے کے ساتھ شائع کی جاچکی ہے کہ اس پر 'محاکمہ' ہم بعد میں کریں گے چنانچہ انشاء اللہ اسی 'نقض غزل' کے ضمن میں یہ وعدہ بھی جلد پورا کر دیا جائے گا)-----اور دوسری جانب جماعت سے علیحدہ ہونے والوں، بالخصوص راقم کی ذات پر نہایت رکیک حملہ کر کے شدید تقاضا پیدا کر دیا کہ صحیح حقائق کو بلا تاخیر سامنے لایا جائے۔ بصوت دیگر لوگ یہ باور کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ہم نے ان کے عائد کردہ الزامات کو درست تسلیم کر لیا ہے۔ بنا بریں قریبی رفقاء کی رائے بھی بدل گئی جس کے نتیجے میں 'نقض غزل' کا حصہ اول پیش خدمت ہے، (حصہ دوم بھی انشاء اللہ اگلے ہی ماہ سامنے آجائے گا)

ان مضامین میں، جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اصل اہمیت تو بعض 'دستاویزات' کی ہے، تاہم انہیں ایک مسلسل اور مربوط تحریر کی صورت دینے کے لیے گاہ بگاہ راقم کے ذاتی تجزیئے اور تبصرے بھی آ گئے ہیں جن کا لہجہ بالعموم تلخ اور درشت ہے۔ اس لیے کہ یہ میری اُس دور کی تحریریں ہیں جب مجھ پر مولانا مودودی کے بارے میں تلخی کا رنگ غالب تھا۔ اپنی اس دور کی بعض دوسری تحریروں کو جب راقم نے ۱۹۸۳ء میں کتابی صورت میں شائع کیا تھا تو بعض وضاحتیں دیباچہ میں درج کی تھیں۔ ان کا ضروری حصہ یہاں نقل کیا جا رہا ہے:

''پیشِ نظر مجموعے کی اشاعت سے قبل جب میں نے اپنی آج سے پندرہ سولہ سال قبل کی ان تحریروں کا جائزہ تنقیدی نگاہ سے لیا تو الحمدللہ کہ اس امر کا تو پورا اطمینان ہوا کہ ان میں حالات و واقعات کا جو تجزیہ سامنے آیا ہے وہ صد فی صد درست ہے۔ البتہ یہ احساس ضرور ہوا کہ ان میں بعض مقامات پر طرزِ تعبیر اور اندازِ تحریر میں تلخی شامل ہو گئی ہے، جو نہ ہوتی تو بہتر تھا ----- گویا اگر میں ان موضوعات پر آج قلم اٹھاؤں تو تجزیہ تو بنیادی طور پر وہی ہو گا لیکن انداز اتنا تلخ نہ ہو گا۔

لیکن اب ان تحریروں سے اس تلخی کو نکالنا نہ ممکن ہے نہ مناسب ----- ممکن اس لیے کہ وہ ان کے پورے تانے بانے میں بُنی ہوئی ہے، اور مناسب یا درست اس لیے نہیں کہ پرانی تحریروں کو اگر پرانی تحریروں ہی کی حیثیت سے شائع کیا جائے تو ان میں ردو بدل تصنیف و تالیف کے اصولوں کے خلاف ہے۔ اگر صاحب تحریر کی رائے میں بعد میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہو تو اسے اضافی حواشی کی صورت میں درج ہونا چاہیے یا علیحدہ وضاحت کی شکل میں!

اس ضمن میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور کا معاملہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس لیے کہ ان کے ساتھ میرے ذاتی و قلبی تعلق میں اتار چڑھاؤ کی کیفیت شدت کے ساتھ واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ اس کا آغاز شدید ذہنی و فکری مرعوبیت اور گہری قلبی محبت و عقیدت کے ساتھ ہوا، جس میں ذاتی احسان مندی کا عنصر بھی شدت کے ساتھ موجود تھا۔ لیکن پھر جب اختلاف پیدا ہوا تو وہ بھی اتنا ہی شدید تھا اور اس کے نتیجے میں طویل عرصے تک مایوسی ہی نہیں شدید بیزاری کی

کیفیت قلب و ذہن پر طاری رہی، لیکن آخر کا اس پر افسوس، ہمدردی اور حسرت کا رنگ غالب آ گیا اور قلب کی گہرائیوں میں کم از کم احسان مندی کے احساسات بتمام و کمال عود کر آئے۔

میری پیش نظر تحریریں چونکہ ان تین ادوار میں سے درمیانی دور سے تعلق رکھتی ہیں لہٰذا ان میں تلخی کا رنگ بہت نمایاں ہے جس کے لیے میں مولانا مرحوم کے تمام محبین و معتقدین سے بھی معذرت خواہ ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اگر ۷۹ء میں امریکہ میں مولانا سے میری وہ ملاقات ہو جاتی جس کی ایک شدید خواہش لیے ہوئے میں وہاں گیا تھا تو میں ان سے بھی معافی حاصل کر لیتا ----- اس لیے کہ اسی زمانے کے لگ بھگ مجھے ایک اطلاع ایسی ملی تھی جس سے پورا اندازہ ہو گیا تھا کہ مولانا کے دل میں میری جانب سے کوئی تکدر یا رنج نہیں ہے''۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی تالیف: ''اسلام اور پاکستان'')

اس سلسلۂ مضامین میں بہت سے ایسے حضرات کا ذکر بھی آ رہا ہے جو اس عرصے کے دوران اس عالم فانی سے رحلت فرما چکے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی، اور ہماری، اور جملہ مسلمانوں کی خطاؤں سے درگذر فرمائے اور سب کو اپنی رحمت و مغفرت کے سائے میں جگہ مرحمت فرمائے!

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَ مَيِّتِنَا وَ شَاهِدِنَا وَ غَائِبِنَا وَ صَغِيْرِنَا وَ كَبِيْرِنَا وَ ذَكَرِنَا وَ اُنْثٰنَا ----- اَللّٰهُمَّ مَنْ اَحْيَيْتَهٗ مِنَّا فَاَحْيِهٖ عَلَى الْاِسْلَامِ، وَ مَنْ تَوَفَّيْتَهٗ مِنَّا فَتَوَفَّهٗ عَلَى الْاِ يْمَانِ. اٰمين!

﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا﴾

نقض غزل

حصہ اوّل

یعنی

جائزہ کمیٹی سے ماچھی گوٹھ تک

لنحل:۹۲

اور اس عورت کے مانند نہ بن جاؤ جس نے مضبوطی سے کاتا ہوا سوت ٹکڑے ٹکڑے کر دیا-----!

ابتدائیہ

'یہ مضمون دراصل راقم الحروف کی تالیف ''تحریک جماعتِ اسلامی'' کے ایک باب کے طور پر لکھا گیا تھا اور اس کی کتابت بھی ہوگئی تھی لیکن بعد میں اس خیال سے اسے روک لیا گیا کہ اس طرح ایک تو کتاب کی ضخامت بہت بڑھ جائے گی اور دوسرے قاری کا ذہن خالص اصولی اور نظریاتی بحث سے ہٹ کر ان افسوس ناک اور پیچ در پیچ واقعات میں الجھ کر رہ جائے گا جو جائزہ کمیٹی کی رپورٹ کے پیش ہونے کے بعد جماعت اسلامی کے حلقے میں رونما ہوئے۔ چنانچہ کتاب کے آخر میں صرف اس پر اکتفا کیا گیا کہ وہ قرارداد بھی ضمیمے میں شامل کر دی گئی جو جائزہ کمیٹی کی رپورٹ پر جماعت اسلامی پاکستان کی مرکزی مجلس شوریٰ نے پاس کی تھی اور وہ قرارداد بھی درج کر دی گئی جو شوریٰ کی اس قرار داد کو منسوخ کر کے جماعت کے کل پاکستان اجتماع ارکان منعقدہ ماچھی گوٹھ فروری ۱۹۵۷ء نے پاس کی۔

ان دونوں قراردادوں کے مابین جا واقعات وحوادث جماعت اسلامی پاکستان کے حلقے میں پیش آئے وہ اس اعتبار سے نہایت اہم ہیں کہ ان ہی کی وجہ سے جماعت ایک خطرناک انتشار سے دوچار ہوئی اور اس کے رہنماؤں اور کارکنوں کی ایک بڑی تعداد جماعت سے مستعفی ہونے پر مجبور ہوگئی، جس سے پاکستان کی تحریک اسلامی کا وقار بری طرح مجروح ہوا۔ چونکہ جماعت کا یہ انتشار تا حال جماعت کے اکثر و بیشتر ارکان و متفقین کے لیے بھی ایک معمہ ہی ہے اور ملک اور بیرون ملک کے ان لوگوں کے لیے بھی ایک نا قابل فہم مسئلہ بنا ہوا ہے جو اس ملک میں اسلام کے مستقبل سے دلچسپی رکھتے ہیں لہٰذا اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ اس اصولی اور نظریاتی بحث کے ساتھ ساتھ جو وضاحت کے ساتھ پیش کی جا چکی ہے ان واقعات کو بھی سلسلہ وار ترتیب کے ساتھ پیش کر دیا جائے جن کی وجہ سے جماعت کے بہت سے رہنما اور کارکن جماعت کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے----- ذیل کا مضمون اس سلسلے کی پہلی قسط ہے''۔

باب اوّل

جائزہ کمیٹی کی رپورٹ

اوراس کے خلاف

مولانا مودودی کی چارج شیٹ

راقم الحروف نے جو بیان جائزہ کمیٹی کی خدمت میں پیش کیا تھا، وہ کمیٹی کو پیش کئے جانے والے تحریری بیانوں میں سب سے زیادہ طویل تھا اور اس کی دوسری امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ جبکہ دوسرے اکثر زبانی وتحریری بیان زیادہ تر جماعت اسلامی کے ارکان و متفقین اور خصوصاً اس کے ہمہ وقتی کارکنوں کی دینی واخلاقی حالت اور دیانت وتقویٰ کے منافی واقعات ومعاملات سے بحث کرتے تھے، وہاں اس بیان میں جماعت کی پالیسی پر اصولی تنقیداوراس کے موقف کے بارے میں اصولی بحث کی گئی تھی-----اس طرح اس بیان ے اس دینی واخلاقی گراوٹ وانحطاط کی منطقی توجیہہ پیش کردی جس کی تفصیل دوسرے تحریری بیانوں میں درج تھی اور جس کا تذکرہ جماعت اسلامی کے بے شمار ارکان نے جائزہ کمیٹی کے سامنے پیش ہوکر زبانی گفتگوؤں میں انتہائی دردمندی اور پریشانی کے ساتھ کیا تھا-----گویا کہ جبکہ دوسرے زبانی وتحریری بیان جماعت کے امراض کی علامات سے بحث کرتے تھے وہاں اس بیان نے ان امراض کی تشخیص پیش کردی اوران اسباب وعوامل کی نشاندہی کردی جن سے ان امراض نے جنم لیا تھااورتقویت پائی تھی۔

جائزہ کمیٹی کے بزرگ رکن مولانا عبدالجبار غازی صاحب [1] نے بعد میں ایک موقع پر مجھے بتایا کہ ’’تمہارا بیان پڑھ کر میں نے اپنی نوٹ بک میں یہ الفاظ درج کئے تھے کہ -----’’حیرت ہوتی ہے کہ یہ نوجوان جو ہمارے مقابلے میں جماعت اسلامی میں ایک

---

(۱): اب عرصہ ہوا کہ اللہ کے جارِ رحمت میں پہنچ چکے ہیں۔

بالکل نو وارد کی حیثیت رکھتا ہے اور جسے حالات و واقعات کا علم بہت کم ہے، محض لٹریچر کے منطقی تجزیئے سے ان نتائج تک پہنچ گیا ہے جن تک ہم بوڑھوں کی رسائی تمام حالات و واقعات کے بچشم سر مشاہدے سے ہوئی ہے......''

کمیٹی کے ایک دوسرے رکن شیخ سلطان احمد صاحب ے اس بیان کے طریق استدلال کا ایک خلاصہ تیار کیا، تاکہ فوری حوالے کے کام آ سکے۔ شیخ صاحب موصوف ہی نے مجھے ان بعض مقامات کی اصلاح کی جانب بھی متوجہ کیا جہاں شدتِ جذبات میں سخت الفاظ استعمال ہو گئے تھے، چنانچہ میں نے ایسے سخت الفاظ اور جملوں کو قلم زد کر دیا جن سے دل آزاری ہو سکتی تھی اور اصلاح کے بجائے ضد اور ہٹ دھرمی کے پیدا ہو جانے کا امکان تھا۔ کمیٹی کے کنوینر حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب اور اس کے چوتھے رکن مولانا عبدالغفار حسن صاحب نے بھی منجملہ اس بیان کو پسند فرمایا اور اس محنت پر مجھے داد دی جو میں نے دو ہفتے کے مختصر وقفے میں اس بیان کے تحریر کرنے پر صرف کی تھی۔

رپورٹ جائزہ کمیٹی ...... جائزہ کمیٹی نے پورے ملک کا دورہ کرنے اور ان ارکان سے ملاقات کے بعد جو جماعت کی پالیسی اور طریق کار یا اس کے نظم و نسق اور دستور سے متعلق اپنا نقطہ نظر کمیٹی کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے، کچھ عرصہ اس پورے مواد کو مرتب کرے میں صرف کیا اور بالآخر ایک جامع رپورٹ وسط نومبر ۱۹۵۶ء میں امیر جماعت کی خدمت میں پیش کر دی۔

یہ رپورٹ تا حال جماعت اسلامی پاکستان کا ایک اعلیٰ سطح کا راز (Top Level Secret) ہے۔ ایک رکن شوریٰ کے ان الفاظ سے کہ ''در اصل جائزہ کمیٹی نے پوری جماعت میں جھاڑ و پھیر کر اس کا سارا گند جمع کیا ہے اور اس غلاظت کے ڈھیر کو اس رپورٹ کی شکل میں پیش کر دیا ہے''۔ کسی حد تک اس رپورٹ کے مواد کے بارے میں اندازہ ہو سکتا ہے۔ اور اگرچہ ان ہی رکن شوریٰ نے یہ کہہ کر ''میں دعوے سے کہتا ہوں کہ دورِ صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) میں بھی کوئی ایسی جائزہ کمیٹی مقرر کی جاتی تو وہ اس سے بھی زیادہ

گندا مواد جمع کر کے پیش کر سکتی تھی‘‘ اپنے آپ کو اور اپنی طرز پر سوچنے والے دوسرے لوگوں کو اطمینان دلانے کی کوشش کی۔ لیکن اس مواد سے جس طرح کا لرزہ جماعت کے اربابِ حل وعقد پر طاری ہو گیا تھا، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس کے موقع پر اس رپورٹ کی نقول ارکانِ شوریٰ کو دی گئیں تو ان کو انتہائی تاکید کے ساتھ ہدایت کی گی کہ اس کی یا اس کے کسی حصے کی نقل شوریٰ سے باہر نہ جانے پائے اور جب ایک موقع پر ایک رکن شوریٰ نے انتہائی سراسیمگی کے عالم میں اعلان کیا کہ ان کا نسخہ غائب ہو گیا ہے تو پوری شوریٰ پر سنسنی طاری ہو گئی اور ایک کھلبلی سی مچ گئی اور اطمینان کا سانس اس وقت تک نہ لیا جا سکا جب تک یہ معلوم نہ ہو گیا کہ ان صاحب کا نسخہ گم نہیں ہوا بلکہ وہیں کہیں کاغذوں میں ادھر ادھر ہو گیا تھا اور محض گھبراہٹ کی وجہ سے مل نہیں رہا تھا۔

اجلاس مرکزی مجلس شوریٰ...... جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کا یہ اجلاس جو ۲۵ر نومبر سے ۱۰ر دسمبر ۱۹۵۶ء تک تقریباً دو ہفتے جاری رہا، جماعت کی تاریخ میں ایک اہم واقعے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اجلاس میں مجلس شوریٰ کے تمام فعال اور بااثر ارا کین واضح طور پر دو گروہوں میں منقسم ہو گئے۔ ایک گروہ کی رائے یہ تھی کہ جامعت اسلامی غلط رخ پر بڑھ آئی ہے۔ ۴۷ء میں طریق کار میں جو تبدیلی کی گئی تھی وہ اصولاً اور مصلحتاً دونوں ہی اعتبار سے غلط تھی اور اب خیریت اسی میں ہے کہ فوراً اس سے رجوع کیا جائے اور ’’اوپر سے نیچے‘‘ انقلاب لانے کے خواب دیکھنا چھوڑ کر پھر وہی ’’نیچے سے اوپر‘‘ کی طرف تبدیلی لانے کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اور دوسرے گروہ کا خیال تھا کہ یہ فیصلہ جماعت اسلامی کے حق میں مہلک ثابت ہو گا۔ جماعت کو اسی موجودہ طریق کار پر کاربند رہنا چاہیے۔ خرابیاں اول تو اتنی نہیں ہیں جتنی کہ جائزہ کمیٹی کی رپورٹ سے معلوم ہوتی ہیں اور جتنی ہیں وہ فطری ہیں اور انسانی تاریخ میں کوئی دَور ایسا نہیں گزرا جس میں یہ خرابیاں نہ پائی جاتی ہوں۔ حتیٰ کہ عین دَورِ صحابہؓ میں بھی اگر کوئی جائزہ کمیٹی اس طرز سے ’’جائزہ‘‘ لیتی تو ایسا ہی نہیں اس سے بھی کہیں زیادہ غلیظ مواد جمع کر سکتی تھی۔ پہلے خیال کے پیش کرنے والوں میں سب سے زیادہ

نمایاں حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب تھے اور ان کے علاوہ عبدالغفار حسن صاحب اور شیخ سلطان احمد صاحب نے اس خیال کی تائید میں بڑی مؤثر اور دردانگیز تقریریں کیں۔ دوسری جانب کے خطیب اعظم جناب نعیم صدیقی تھے۔

مولانا مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی نے بظاہر اپنے آپ کو ''بزرگانِ جماعت'' کی حیثیت سے اس بحث سے بالاتر رکھا لیکن مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے بارے میں یہ بات بالکل ظاہر تھی کہ وہ پہلے گروہ سے اتفاق رکھتے ہیں حتیٰ کہ انہوں نے راقم الحروف کے بیان کو پڑھا تو اس کو بہت سراہا اور تمام اراکین شوریٰ کو بشمول امیر جماعت یہ مشورہ دیا کہ وہ اس بیان کو ضرور پڑھیں۔ مولانا کے الفاظ کچھ اس طرح کے تھے:

> ''اگرچہ اس شخص (راقم الحروف) نے خود مجھ پر بہت سخت تنقید کی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ مجھے اس سے خوشی ہی ہوئی ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تمام اراکین شوریٰ اس بیان کو پڑھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس شخص نے ہماری ہی تحریروں سے مرتب کر کے ایک آئینہ ہماری نگاہوں کے سامنے لا رکھا ہے جس میں ہم اپنی موجودہ صورت دیکھ سکتے ہیں''۔

مولانا مودودی صاحب نے اگرچہ براہِ راست بحث میں کوئی حصہ نہیں لیا اور چند باتیں کہیں تو بھی اس انداز سے کہ میں چاہتا ہوں کہ یہ پہلو بھی نگاہوں کے سامنے آ جائیں ورنہ یہ میری پختہ اور طے شدہ آراء نہیں ہیں۔ لیکن جائزہ کمیٹی کی رپورٹ سے ان کی ناگواری اور اس پوری بحث سے جو انقباض ان کو ہو رہا تھا، وہ ان کے بشرے سے بالکل ظاہر تھا اور اس کا ہلکا سا اظہار انہوں نے اس طرح کر بھی دیا کہ امارتِ جماعت سے استعفاء اس بنا پر پیش کر دیا کہ چونکہ اس رپورٹ میں مجھ پر ذاتی طور پر بہت تنقید ہوئی اور الزامات لگائے گئے ہیں، لہٰذا میں امارت سے مستعفی ہوتا ہوں تاکہ اس رپورٹ پر غور وخوض میری زیرِ صدارت نہ ہو۔ لیکن ان کے اس خیال کی پوری شوریٰ نے متفقہ طور پر تردید کر دی اور کہا کہ یہاں غالباً کوئی ایک شخص بھی ایسا موجود نہیں ہے جو اس رپورٹ یا اس سے ملحقہ بیانات میں ہدفِ تنقید و ملامت نہ بنا ہو لہٰذا اس کی کوئی حاجت نہیں کہ کوئی ایک شخص اپنے منصب

سے مستعفی ہو۔

جماعت کے تیسرے بزرگ رکن مولانا عبدالجبار غازی صاحب نے بحث میں تفصیلی حصہ لینے کے بجائے انتہائی جذباتی انداز میں مولانا مودودی صاحب کو وہ کیفیات یاد دلائیں جو جماعت کے قیام کے وقت دلوں میں پائی جاتی تھیں اور مولانا سے درخواست کی کہ اب بھی وقت ہے کہ اصلاح کر لی جائے اور اسی اعتماد اور اتحاد کی فضا کو پیدا کر کے ازسرنو اسی جذبے اور ولولے کے ساتھ تحریک اسلامی کی تجدید کی جائے۔ غازی صاحب پر شوریٰ کی اس صورت حال نے کہ وہ دو متحارب گروہوں میں بٹ گئی تھی، بہت برا جذباتی اثر ڈالا۔ چنانچہ دورانِ اجلاس ان پر قلب کا دورہ پڑا اور وہ صاحب فراش ہو گئے اور بقیہ اجلاس میں شرکت نہیں کر سکے۔

شوریٰ کے دونوں متضاد اور متحارب گروپوں کا اختلاف انتہا (CLIMAX) پر پہنچ گیا تو پھر ایک ردعمل پیدا ہوا، اور اس کی ضرورت محسوس کی گئی کہ دونوں انتہاؤں کو چھوڑ کر اعتدال کی راہ اختیار کی جائے۔ چنانچہ ''مصالحت'' کی کوششیں شروع ہو گئیں اور بہت کچھ ردوقدح اور کسر وانکسار کے بعد ایک قرارداد پر ''اتفاق'' ہو گیا جس کے الفاظ درج ذیل ہیں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجلس شوریٰ جماعت اسلامی پاکستان دو ہفتوں کے مسلسل غور و خوض کے بعد ان تمام مسائل و معاملات کے متعلق جو جماعت کے پچھلے کام، آئندہ لائحہ عمل اور عام حالات کے بارے میں جائزہ کمیٹی کی رپورٹ کے ذریعہ سے زیر بحث آئے تھے، حسب ذیل نتائج پر پہنچی ہے۔

(ا) ...... جماعت نے تقسیم ملک سے پہلے اور بعد اب تک جو کام کیا ہے اس کے متعلق مجلس شوریٰ اس بات پر مطمئن ہے کہ جماعت اپنے اصول، مسلک اور بنیادی پالیسی سے منحرف نہیں ہوئی ہے۔ البتہ تدابیر کے صحیح اور غلط ہونے کے بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں اور صحیح قرار دینے کی صورت میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ مفید

نتائج کے ساتھ بعض مضر نتائج بھی برآمد ہوئے ہیں۔ جنہیں رفع کرنے کی ہم سب کو کوشش کرنی چاہیے۔

(۲)......مجلس شوریٰ کی رائے میں جو لائحہ عمل ۱۹۵۱ء کے اجتماع عام منعقدہ کراچی میں پیش کیا گیا تھا اور جو اب تک جماعت اسلامی کا لائحہ عمل ہے، وہ اصولاً بالکل درست ہے اس کو برقرار رہنا چاہیے۔ لیکن مجلس شوریٰ یہ محسوس کرتی ہے کہ دستور اسلامی کی پیہم جدوجہد کی وجہ سے لائحہ عمل کے پہلے تین اجزاء کے لیے خاطر خواہ کام نہیں ہوسکا ہے اور اس کے باعث ہمارے بنیادی کام میں بہت بڑی کسر رہ گئی ہے اس لیے مجلس کی متفقہ رائے یہ ہے کہ جماعت کی بنیادی دعوت اور لائحہ عمل کے پہلے تین اجزاء کی طرف اب پوری توجہ اور کوشش صرف کرنے کی ضرورت ہے اور اس بنا پر سر دست کسی انتخابی مہم کے لیے کام کرنا قبل از وقت ہوگا۔ البتہ اسلامی اقدار کے قیام و بقاء اور دستور اسلامی کے تحفظ، اصلاح اور نفاذ کے لیے ناگزیر اقدامات سے دریغ نہ ہونا چاہیے۔

(۳)......مجلس کی رائے میں نظام جماعت کے اندر اصل حجت کتاب وسنت ہے اور اس کے بعد آئینی سند ہونے کی حیثیت جماعتی لٹریچر کی عبارات کو نہیں بلکہ دستور جماعت اور ان جماعتی فیصلوں کو حاصل ہے جو دستور کے مطابق جماعت کے مجاز اداروں (امارت، مجلس شوریٰ اور ارکان کے اجتماع عام) نے کیے ہوں۔ البتہ لٹریچر کے کسی مضمون سے مختلف پائی جائے تو وہ یا تو اس مضمون کی ناسخ ہوگی یا اس مضمون کے وہی معنی معتبر ہوں گے جو جماعتی فیصلوں کے مطابق ہوں۔

(۴)...... جائزہ کمیٹی کے ذریعہ سے جماعت کے جو اصلاح طلب حالات و معاملات مجلس کے سامنے آئے ہیں ان کے حقیقی اسباب مشخص کرنے اور ان کی اصلاح کے لیے مناسب تدابیر تجویز کرنے کا کام ایک مجلس کے سپرد کر دیا گیا ہے جو امیر جماعت، مولانا امین احسن صاحب، چودھری غلام محمد صاحب اور نعیم صدیقی صاحب پر مشتمل ہوگی۔ علاوہ بریں جائزہ کے دوران میں جن متعین واقعات کی نشاندہی مختلف مقامات پر جائزہ کمیٹی کے سامنے کی گئی ہے، ان کی تحقیقات اور

اصلاح کے لیے مجلس شوریٰ نے مناسب طریقہ تجویز کر دیا ہے جس کے مطابق حتی الامکان جلدی کارروائی کی جائے گی''۔

یہ قرارداد ایک مصالحتی فارمولا تھی جو محض اس خوف کے منفی محرک سے معرض وجود میں آئی تھی کہ اگر کچھ لے اور دے یعنی (GIVE AND TAKE) کے اصول کے تحت ''صلح'' نہ کی گئی تو جماعت اسلامی کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا۔ اس میں ایک طرف اس خطرے کا سدباب کیا گیا کہ اگر یہ اعتراف کر لیا گیا کہ ہم نو دس سال ایک غلط راستے پر چلتے رہے ہیں تو نہ صرف یہ کہ جماعت کے کارکنوں کی ہمت شکنی ہو گی اور ان میں کام کرنے کا جذبہ باقی نہ رہے گا، بلکہ جماعت کی قیادت پر سے ان کا اعتماد بالکل اٹھ جائے گا اور اس کا وہ وقار باقی نہیں رہے گا جو نظم جماعت کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ ''تدابیر کے صحیح اور غلط ہونے کے بارے میں دورایوں'' کے امکان کو تسلیم کرنے اور ''بعض مضر نتائج'' کے برآمد ہونے کے اقرار کے ساتھ ساتھ کارکنانِ جماعت کو اطمینان دلایا گیا کہ ''جماعت اپنے اصول، مسلک اور بنیادی پالیسی سے منحرف نہیں ہوئی ہے''۔

دوسری طرف جماعت کی بعد از تقسیم کی پالیسی میں نہ صرف یہ کہ ''عدم توازن'' کا اقرار کیا گیا جس کی بنا پر جماعت کے ''بنیادی کام میں بڑی کسر رہ گئی ہے'' ----- بلکہ عملاً اس طریق کار کے ایک ستون یعنی ''انقلاب قیادت بذریعہ انتخابات'' کو بالکل ہی منہدم کر دیا گیا اور دوسرے ستون یعنی ''دستور اسلامی کے تحفظ، اصلاح اور نفاذ'' کے لیے بھی بس ''ناگزیر'' اقدامات کی اجازت برقرار رکھی گئی۔

اس طرح یہ قرارداد ایک پیچیدہ مصالحتی فارمولا بن گئی جو اپنے الفاظ اور ان کی ترتیب کے اعتبار سے کسی ذہین مصنف کا شاہکار تو قرار دی جا سکتی تھی لیکن اس سے اس کا کوئی امکان نہیں تھا کہ جماعت کے کارکنوں کو ذہنی اطمینان حاصل ہوتا اور ان کے سامنے اپنے سفر کا رخ اور آئندہ کے طریق کار کا واضح نقشہ آ سکتا۔

اس قرارداد پر دستخط ثبت کر کے شوریٰ نے اطمینان کا سانس لیا اور اس طرح بزعم خویش جماعت اسلامی کو انتشار سے بچا کر شوریٰ کے معزز اراکین اپنے اپنے گھروں کو روانہ

ہو گئے۔

ردعمل......!

لیکن جلد ہی شوریٰ کے اس اجلاس کی کارروائی اور اس کی پاس کردہ اس قرارداد کے خلاف ردعمل شروع ہوا۔

ایک طرف اراکین شوریٰ اپنے اپنے حلقوں کو لوٹے اور وہاں ارکان جماعت نے ان سے قرارداد کی وضاحت طلب کی تو مختلف طرز خیال کے لوگوں نے اپنے نقطۂ نظر سے وضاحت کی اور شوریٰ میں جو واقعی ذہنی انتشار موجود تھا وہ جنگل کی آگ کی طرح جماعت کے بعض حلقوں کے ارکان میں پھیلنا شروع ہو گیا۔

دوسری طرف مولانا مودودی صاحب پر ایک شدید ذہنی اور نفسیاتی ردعمل کے اثرات رونما ہوئے۔ظاہر بات ہے کہ مولانا موصوف ہی جماعت اسلامی کے مؤسس تھے اور وہی از یومِ تأسیس تا امروز اس کے امیر رہے تھے۔ جماعت کی بعد از تقسیم پالیسی کے معمار (ARCHITECT) بھی خود وہی تھے۔لہٰذا اس پالیسی کے بارے میں اس فیصلے سے کہ یہ غلط تھی، ایک طرح سے ان کے فہم وفراست پر حرف آتا تھا اور اس کو برداشت کرنے کے لیے بہت زیادہ ہمت کی ضرورت تھی۔ (**وَ مَا يُلَقّٰهَا اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَ مَا يُلَقّٰهَا اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ**) شوریٰ کے اجلاس کے دوران کچھ تو مولانا ہمت قائم کئے رہے اور کچھ شوریٰ کی اکثریت چونکہ جائزہ کمیٹی کی رپورٹ سے شدید متاثر تھی لہٰذا بے بس سے بھی رہے -----لیکن اجلاس کے بعد ان کی طبیعت میں ردِعمل شروع ہوا جس کو ان کے آس پاس جماعت کے مرکزی عملے کے لوگوں نے تقویت پہنچائی۔ درحقیقت یہ مولانا مودودی کے لیے آزمائش کا ایک فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ان کے سامنے دو راستے کھلے تھے:-

ایک اصلاح کی سواء السبیل، کہ غلطی کا اعتراف کر کے تلافی مافات کی سعی کی جاتی -----اور جلدی میں جو اقدام ۴۷ء میں کر دیا گیا تھا، اس کو غلط تسلیم کر کے ازسرنو سفر شروع کیا جاتا -----اس میں اس تحریک کی خیر بھی تھی اور اسی کا تقاضا وہ ''شورائیت'' اور

''جمہوریت'' بھی کرتی تھی جس پر جماعت کے دستور کی بنیاد رکھی گئی تھی کہ اب جبکہ مرکزی مجلس شوریٰ کی ایک واضح اکثریت نے ایک واضح DIRECTIVE دے دیا تھا، مولانا شوریٰ کی رائے کا احترام کرتے اور جماعت کا رخ تبدیل کر دیتے -----اگر مولانا ایسا کرتے تو شوریٰ کے وہ اراکین جنہوں نے انہیں اس رخ پر مڑنے پر مجبور کیا تھا، بہر حال ان کے دیرینہ نیاز منداور رفیق کار اوران ہی کی دعوت پر جمع ہونے والے لوگ تھے۔اور اس کا کوئی سوال نہ تھا کہ مولانا کے ان سے ''شکست'' کھانے کا تصور پیدا ہوتا۔

دوسری اَخَذَتۡهُ الۡعِزَّةُ بِالۡاِثۡمِ کی قدیم راہ کہ طریق کار کی تبدیلی کواپنی ذات شکست تصور کر کے ''عزت نفس'' کے تحفظ کے لیے مرنے مارنے پر تُل جایا جائے۔

بدقسمتی سے مولانا مودودی نے اس دوسری راہ کواختیار کیااورآیہ قرآنی وَ لَا تَكُوۡنُوۡا كَالَّتِىۡ نَقَضَتۡ غَزۡلَهَا مِنۡۢ بَعۡدِ قُوَّةٍ اَنۡكَاثًا کا مصداق بن گئے اور پوری بے رحمی کے ساتھ اس سارے تانے بانے کوتار تار کرنے پر تُل گئے جسے بہت محنت مشقت سے بیس پچیس سال کی محنت سے خود بُنا تھا۔

ارکانِ جائزہ کمیٹی پر الزامِ سازش...... چنانچہ شوریٰ کے اجلاس کے خاتمے کے بارہ تیرہ دن بعد ہی مولانا مودودی صاحب نے جائزہ کمیٹی کے ارکان کے بارے میں ایک چارج شیٹ مرتب کی اور قیم جماعت کو ہدایت کی کہ وہ اس کوارکانِ جائزہ کمیٹی کو بھیج دیں۔یہ مہلک دستاویز جس نے جماعت اسلامی کوسر سے پیر تک ہلا کر رکھ دیا یہ تھی۔

''مورخہ ۲۳/دسمبر ۵۶ء

جائزہ کمیٹی کی کارگزاری اوراس کے بعداس کمیٹی کے اس رویہ پر جواس نے مجلس شوریٰ میں اختیار کیا، خوب غور کرنے کے بعد میں حسب ذیل نتائج پر پہنچا ہوں:-

۱۔ یہ کمیٹی جسے غیر مطمئن ارکان کے خیالات معلوم کرنے کے لیے مقرر کیا گیا تھا، دراصل خود غیر مطمئن بلکہ انتہائی غیر مطمئن ارکان پر مشتمل تھی۔مجلس شوریٰ میں کمیٹی کے ارکان کی تقریروں سے اب یہ بات قطعی طور سے ظاہر ہو چکی ہے کہ ان

کے خیالات اور دلائل اور اخذ کردہ نتائج بالکل وہی ہیں یا قریب قریب وہی ہیں جو اس کمیٹی کے سامنے پیش ہونے والے لوگوں میں سب سے زیادہ غیر مطمین اصحاب کے ہیں۔

۲۔ درحقیقت یہ کسی طرح مناسب نہ تھا کہ ایک ایسی کمیٹی جس کے سپرد اس قدر اہم کام کیا گیا تھا، ایک ہی عنصر اور وہ بھی انتہائی غیر مطمئن عنصر پر مشتمل ہو۔لیکن چونکہ کمیٹی مقرر کرتے وقت اس کے ارکان کے خیالات کی اس انتہا پسندی اور شدت کا نہ صرف مجھے بلکہ اکثر ارکان شوریٰ کو کوئی اندازہ نہ تھا اس لیے کسی کو اس کی ترکیب کے غلط ہونے کا احساس نہ ہوا۔

۳۔ میں اس کی کوئی وجہ نہیں سمجھ سکا کہ خود اس کمیٹی کے ارکان نے کسی مرحلہ پر بھی آخر یہ کیوں محسوس نہ کیا کہ اس نازک کام کا کلیۃً ان ہی کے سپرد کرنا اور رہنا کس قدر نامناسب ہے۔ یہ تصور کرنا میرے لیے مشکل ہے کہ اس پورے کام کے دوران میں کسی وقت بھی وہ یہ محسوس نہ کر سکے تھے کہ وہ معاملات کو تقریباً ایک ہی نظر سے دیکھ رہے ہیں اور وہ اس بات سے بھی ناواقف تھے کہ مجلس شوریٰ میں تمام لوگوں کا نقطۂ نظر وہ نہیں ہے جو ان کا اپنا ہے۔میرے نزدیک ان کا یہ اخلاقی فرض تھا کہ مجھے اور مجلس شوریٰ کو معاملہ کی اس نوعیت سے آگاہ کر کے خود اس امر کی ضرورت ظاہر کرتے کہ کمیٹی میں دوسرے نقطۂ نظر کے لوگوں کو بھی شامل ہونا چاہیے۔ مجھے افسوس ہے کہ انہوں نے اس فرض کا نہ احساس کیا نہ اس کو ادا کیا اور نہ مجلس شوریٰ میں اس امر کا اعتراف کیا کہ کمیٹی کی میں یہ بنیادی خامی موجود تھی بلکہ شوریٰ کے اجلاس میں جب کبھی اس خامی کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی گئی تو ان کی طرف سے بڑی تلخی کے ساتھ اس کی مزاحمت ہوئی۔

۴۔ میں یہ قطعی رائے رکھتا ہوں کہ جائزہ کمیٹی کے ارکان نے مجلس شوریٰ کے تجویز کردہ حدودِ کار سے تجاوز کیا، خود اپنے حدود کار کو وسیع کیا اور ان امور کی تحقیقات اپنے ذمہ لے لی، جن کی وہ خود تحقیقات کرنا چاہتے تھے۔حالانکہ اگر مجلس شوریٰ کو فی الواقع ان امور کی تحقیقات کرانے کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہ کوئی دوسری کمیٹی دوسرے حدودِ کار کے ساتھ اور دوسری ہدایت کے ساتھ مقرر کرتی اور اس کے لیے وہ طریق کار ہرگز اختیار نہ کرتی جو اس کمیٹی نے اختیار کیا۔ میں امیر

جماعت ہونے کی حیثیت سے یہ بات بالکل غیر مبہم انداز میں کہتا ہوں کہ کمیٹی کے تقرر کے وقت میرے ذہن میں ہرگز یہ تصور نہ تھا کہ اس نوعیت کی تحقیقات اس کمیٹی کے سپرد کی جارہی ہیں، ورنہ میں یہ کام اس طریقہ سے کرنے کے لیے اس کمیٹی کے تقرر پر راضی نہ ہوتا۔ لیکن مجلس شوریٰ کے اجلاس میں جب میں نے کمیٹی کے کام کی اس دوسری بنیادی خرابی کو بیان کرنے کی کوشش کی تو نہایت تلخ انداز میں اس کی بھی مزاحمت کی گئی بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں میرا منہ بند کرنے کی کوشش کی گئی۔ میں نے اس وقت یہ محسوس کیا کہ یہ حضرات اب مجلس شوریٰ میں ایسے حالات پیدا کر رہے ہیں جن میں کوئی دوسرا رکن شوریٰ تو درکنار خود امیر جماعت بھی اپنی رائے آزادی کے ساتھ ظاہر نہیں کرسکتا۔

۵۔ اس کمیٹی نے ساری تحقیقات بالکل ایک مخصوص نقطۂ نظر سے کی اور اپنی رپورٹ میں جماعت کی صرف ایک رخی تصویر پیش کرنے ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ سارے مواد کو اس طرز پر مرتب کیا کہ جن انتہائی نتائج پر وہ مجلس شوریٰ کو پہنچانا چاہتی تھی ان کی تائید اس پورے مواد سے حاصل ہو۔

بھی مجلس شوریٰ کی توجہ دلانے کی کوشش کی ----- کیونکہ میں محسوس کر رہا تھا کہ رپورٹ کی اس مخصوص ہیئت سے بحیثیت مجموعی مجلس شوریٰ کے ذہنی توازن پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔ اور وہ اس کے تحت غلط فیصلے کرسکتی ہے۔ لیکن اس خدمت کی انجام دہی سے بھی جو دیانۃً امیر جماعت ہونے کی حیثیت سے میرا فرض تھا، مجھے اس تلخی کے ساتھ روکا گیا اور میں نے محسوس کیا کہ جتھہ ندی کر کے میرے لیے وہ حالات پیدا کئے گئے ہیں، جن میں' میں امیر جماعت کے فراض انجام دینے کے بجائے بعض مخصوص لوگوں کا آلۂ کار اور ان کے اشاروں پر چلنے والا بن کر رہوں۔

٦۔ اس صورت حال کو دیکھ کر میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ یا تو امارت سے مستعفی ہو جاؤں یا جماعت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کا خطرہ مول لے کر اپنے فرائض اس سختی کے ساتھ انجام دوں جو ایسے حالات میں ایک فرض شناس امیر جماعت کو اختیار کرنی چاہیے۔ میں نے جماعت کی بہتری اسی میں سمجھی تھی کہ پہلی صورت اختیار کروں چنانچہ میں نے استعفاء پیش بھی کر دیا۔ مگر افسوس ہے کہ اسے

قبول نہ کیا گیا اور مجھے مجبور کر دیا گیا کہ یا تو میں دوسری صورت اختیار کروں یا پھر مجلس شوریٰ کو ان غلط نتائج پر پہنچ جانے دوں جن پر یہ حضرات اسے اپنی جتھہ بندی کے ذریعہ پہنچانا چاہتے تھے۔ اور مزید برآں ان نتائج کو جماعت میں نافذ کرنے کی ذمہ داری بھی اپنے سر لوں۔

۷۔ مجلس شوریٰ میں ان لوگوں کے غلط رویہ کی وجہ سے جس میں ضد، بے جا اصرار، شدت اور جتھہ بندی کے سارے عناصر پائے جاتے تھے، آپ سے آپ ان ارکان شوریٰ کے اندر بھی ایک مخالف پارٹی کی سی کیفیت پیدا ہو گی جو ان کے ہم خیال نہ تھے۔ اس طرح جماعت اسلامی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ جماعت کے اندر جماعتیں بننے کا عملاً آغاز ہو گیا، جسے اگر اسی وقت نہ روکا گیا تو میں یقین رکھتا ہوں کہ یہ تحریک اور جماعت بہت برے انجام سے دوچار ہو گی۔

۸۔ یہ بھی جماعت کی تاریخ میں پہلا ہی موقع ہے کہ مجلس شوریٰ کے اندر ایک جتھہ نے اپنی شدت، ہٹ اور مشترک کوشش بلکہ جماعت میں تفریق برپا ہو جانے کے خطرے کا دباؤ ڈال کر امیر جماعت اور بقیہ ارکان شوریٰ سے اپنی بات منوانے اور پھر بالآخر ایک مصالحتی فارمولا طے کرنے کا طریقہ اختیار کیا اور اس طرح ''مصالحتی فارمولا'' میں کچھ چیزیں اس طرح داخل کرانے کی کوشش کی کہ گویا یہ ان کی طرف سے جماعت کے اندر رہنے یا جماعتی تفریق کی سعی سے باز رہنے کی شرائط ہیں، جن سے ہٹنے کے لیے وہ تیار نہیں ہیں۔ میں اسے جماعت اسلامی کی بد قسمتی کا آغاز سمجھتا ہوں اور مجھے اندیشہ ہے کہ اس رجحان کی ہمت افزائی کی گئی تو یہ جماعت خراب ہو کر رہے گی۔

۹۔ میں یہ رائے تو قطعاً نہیں رکھتا بلکہ مجھے اس کا شبہ بھی نہیں ہے کہ جائزہ کا یہ پورا کام اور مجلس شوریٰ میں جائزہ کمیٹی کے ارکان کا کردار ایک دانستہ سازش کا نتیجہ تھا۔ لیکن میرا احساس یہ ہے کہ اس سے عملاً نتائج وہی برآمد ہوئے ہیں جو ایک دانستہ سازش سے برآمد ہو سکتے تھے اور اب نہیں تو آئندہ اس سے جماعت اسلامی میں نجویٰ اور سازشی طریق کار اور جتھہ بندی اور جتھوں کی کشمکش کا دروازہ کھل جائے گا۔ جو طریق کار کمیٹی کے ارکان نے اختیار کیا اس سے عملاً معاملہ کی جو صورت بنی ہے وہ یہ ہے کہ اپنی بات منوانے کے لیے مجلس شوریٰ میں آنے سے پہلے انہوں نے

جماعت کے فراہم کئے ہوئے موقع سے فائدہ اٹھا کر پوری جماعت میں اپنے ہم خیال لوگ ڈھونڈے۔ان کا ایک جتھہ مجلس شوریٰ کے باہر تیار کیا۔ان کے انفرادی خیالات ونظریات کو جمع کر کے ان کا ایک اجتماعی مقدمہ بنا دیا۔اس مقدمہ کی پشت پر جماعت کے ان سارے لوگوں کی شکایات واعتراضات کو جمع کیا جن کے وہم و گمان میں بھی اس خاص مقدمہ کو مضبوط کرنے کا تخیل نہ تھا۔پھر اس سروسامان سے لیس ہو کر یہ حضرات یکا یک مجلس شوریٰ نے سامنے ایک پارٹی کی صورت میں نمودار ہوئے اور پوزیشن یہ اختیار کی کہ ان کے نظریات صرف ان ہی کے نظریات نہیں ہیں بلکہ باہر غیر مطمئن لوگوں کی ایک کثیر تعداد ان کی پشت پر موجود ہے لہٰذا یا مجلس شوریٰ اس راستہ پر چلے جس پر وہ اسے چلانا چاہتے ہیں ورنہ جماعت میں ایک بڑی پھوٹ پڑ کر رہے گی۔اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ چال چلنے کا ارادہ کیا گیا تھا یا نہیں مگر مجلس شوریٰ کو اور خود مجھے جس صورت واقعی سے دوچار ہونا پڑا وہ یہی تھی اور اس کا اثر ایک دانستہ سازش سے کچھ بھی مختلف نہ تھا۔

ان امور پر غور کرنے کے بعد میں اس قطعی رائے پر پہنچ چکا ہوں کہ میرے لیے مجلس شوریٰ میں ان ارکان کے ساتھ کام کرنا بالکل ناممکن ہے جن پر جائزہ کمیٹی مشتمل تھی۔بعض اور حضرات کا رویہ بھی میرے لیے ناقابل برداشت ہو چکا ہے مگر ان کا نوٹس میں بعد میں لوں گا۔سردست جائزہ کمیٹی کے ارکان کے معاملہ میں دو صورتیں تجویز کرتا ہوں۔

اول یہ کہ وہ خود مجلس شوریٰ کی رکنیت سے مستعفی ہو جائیں۔

دوم یہ کہ میرے اس نوٹ کو ان کے حلقہ انتخاب میں ارکان تک پہنچا دیا جائے اور ان سے کہا جائے کہ اگر وہ مجھ سے امارت کی خدمت لینا چاہتے ہیں تو اپنے ان نمائندوں کو واپس لے کر دوسرے نمائندے منتخب کریں۔

قیم جماعت کو میں ہدایت کرتا ہوں کہ اس نوٹ کی نقلیں ان چاروں حضرت کو بھیج دیں اور ان سے درخواست کریں کہ آئندہ حلقہ وار اجتماعات سے پہلے وہ مرکز کو اطلاع دیں کہ وہ ان دونوں صورتوں میں سے کس کو پسند کرتے ہیں۔اگرچہ غازی صاحب آخر تک مجلس شوریٰ کی کارروائیوں میں شریک نہیں رہے ہیں اور اس بنا پر وہ ان تمام باتوں کے ذمہ دار قرار نہیں دیئے جا سکتے جن کا ذکر پیراگراف نمبر چھ

سے نمبر ۹ تک کیا گیا ہے لیکن باقی امور کی ذمہ داری میں وہ بھی برابر کے شریک ہیں۔

میری طرف سے ان چاروں حضرات کو پورا اطمینان دلا دیا جائے کہ آنے والے حلقہ وار اجتماعات میں ان کو ارکان جماعت کے سامنے اپنے خیالات کو پیش کرنے کا کھلا اور آزادانہ موقع دیا جائے گا۔ اگر وہ ارکان جماعت کو یا ان کی اکثریت کو ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو جائیں تو انشاءاللہ جماعت کی قیادت ان کی طرف منتقل ہونے میں ذرہ برابر بھی رکاوٹ پیش نہ آئے گی لیکن اگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکیں تو یہ فیصلہ کرنا ان کا اپنا کام ہو گا کہ آیا وہ مطمئن ہو کر اس جماعت کے ساتھ چل سکتے ہیں یا نہیں۔ مطمئن نہ ہونے کی صورت میں ان کے لیے زیادہ بہتر یہ ہے کہ جماعت سے الگ ہو کر جس طریقہ پر خود کام کرنا صحیح سمجھتے ہوں اس پر عمل کریں۔ اس جماعت کے اندر نظریات کی کشمکش برپا کرنے کا حاصل اس کے سوا کچھ نہ ہو گا کہ نہ وہ خود دین کی کوئی خدمت کر سکیں گے اور نہ جماعت کے دوسرے لوگ ہی کسی خدمت کے قابل رہ جائیں گے۔ میں توقع رکھتا ہوں کہ اس جماعت کو خراب کرنا کسی غیر مطمئن رکن جماعت کی نگاہ میں بھی کوئی خدمت دین تو نہ ہو گا‘۔

(دستخط) ابوالاعلیٰ

۲۳ر دسمبر ۵۶ء

باب دوم

مولانا اصلاحی کا جوابی حملہ

اور جائزہ کمیٹی کا دفاع

ارکان جائزہ کمیٹی کے نام مولانا مودودی صاحب کا یہ ''الزام نامہ'' نہ صرف ''جمہوریت'' اور ''شورائیت'' اور عدل و انصاف بلکہ--------راست معاملگی (FAIR DEALING) تک کی نفی کامل تھا۔ اس کے بین السطور سے مولانا موصوف کی جو ذہنی کیفیت سامنے آتی ہے اور ان کا جو طرز عمل ظاہر ہوتا ہے وہ شاید اس بدنامِ زمانہ ماہر علم سیاسیات کی روح کے لیے تو موجب مسرت و شادمانی ہوا ہو جسے دنیا میکیاویلی کے نام سے یاد کرتی ہے۔ باقی جس کے علم میں بھی یہ ''حکم نامہ'' آیا وہ حیران و پریشان اور ششدرو مبہوت ہو کر رہ گیا-----! ارکان جائزہ کمیٹی کے لیے تو یہ اتنی شدید ذہنی و روحانی کرب و اذیت کا موجب تھا ہی جس سے وہ ایک صدمے کی سی حالت سے دوچار ہو گئے--------

-----خود مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے علم میں جب یہ آیا تو ان پر سکتہ طاری ہو گیا اور خود ان کی اس زمانے کی بیان کی ہوئی تفصیل کے مطابق، ان کا یہ حال ہو گیا کہ جیسے ایک دم ہاتھ پیر جواب دے گئے ہوں۔ تقریباً سولہ سترہ سال جس جماعت کے لیے اپنی صلاحیتوں اور اوقاتِ عزیز کا اکثر و بیشتر حصہ صرف کیا تھا اچانک اس کا یہ انجام نگاہوں کے سامنے آیا کہ جیسے یہ اب منتشر ہوا چاہتی ہے اور ایک شخص کی زخم خوردہ انا، طیش میں، اس کے شیرازے کو منتشر کرنے پر تُل گئی ہے۔ مولانا اُن دنوں فرمایا کرتے تھے کہ بار بار خیال آتا تھا کہ جاؤں اور مولانا مودودی کو سمجھاؤں کہ وہ اس اقدام سے باز آ جائیں، پھر سوچتا تھا کہ ان کی اس تحریر کے بعد اصلاح کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔ مولانا کے اپنے الفاظ میں:

''میں وہ ہوں کہ میری آنکھیں انتہائی تاریکی میں بھی روشنی ڈھونڈھ نکالتی ہیں، لیکن اس وقت مجھے بھی روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آتی''۔

بارہا ایسا ہوا کہ مولانا اصلاحی صاحب نے مولانا مودودی سے ملنے کو جانے کے لیے کپڑے تبدیل کر لیے پھر مایوسی کا غلبہ ہوا اور جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ آخر کار کسی نہ کسی طرح ہمت کر کے مولانا اصلاحی صاحب نے دو ایک ملاقاتوں میں، مولانا مودودی کو اس اقدام کی غلطی اور ہلاکت آفرینی کی جانب متوجہ کیا۔ مولانا مودودی ہر بار مزید غور کرنے کا وعدہ کر کے ٹالتے رہے۔ چند دن بعد جب مولانا اصلاحی صاحب کو یہ معلوم ہوا کہ جائزہ کمیٹی کے ایک رکن جن کو کسی وجہ سے اب تک ''الزام نامہ'' نہیں پہنچایا جا سکا تھا، ان کو بھی پہنچا دیا گیا، تو پھر مجبوراً مولانا اصلاحی صاحب نے اپنا وہی قلم جو ایک طویل عرصے سے مولانا مودودی کی حمایت اور ان کی جانب سے مدافعت میں استعمال ہوتا رہا تھا، اٹھایا اور ایک ماہر دستور و قانون کی حیثیت سے مولانا مودودی کے اس الزام نامے کا ''محاکمہ'' تحریر کیا ----- یہ طویل تحریر اس قابل ہے کہ تاریخ کے صفحات میں محفوظ رہے اس لیے من وعن درج ہے:

''محترم امیر جماعت اسلامی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

قیم جماعت اسلامی نے آپ کا جو نوٹس آپ کے دستخط کے ساتھ جائزہ کمیٹی کے ارکان کے نام ۲۵/دسمبر ۵۶ء کو بھجوایا ہے اس کے متعلق میں آپ سے ملاقات کر کے اپنے خیالات زبانی آپ کی خدمت میں پیش کر چکا ہوں۔ آپ نے مجھ سے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ آپ غور کر کے اپنے جوابات سے مجھے آگاہ فرمائیں گے۔ چونکہ آپ کا یہ اقدام نہایت اہم اور دوررس نتائج کا حامل ہے اس وجہ سے میں نے گذارش کی تھی کہ آپ جس قدر جلدی ممکن ہو سکے، مجھے اپنے جواب سے آگاہ فرمائیں گے لیکن ایک ہفتہ سے زیادہ مدت گزر جانے کے بعد بھی نہ تو مجھے آپ کا جواب ہی معلوم ہو سکا نہ بظاہر آپ نے اپنے اٹھائے ہوئے قدم کو واپس ہی لیا اور نہ وہ افسوسناک پروپیگنڈہ ہی بند ہوا جو شوریٰ کے فیصلے کے خلاف آپ کے مرکزی اسٹاف، بعض ارکانِ شوریٰ اور بعض امرائے حلقہ کی طرف سے جماعتی حلقوں میں جاری ہے اور جس سے نہ صرف فیصلہ کے خلاف بلکہ شوریٰ کے بہت سے ایسے ارکان

کے خلاف ایک مخالفانہ فضا تیار کی جا رہی ہے جن کی ثقاہت، جن کی اصابت رائے اور جن کے اخلاص وتقویٰ پر جماعتی حلقوں میں کبھی کسی کو شبہ نہیں ہوا۔ میں آپ کی اس خاموشی کو اس بات پر محمول کرتا ہوں کہ میری معروضات آپ کا ذہن تبدیل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکیں اور آپ نہ صرف یہ کہ اپنا فیصلہ بدلنے پر راضی نہیں ہیں بلکہ مجھے کسی جواب کا مستحق بھی خیال نہیں فرماتے ہیں۔

اگرچہ اپنے اور جماعت کے ایک دیرینہ خادم کے ساتھ آپ کی یہ بے اعتنائی ایک افسوسناک بات ہے اور دل نہیں چاہتا کہ اس بارے میں کچھ مزید عرض کروں لیکن جماعت اور امیر کے ساتھ خیر خواہی کا جو عہد میں نے اپنے رب کے ساتھ کیا ہے وہ مجھے مجبور کررہا ہے کہ جو کچھ میں جماعت کے لیے اور خود آپ کے لیے حق اور بہتر سمجھتا ہوں اس کو آپ کی خدمت میں پیش کردوں۔ اب تک جو کچھ میں عرض کرتا رہا ہوں وہ زبانی عرض کرتا رہا ہوں لیکن اب کے میں نے تحریر کا راستہ اختیار کیا ہے کہ شاید اس طرح میں اپنی بات زیادہ بہتر طریقہ پر پیش کرسکوں۔

میں نے آپ کے مذکورہ نوٹس (جس کو اس کے مزاج اور انداز کے لحاظ سے ایک فرمان کہنا شاید بے جا نہ ہو) کو گھر پر آکر دوبارہ پڑھا اور اس کے تمام پہلوؤں پر بار بار غور کیا۔ اس بار بار کے غور وفکر کے بعد بھی میری رائے وہی ہے جو میں آپ سے زبانی عرض کر چکا ہوں۔ میرے نزدیک آپ کا یہ پورا نوٹس استدلال واستنتاج کے لحاظ سے بالکل غلط، مصالح کے اعتبار سے جماعت کے لیے نہایت مہلک، عدل وانصاف کے لحاظ سے یہ ان کے ابتدائی تقاضوں کے احترام سے بھی خالی ہے اور دستوری وآئینی نقطۂ نظر سے تو جب میں اس پر غور کرتا ہوں تو مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ ہم جو اسلامی جمہوریت وشورائیت کی ایک مثال قائم کرنے کا حوصلہ لے کر اٹھے تھے، ابھی اس کی پہلی جھلک بھی ہم کو دیکھنی نصیب نہیں ہوئی تھی کہ شاید ہمارے جی اس سے بھر چکے اور ہم اس کی جگہ پر ایک ایسی فسطائیت کا تجربہ کرنے کا شوق رکھتے ہیں جس کی نظیر کم از کم ماضی وحاضر میں تو کوئی اور نہ مل سکے۔ جب میں آپ کے نوٹس کے اس پہلو پر غور کرتا ہوں تو دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید

اسلامی جمہوریت اور شورائیت کی شان میں اپنی تحریروں میں ہم اب تک جو قصیدہ خوانیاں کرتے رہے ہیں وہ محض مشق سخن کے طور پر تھیں یا محض اپنے ملک کے ارباب اقتدار کو ہدف ملامت بنانے کے لیے۔ ورنہ اس اقدام سے پہلے آپ اس سوال پر ضرور غور کرتے کہ آپ کے اس اقدام کے بعد اس شوریٰ اور دستور کا کیا حشر ہوگا جس پر ہم نے جماعت کی عمارت کھڑی کی تھی۔

اب میں آپ کے اس نوٹس کے ایک ایک جزو پر اختصار کے ساتھ وہ باتیں عرض کرتا ہوں جو کم و بیش زبانی آپ کے سامنے عرض کر چکا ہوں اور مقصود اس گذارش سے، جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، محض یہ ہے کہ ایک شدید ترین غلطی پر جو جماعت کے لیے بالکل تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے، آپ کو متنبہ کروں۔

۱۔ آپ نے اس نوٹس کے نمبر ۱ اور نمبر ۲ کے تحت جو کچھ فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جائزہ کمیٹی، جو غیر مطمئن ارکان کے خیالات معلوم کرنے کے لیے مقرر کی گئی تھی در اصل خود غیر مطمئن بلکہ انتہائی غیر مطمئن ارکان پر مشتمل تھی، اس اہم کام کے لیے اس طرح کی کمیٹی کا مقرر کیا جانا کسی طرح مناسب نہ تھا لیکن چونکہ کمیٹی مقرر کرتے وقت ان ارکان کی اس بے اطمینانی اور ان کی انتہا پسندی کا نہ ارکان شوریٰ کو اندازہ تھا اور نہ آپ کو، اس لیے کسی کو اس کی ترکیب کے غلط ہونے کا اندازہ نہیں ہوا۔

مجھے جائزہ کمیٹی کے ارکان پر آپ کا یہ تبصرہ مختلف پہلوؤں سے عجیب و غریب معلوم ہوتا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ ارکان، جماعت میں کوئی نو وارد ارکان نہیں تھے بلکہ ان میں سے تین تو وہ ہیں جو غالباً ابتدا سے یا کم از کم تقسیم کے پہلے سے نہ صرف جماعت کے رکن ہیں بلکہ ہر مرحلہ میں مجلس شوریٰ میں آپ کے ساتھی اور رفیق رہ چکے ہیں۔ ایک صاحب اگر ابتداء سے نہیں تو کم از کم آٹھ نو سال سے تو جماعت میں ضرور ہیں اور اس دوران میں ان کی زندگی کا بڑا حصہ ایسا گزرا ہے جس میں شوریٰ میں ہم ان کے نظریات و خیالات کا برابر تجربہ کرتے رہے ہیں۔ پھر ان میں سے دو وہ ہیں جو نہ صرف جماعت کی تمام اہم ذمہ داریوں

کے اٹھانے میں آپ کے دس و بازو رہے ہیں بلکہ انہوں نے نہایت نازک ادوار میں جماعت کی امارت کی ذمہ داریاں سنبھالیں اور ایسی خوبی سے نبھائی ہیں کہ پوری جماعت نے ان کے استقلال، ان کی اصابت رائے اور ان کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ان میں سے مولانا عبدالغفار حسن صاحب ابھی چند ماہ ہوئے ہیں آپ کے سفر حج کے موقع پر، خود آپ ہی کے انتخاب سے، جماعت کے قائم مقام امیر رہ چکے ہیں نیز آپ کے شعبۂ تربیت کے ناظم اور شوریٰ کی مقرر کردہ ایک اہم عدالت کے صدر ہیں۔اگر اتنی گوناگوں آزمائشوں سے گزرنے کے بعد بھی آپ اور ارکان شوریٰ اپنے ان دیرینہ رفیقوں کی ''شدت''، ''انتہا پسندی'' اور ان کی ''انتہائی بے اطمینانی'' کا کوئی اندازہ نہ کر سکے تو میں نہایت ادب سے عرض کروں گا کہ ہمیں ان ارکان کی بے اطمینانی پر افسوس کرنے کی بجائے خود اپنے کودن ہونے پر سر پیٹنا چاہیے۔اطمینان و بے اطمینانی اور شدت و انتہا پسندی ایسے اوصاف نہیں ہیں جو صبح و شام کے اندر پیدا ہوتے اور ختم ہوتے ہوں۔بالخصوص ان لوگوں کے اندر جو اپنی زندگی کے تلون کے زمانے گزار چکے ہوں اور جماعت کی خدمت میں جن کے سیاہ بال اب یا تو سفید ہو چکے ہیں یا سفید ہو رہے ہوں ایسے آزمودہ لوگوں کے بارے میں آپ کا یہ کہنا کہ نہ صرف آپ کو بلکہ شوریٰ کے دوسرے ساتھیوں کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ یہ لوگ انتہائی غیر مطمئن اور انتہا پسند ہیں، جب ان لوگوں نے جائزہ کمیٹی کی رپورٹ پیش کی ہے تب یہ انکشاف ہوا کہ یہ لوگ سخت غیر مطمئن اور انتہا پسند تھے۔آخر کس معقول آدمی کے ذہن میں یہ بات اتر سکتی ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ جائزہ کمیٹی کوئی ایسی کمیٹی نہیں تھی جو دفعتاً بنی ہو اور آناً فاناً اس نے اپنا کام ختم کیا ہو اور پھر رپورٹ پیش کر کے فارغ ہو بیٹھی ہو کہ اس کے ارکان کے متعلق رواروی میں کوئی صحیح رائے قائم نہ کی جا سکی ہو اور اس سبب سے اس کی ترکیب بالکل غلط ہو گئی ہو۔اس قطرہ کے گہر ہونے پر تو ایک مدت گزری ہے اور اس کے پیچھے ایک پوری تاریخ بن چکی ہے۔اس کمیٹی کا تقرر کراچی کے اجتماع سالانہ (۱۹۵۵ء) کے موقع پر ہوا تھا لیکن اس کے کام شروع کرنے سے پہلے ہی راولپنڈی اور لائل پور کے حلقوں کے بعض مخصوص

لوگوں نے اس کمیٹی کے بعض ارکان کے خلاف اعتراضات اٹھائے کہ وہ چنیں ہیں اور چناں ہیں اورافسوس ہے کہ ان کی اس مہم میں بعض ذمہ دارانِ مرکز بھی شریک ہوگئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مارچ ۵۶ء کی شوریٰ میں یہ کمیٹی توڑ دی گئی اوراس کی جگہ پرآپ نے اور پوری شوریٰ نے بسلامتی ہوش وحواس ایک دوسری جائزہ کمیٹی مقرر کی جو تمام غیر مطلوب عناصر سے پاک تھی۔اس کے ارکان پورے اتفاق رائے سے منتخب کئے گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ غازی صاحب اور حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کسی طرح بھی اس کمیٹی میں شریک ہونے پر راضی نہیں تھے لیکن ان کو شوریٰ اور آپ کی طرف سے راضی کیا گیا اور سلطان صاحب تو شوریٰ میں موجود بھی نہیں تھے، ان کا انتخاب ان کی عدم موجودگی ہی میں ہوا۔ مجھے یہ بات اچھی طرح یاد ہے کہ اس کمیٹی کے حدودِ کار بھی آپ نے خود قلمبند کرائے۔لیکن ان تمام ترمیمات واصلاحات کے بعد بھی جو اصحاب پہلی کمیٹی سے مطمئن نہیں تھے وہ اس دوسری کمیٹی پر بھی مطمئن نہیں ہوئے اوراس کے خلاف مہم چلاتے رہےاورافسوس ہے کہ نہ معلوم کن مصالح کے تحت خود مرکز کے بعض ذمہ دار حضرات اس مرتبہ بھی اس مہم کو تقویت پہنچانے میں شریک ہوگئے جس کا اثر یہ ہوا کہ اس کمیٹی کو مختلف حلقوں میں طرح طرح کی بد گمانیوں کا مقابلہ کرنا پڑا اوراس کے کام میں رکاوٹیں پیدا ہوئیں۔ایک ایسی کمیٹی جو اتنے مراحل سے گزری ہو، جو اتنے پرانے ارکانِ جماعت پر مشتمل ہو، اس کے متعلق یہ کہنا کہ اس کے ارکان کا کوئی صحیح اندازہ نہیں تھا میرے نزدیک کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔آخر سلطان احمد صاحب، غازی محمد عبدالجبار صاحب، مولانا عبدالغفار حسن صاحب اور حکیم عبد الرحیم اشرف صاحب سے جماعت کا کون شخص بے خبر ہوسکتا ہے۔نہ عام ارکان ان سے بے خبر ہیں اور نہ ارکان شوریٰ ----- اس وجہ سے یہ کہنا تو میرے نزدیک بالکل ہی غلط ہے کہ ان کا کوئی اندازہ نہیں تھا البتہ اگر آپ کہہ سکتے ہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ لوگ ایک متفقہ رپورٹ پیش کریں گے اور یہ رپورٹ اس طرح کا مواد پیش کرے گی جو اس نے پیش کیا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ کمیٹی کے ارکان کا غیر مطمئن ارکان جماعت کی رائے سے متفق

ہونا اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ لازماً وہ سب کے سب پہلے ہی سے غیر مطمئن ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے بعض جماعت کے حالات کے بارے میں پوری طرح مطمئن رہے ہوں یا کم ازکم یہ کہ کچھ زیادہ غیر مطمین نہ رہے ہوں لیکن پوری تحقیقات کے بعدان کے سامنے جو مواد آیا ہو اس نے ان کو غیر مطمئن بنادیا ہو۔ کم ازکم دو کے بارے میں تو میرا تاثر یہی ہے کہ وہ کچھ زیادہ غیر مطمئن نہ تھے۔ بلکہ دوسرے بہت سے محتاط ارکان کی طرح وہ صرف یہ سمجھ رہے تھے کہ جماعت کے اندر کچھ غلط رجحان پرورش پارہے ہیں جو متعین شکل میں ان کے سامنے نہیں تھے، لیکن جائزہ کے بعد جو حالات ان کے سامنے آئے وہ ان کو دیکھ کر واضح طور پر یہ سمجھ سکے کہ درحقیقت صورتحال کیا ہے؟۔ یہ بے اطمینانی ایک بالکل قدرتی چیز ہے جو اس رپورٹ کے پیش کردہ مواد سے ہراس رکن شوریٰ کے دل میں پیدا ہوئی جس نے اس کا مطالعہ بغیر کسی بدگمانی کے کیا۔

چوتھی بات یہ ہے کہ اپنی رپورٹ کو پیش کرتے وقت جائزہ کمیٹی کے ارکان کا ایک ہی نقطۂ نظر کے ساتھ مجلس شوریٰ کے سامنے نمایاں ہونا کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر ان کو مطعون کیا جائے اور اس بنیاد پر ان کو سازشی قرار دے کر ان کو سزا دی جائے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ ہم اس بات کے خواہشمند تھے کہ وہ آپس میں اختلاف کریں لیکن جب انہوں نے اختلاف نہیں کیا تو ہم ان سے بدگمان ہو بیٹھے کہ انہوں نے کوئی شازش کرڈالی ہے۔ حالانکہ ان کا اتفاق جس چیز پر ہے وہ صرف اس مواد کے پیش کردینے پر ہے جو جائزہ کے بعدان کے سامنے آیا ہے یا اس بات پر ہے کہ جماعت کی موجودہ حالت کسی طرح بھی قابل اطمینان نہیں ہے اور یہ ایک ایسی بات ہے جس پر ایک دو ارکان شوریٰ کے سوا سب ہی ان کی رائے سے متفق ہیں جہاں تک موجودہ خرابیوں کے اسباب کا تعلق ہے اس سے سرے سے انہوں نے کوئی بحث ہی نہیں کی کہ اس بارے میں ان کا اتفاق یا اختلاف ہمارے سامنے آسکتا۔ جماعت کی پالیسی سے متعلق انہوں نے جو تقریریں کیں اس سے صاف معلوم ہوا کہ اس بارے میں وہ باہم متفق نہیں ہیں۔ غازی صاحب کی رائے تو ان کی علالت کے باعث ہمارے سامنے آہی نہ سکی، رہے سلطان احمد صاحب، مولانا عبدالغفار

حسن صاحب اور حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب تو انہوں نے جو تقریریں کیں اس سے یہ اندازہ ہوا کہ یہ تینوں الگ الگ نقطہ ہائے نظر رکھتے ہیں۔ عبدالرحیم اشرف صاحب کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ تقسیم ملک کے بعد ہم اپنے اصلی نصب العین سے منحرف ہو گئے ہیں لیکن بقیہ دونوں ارکان نے کسی انحراف کو تسلیم نہیں کیا، صرف بعض تدابیر کو غلط قرار دیا اور شوریٰ نے اسی نقطۂ نظر سے اتفاق کیا۔ شوریٰ کے اتفاق کے بعد حکیم صاحب بھی اس سے متفق ہو گئے اس وجہ سے یہ کہنا کہ وہ ایک جتھہ بندی کر کے سامنے آئے میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ بالرض ایک رائے پر وہ متفق بھی ہوتے جب بھی اس کو جتھہ بندی نہیں کہہ سکتے۔ اس اتفاق کو جتھہ بندی وہی شخص کہہ سکتا ہے جو ان کے اختلاف کا متمنی رہا ہو، لیکن جب اس کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی تو اس نے ان پر جتھہ بندی کا الزام جڑ دیا۔

۲۔ آپ کا یہ کہنا بھی مجھے عجیب معلوم ہوتا ہے کہ خود جائزہ کمیٹی کے ارکان کا یہ فرض تھا کہ وہ آپ کو اس امر سے آگاہ کرتے کہ وہ ایک ہی طرز فکر رکھنے والے لوگ ہیں، اس وجہ سے اس کمیٹی میں دوسرے طرز فکر کی نمائندگی بھی ہونی چاہیے۔ جب بار بار کے توڑ پھوڑ کے باوجود خود آپ کو اور مجلس شوریٰ کو بھی آپ کے بقول یہ اندازہ نہ ہوسکا کہ یہ ایک ہی طرز فکر کے لوگ ہیں تو خود جائزہ کمیٹی کے ارکان کو بھی اگر یہ اندازہ نہ ہوسکا کہ ہم ایک ہی طرز فکر کے لوگ ہیں تو کیا عجیب بات ہے۔ ممکن ہے جس طرح آپ کو ان کی رپورٹ ہی سے پہلی بار اندازہ ہوا کہ یہ سب ایک ہی سانچہ کے ڈھلے ہوئے نکلے اسی طرح انہیں بھی اپنی رپورٹ مرتب کرتے ہی وقت یہ علم ہوا ہو کہ الحمدللہ ہم میں اس رپورٹ کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ایسی حالت میں وہ پہلے سے آپ کو کس طرح بتا دیتے کہ ہم ایک ہی طرز فکر کے لوگ ہیں، مبادا ہم کوئی سازش یا جتھہ بندی کر ڈالیں، اس وجہ سے ہمارے ساتھ کچھ دوسرے طرز کے لوگوں کو بھی شامل کیجئے۔ علاوہ ازیں میں اس حقیقت سے بھی آگاہ کر دینا چاہتا ہوں کہ جائزہ کمیٹی کی تشکیل کرتے ہوئے نہ شوریٰ نے پہلی مرتبہ اس حقیقت کو نظر انداز کیا تھا کہ اس کمیٹ میں شوریٰ کے ہر طرز فکر کی نمائندگی ہونی چاہیے اور نہ دوسری مرتبہ اس کو نظر انداز کیا۔ اس توازن کو قائم رکھنے کی خواہش اور کوشش دونوں مرتبہ ملحوظ

رہی بلکہ پہلی کمیٹی توڑی ہی اس وجہ سے گئی تھی کہ بعض لوگ اس کو غیر متوازن سمجھتے تھے۔اب یہ اور بات ہے کہ جائزہ کمیٹی کے کام کو اپنے منشاء کے خلاف پا کر ہم یہ کہنے لگیں کہ اس کی تشکیل ہی غلط تھی اور اس تشکیل پر اس کے خاموش رہنے کو بھی اس کی ایک سازش قرار دیں کہ آخر اس نے اپنی تعمیر کی اس مضمر خرابی سے آپ کو آگاہ کیوں نہ کیا؟۔

مجھے آپ کی یہ شکایت بھی بالکل بے جا معلوم ہوتی ہے کہ آپ نے جب کمیٹی کی اس خامی کی طرف توجہ دلائی تو کمیٹی کی طرف سے بڑی تلخی کے ساتھ اس کی مزاحمت ہوئی۔اول تو مجھے اس بارے میں ان کی طرف سے کسی تلخ جواب کا علم نہیں ہے لیکن اگر انہوں نے آپ کی اس طرح کی کسی نشاندہی پر تلخ جواب دیا تو آپ کو یہ برداشت کرنا چاہیے تھا کیونکہ یہ غلطی اگر تھی تو آپ کی اور مجلس شوریٰ کی تی، نہ کہ ان کی۔آپ نے اور شوریٰ نے ان کو منتخب کیا اور پھر آپ ہی ان پر یہ الزام دھرتے ہیں کہ تم ایک ہی طرز کے لوگ کیوں منتخب ہو گئے؟ اور تم نے ایک ہی طرز پر کیوں سوچا؟ لیکن مجھے تعجب ہوتا ہے کہ آپ نے ان کی اس تلخی کو برداشت کرنے کی بجائے ان کو سزا دینے پر تُل گئے اور اس غصہ میں آپ نے دستور و آئین اور حق و انصاف سب کو لپیٹ کر بالائے طاق رکھ دیا۔

۳۔ آپ کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ جائزہ کمیٹی نے اپنے حدودِ کار سے کوئی تجاوز کیا۔میں یہاں مقرر کردہ حدودِ کار اور جائزہ کمیٹی کے کام کے موازنہ کی بحث میں پڑے بغیر اس صورتحال کی یاددہانی کافی سمجھتا ہوں جو جائزہ کمیٹی کی رپورٹ پیش ہونے پر شوریٰ کے بالکل ابتدائی مرحلہ ہی میں پیش آئی۔جوں ہی بحث کا آغاز ہوا آپ نے سب سے پہلے اسی سوال کو اٹھایا کہ کمیٹی نے اپنے مقررہ حدودِ کار سے تجاوز کیا ہے اور اپنے خیال کے مطابق اس کے دلائل پیش کیے۔آپ اُس وقت اتنے غصہ میں تھے کہ آپ کانپ رہے تھے اور لب ولہجہ نہایت تیز تھا۔میرا ماتھا اسی وقت ٹھنکا تھا کہ اب جائزہ کمیٹی کی خیر نہیں ہے، لیکن جب سلطان احمد صاحب اور عبدالرحیم اشرف صاحب نے حدودِ کار اور جائزہ کمیٹی کے کام کا موازنہ کرتے ہوئے آپ کے اعتراضات کا جواب دیا تو مجلس شوریٰ کے ارکان کی اکثریت (شاید ایک دو ارکان کے سوا جو خاموش رہے) ان کے جواب سے پوری طرح مطمئن ہو گئی

کہ جائزہ کمیٹی نے مقررہ حدودِ کار سے کوئی تجاوز نہیں کیا ہے۔حد یہ ہے کہ قیم جماعت جو آپ کی رائے سے کسی اختلاف کو مشکل ہی سے جائز سمجھتے ہیں، آپ کے بجائے کمیٹی کی رائے سے متفق ہو گئے۔آپ نے خود بھی اس کے بعد اپنا اعتراض واپس لیتے ہوئے یہ فرمایا کہ میں نے یہ سوال اس لیے اٹھایا تھا کہ یہ پیدا ہو سکتا تھا، میں نے چاہا کہ اس کی وضاحت ہو جائے کچھ وقفہ کے بعد ایک رکن شوریٰ نے جب پہلے ہی مرحلہ میں آپ کے لب ولہجہ کی اس شدت کی شکایت کی جو آپ نے یہ سوال اٹھاتے وقت ظاہر کی تھی تو آپ نے ان کے جواب میں اپنے سابق جواب ہی کا اعادہ کیا کہ آپ نے وہ سوال محض وضاحت طلبی کے لیے اٹھایا تھا۔میں نے اور غالباً دوسرے ارکان شوریٰ نے بھی آپ کے اس جواب کو یہی سمجھا تھا، کہ یہ آزادی رائے کے ساتھ اور بغیر کسی تحفظ کے دیا گیا ہے، لیکن اب آپ کے فرمانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے یہ جواب اس وجہ سے دیا تھا کہ آپ کا منہ بند کر دیا گیا تھا۔اگر منہ بند کرنے سے آپکا یہ مطلب ہے کہ شوریٰ کی بڑی اکثریت نے آپ کے نقطہ نظر سے اختلاف کیا اور جو آپ کے ہم خیال تھے وہ خاموش رہے تو یہ بات تو ضرور ہوی لیکن اس چیز کو منہ بند کرنے کی کوشش سے تعبیر کرنا تو کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔اگر یہ منہ بند کرنا ہے تو یہ حادثہ ہر جمہوری نظام میں ہر صدر اور ہر امیر کو پیش آسکتا ہے اور پیش آتا ہے۔اگر آپ کو بھی پیش آیا تو تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہوئی۔اگر منہ بند کرنے سے آپ کا مطلب یہ ہے کہ جوابوں کا انداز تیز تھا تو میں ادب سے یہ گزارش کروں گا کہ اس وقت تھوڑی سی تیزی محض اس وجہ سے پیدا ہوئی تھی کہ خود آپ کا اندازِ گفتگو بھی خاصا تیز تھا۔بہر حال شوریٰ کی اکثریت کا آپ کے کسی نقطۂ نظر سے اتفاق نہ کرنا یا اس سے شدت کے ساتھ اختلاف کرنا آپ کا منہ بند کرنا نہیں ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ آپ نے اس اختلاف کو منہ بند کرنے سے کیوں تعبیر فرمایا!

۴۔ اپنے نوٹس کے نمبر ۵ کے تحت آپ نے جائزہ کمیٹی اور شوریٰ کے بعض دوسرے ارکان کے اوپر اکٹھے کئی ایک الزامات لگائے ہیں جن میں سے کسی ایک کو بھی میں صحیح خیال نہیں کرتا۔مثلاً:۔

☆ ...... یہ کہ کمیٹی نے ساری تحقیقات ایک مخصوص نقطۂ نظر سے کی اور اپنی رپورٹ میں جماعت کی ایک رخی تصویر پیش کی۔

☆ ...... یہ کہ اس نے سارے مواد کو اس طرح پیش کیا کہ جن انتہائی نتائج تک وہ شوریٰ کو پہنچانا چاہتی تھی ان کی تائید اس مواد سے حاصل ہو۔

☆ ...... یہ کہ آپ محسوس کر رہے تھے کہ رپورٹ کی اس مخصوص ہیئت سے مجلس شوریٰ کے ذہنی توازن پر برا اثر پڑ سکتا ہے اور آپ اس اثر سے شوریٰ کو بچانا چاہتے تے لیکن آپ کو اس فرض کی انجام دہی سے سختی اور تلخی سے روکا گیا۔

☆ ...... یہ کہ جتھہ بندی کر کے آپ کے لیے وہ حالات پیدا کیے گئے کہ آپ مخصوص لوگوں کے آلۂ کار اور ان کے اشاروں پر چلنے والے بن کر رہیں۔

یہ سارے الزامات میرے نزدیک غلط ہیں اور میں ان کے بارے میں اصل حقیقت عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

رپورٹ میں جماعت کی یک رخی تصویر سے آپ کا مطلب اگر یہ ہے کہ اس میں جماعت کے اندر پیدا ہو جانے والی خرابیوں ہی کی فہرست پیش کی گئی ہے، اس کی خوبیاں نہیں دکھائی گئی ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جائزہ کمیٹی درحقیقت بنی ہی اس لیے تھی کہ وہ ارکان سے مل کر ان کی بے اطمینانیاں اور ان بے اطمینانیوں کے اسباب معلوم کرے اور اس وقت جو خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں، ان کی تحقیقات کرے۔ اس کے ذمہ یہ کام سپرد ہی نہیں کیا گیا تھا کہ وہ جماعت کی خوبیاں اور اس کے اچھے پہلو بھی پیش کرے۔ اپنا یہ کام اس نے دو سو سے زیادہ ارکان کے خیالات معلوم کر کے انجام دیا۔ ان ارکان سے ملنے میں اس نے کوئی امتیاز نہیں برتا، بلکہ ہر رکن کو اجازت دی کہ جو چاہے اس کے سامنے اپنا بیان دے۔ ان ملنے والوں میں سے جن لوگوں نے جماعت کے موجودہ حالات پر اپنے اطمینان کا اظہار کیا، کمیٹی نے ان کے اوسط کو بھی واضح کر دیا۔ پھر یہ الزام کس طرح صحیح ہے کہ یہ جماعت کی یک رخی تصویر ہے؟ ان کے سامنے آئے ہوئے مواد سے اطمینان اور بے اطمینانی کی جو تصویر بنتی تھی وہ انہوں نے ہمارے سامنے رکھ دی۔ اب یہ بات الگ ہے کہ

اس مسالہ سے جو تصویر بنی وہ ہمارے منشا کے خلاف بنی۔ لیکن میرے نزدیک اس بدگمانی کے لیے کوئی وجہ نہیں ہے کہ اگر اس سے مختلف مواد بھی ان کے سامنے آتا جب بھی وہ جماعت کی تصویر بگاڑنے ہی کی کوشش کرتے۔

مواد کے پیش کرنے کے اسلوب کے بارے میں اختلاف رائے ہوسکتا ہے کہ انہوں نے اس طرح کیوں پیش کیا، دوسری طرح کیوں پیش نہیں کیا۔ لیکن جب شوریٰ کی طرف سے اس کے پیش کرنے کی کوئی شکل معین نہیں کی گئی تھی تو جس طرح بھی انہوں نے پیش کیا، اس کے متعلق یہ بدگمانی کرنا کہ انہوں نے یہ اسلوب شوریٰ کو گمراہ کرنے اور اپنے پیش نظر نتائج تک پہنچانے کیلئے کیا، میرے نزدیک ان کے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔ اگر وہ کسی خاص نتیجہ تک شوریٰ کو پہنچانا ہی چاہتے تو آخر انہوں نے صرف ارکان کی رائیں پیش کرنے ہی پر کیوں اکتفا کیا۔ ان خرابیوں کے اسباب خود اپنی طرف سے کیوں معین نہ کئے اور ان کی اصلاح کی تدابیر کے بارے میں سفارشات کیوں نہ پیش کیں، حالانکہ یہ دونوں چیزیں ان کے حدودِ کار کے اندر داخل تھیں اور ہمیں یہ شکایت رہی کہ انہوں نے اس پہلو سے رپورٹ کو تشنہ چھوڑا۔ اگر فی الواقع آپ کا یہ گمان صحیح ہے کہ یہ ایک ہی طرح کے ذہن کے لوگ تھے تو ان کیلئے یہ کیا مشکل تھا کہ وہ اسباب کی بھی ایک فہرست پیش کر دیتے اور اپنی اصلاحی سفارشات بھی ہمارے سامنے رکھ دیتے۔ اس طرح وہ شوریٰ کو اس سے زیادہ خوبی سے گمراہ کر سکتے تھے جتنا گمراہ انہوں نے محض یہ مواد ہمارے سامنے رکھ کر کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے تو جو کچھ کیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ارکان نے جو بیانات دیئے ہیں وہ بیشتر انہی کے الفاظ میں مختلف عنوانات کے تحت نقل کر دیئے ہیں۔ آخر اس میں سازش کا کون سا پہلو ہے؟

جہاں تک تیسرے الزام کا تعلق ہے، وہ بھی میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ مشکلات میں شوریٰ کی رہنمائی کرنا آپ کا ایک فریضہ منصبی ہے لیکن ارکان شوریٰ کی رایوں پر اثر انداز ونا غالبًا آپ کے فرائض کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ آپ نے جائزہ کمیٹی کی رپورٹ کے بارے میں جو روش اختیار کی وہ ابتداء ہی سے ارکان شوریٰ کے سامنے اس نوعیت سے آئی کہ یہ جماعت کی بالکل یک رخی تصویر ہے، اس میں حدودِ کار سے تجاوز کیا گیا ہے، اس میں

جماعت میں پھیلی ہوئی گندگیوں کو اکٹھا کر دیا گیا ہے جس کے سبب سے یہ غلاظت کے ایک ٹوکرے کی شکل میں نظر آتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اور مزید برآں یہ کہ آپ نے اس کو اپنے خلاف ایک چارج شیٹ قرار دے کر امارت سے استعفےٰ کی دھمکی بھی دے دی۔ آپ کے اس نقطۂ نظر سے ان چند لوگوں کے سوا جو آپ کی رایوں ہی سے اپنی رائے بناتے ہیں، شوریٰ کے تمام صاحب فکر ارکان نے اختلاف کیا، انہوں نے آپ کے نقطۂ نظر کے برعکس جائزہ کمیٹی کی خدمات کو سراہا، رپورٹ کی اہمیت کا اظہار کیا اور اس کے ذریعہ سے جماعت کی جو تشویش انگیز تصویر سامنے آئی تھی اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی دعوت دی۔ سلطان صاحب کو تقریر کرتے وقت میں نے پہلی بار جماعت کی حالت پر پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا اور ان کے رونے نے بہتوں کو رُلایا۔ غازی صاحب اس قدر روئے کہ اسی حالت میں ان پر دل کا دورہ پڑا اور ان پر تشنج کے ایسے سخت حملے ہوئے کہ ہم ان کی زندگی ہی سے مایوس ہو گئے۔ شب کے بارہ بجے ڈاکٹر بلانا پڑا۔ میں نے یہ ماجرا شوریٰ کی پوری تاریخ میں پہلی بار دیکھا۔ میری اور میری ہی طرح شوریٰ کے اکثر ارکان کی رائے یہی تھی کہ یہ تأثر صورتحال کا پیدا کردہ ہے جو جائزہ کمیٹی کی رپورٹ سے سامنے آئی تھی، لیکن آپ کے فرمانے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ آپ کا منہ بند کرنے کے لیے ایک ڈراما کھیلا گیا تھا۔ اب اس کا فیصلہ کون کرے کہ یہ سب کچھ ایک ڈراما تھا یا حقیقت! جتھہ بندی کا الزام بھی میرے نزدیک کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ جائزہ کمیٹی کے ارکان کا جماعت کے حالات سے متعلق ایک متفقہ تأثر دینا کوئی جتھہ بندی نہیں ہے اور نہ اپنے اوپر آپ کے عائدہ کردہ الزامات کی متفقہ طور پر مدافعت کرنا کوئی جتھہ بندی ہے۔ یہ بھی کوئی جتھہ بندی نہیں ہے کہ رپورٹ کو پڑھنے کے بعد شوریٰ کے بہت سے دوسرے ارکان بھی جماعت کی حالت کے بارے میں ان کے ہم خیال بن گئے۔ انہوں نے رپورٹ مرتب کی اور آپ کے حوالہ کی۔ آپ نے اپنے اہتمام میں اس کو سائیکلو اسٹائل کرایا اور شوریٰ کے اجلاس سے چند گھنٹے پہلے وہ ارکان شوریٰ میں تقسیم ہوئی۔ ان میں سے کون سی بات ایسی ہے جس کو ان کی طرف سے جتھہ بندی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟ اگر شوریٰ کے دوسرے ارکان نے ان کی پیش کردہ

رپورٹ کو اہمیت دی اور آپ کے ہم خیال ہو کر اس کو غلاظت کا ایک ٹوکرا قرار دینے پر راضی نہیں ہوئے، تو کیا یہ جتھہ بندی ہے؟ اور جتھہ بندی بھی وہ جتھہ بندی جس کی سزا ان کو شوریٰ سے بیک بنی و دو گوش اخراج کی صورت میں بھگتنی چاہیے۔ کیا رپورٹ پیش کر دینے کیبعد ان کا ایک فرض یہ بھی تھا کہ وہ شوریٰ کے ارکان سے کہتے کہ آپ رپورٹ کے بارے میں ہمارے نقطۂ نظر سے متفق نہ ہوں ورنہ یہ جتھہ بندی ہو جائے گی اور ہمارے امیر جماعت کی طرف سے اس کی کم سے کم سزا شوریٰ سے اخراج ہے۔ اچھا میں نے تھوڑی دیر کے لیے یہ مان لیا کہ یہ جتھہ بندی تھی تو کیا یہ جتھہ بندی نہیں تھی کہ آپ نے شروع ہی میں شوریٰ کی رپورٹ سے متعلق ایک مخالفانہ تأثر دے دیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شوریٰ کے کچھ ارکان شروع ہی سے اس بات کے لیے کمر بستہ ہو گئے کہ وہ بہر حال اس کی مخالفت کریں گے اور اس کے لیے انہوں نے دلائل کے بجائے طنز و استہزاء بلکہ ناگوار خاطر نہ ہو تو میں یہ کہوں گا کہ پھکڑی بازی سے کام لیا اور شوریٰ کے ماحول کو بہت خراب کیا۔

اس جتھہ بندی کا مقصد، آپ کا منہ بند کرنے کے سوا آپ نے یہ بھی بتایا کہ آپ کو بعض مخصوص لوگوں کا آلۂ کار بنانا تھا۔ اگر یہ مخصوص لوگ شوریٰ سے باہر کے ہیں تب تو یہ فی الواقع ایک زیادتی ہے اور اگر آپ اسے ثابت کر سکیں تو بلا شبہ یہ ایک جرم بنتا ہے، لیکن آپ نے زبانی گفتگو کے وقت مجھ سے یہ فرمایا ہے کہ اس سے آپ کی مراد شوریٰ ہی کے اندر کے لوگ ہیں۔ اگر شوریٰ ہی کے اندر کے لوگ ہیں تو اس دستور کے تحت جس کی وفاداری کا آپ نے حلف اٹھایا ہے، ان کی اکثریت کا آلۂ کار بننے میں آپ کو عار نہیں ہونا چاہیے۔ ہاں اگر شوریٰ کے اندر کی کوئی اقلیت آپ سے یہ چاہتی تھی کہ آپ اس کے اشاروں پر چلیں تو آپ کا یہ فرض تھا کہ آپ انکار دیتے۔ یہ بات دستور کے بالکل مطابق ہے اور کوئی شخص اس پر آپ کو ملامت نہیں کر سکتا۔ معاملہ کی آئینی اور دستوری حیثیت تو یہ ہے لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں جماعت اسلامی کی شوریٰ کی یہ ایک مستقل روایت ہ کہ اس میں کسی مؤثر اختلاف کو نظر انداز کرنے کا طریقہ اختیار نہیں کیا جاتا بلکہ ایسی حالت میں بیچ کی کوئی ایسی راہ اختیار کی جاتی رہی ہے جس سے اتفاق کی صورت پیدا ہو جائے۔ شوریٰ کی تاریخ میں ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے اور اس

کو کبھی یہ رنگ نہیں دیا گیا کہ یہ کسی کا آلۂ کار بن جاتا ہے۔ بسا اوقات ایک نقطۂ نظر کی تائید میں عددی اکثریت اگرچہ نہیں ہوتی لیکن معنوی اکثریت ہوتی ہے۔ اس کا اگر لحاظ نہ رکھا جائے تو اگرچہ جماعت میں کوئی تشتت نہ بھی پیدا ہو جب بھی کسی پروگرام پر دلجمعی اور سرگرمی سے عمل نہیں ہوسکتا۔ اگر اس طرح کی کسی مصلحت کے تحت آپ نے کسی فارمولے سے اتفاق کیا تو یہ بہت اچھا کام کیا۔ جماعت کو اختلاف یا جمود سے بچانے کیلئے ایک دانشمند امیر کی حیثیت سے آپ کو یہی کرنا چاہیے تھا۔ لیکن میں حیران ہوں کہ جس مصلحت کو آپ نے شوریٰ کے اندر اہمیت دی وہ مصلحت شوریٰ کے ختم ہو جانے کے بعد آپ کی نگاہوں سے کیوں اوجھل ہوگئی؟ کیا آپ کو اندازہ یہ ہے کہ شوریٰ کے متفقہ فیصلہ کے خلاف آپ کا یہ اقدام اس سے بڑے تشتت کا موجب نہ ہوگا جتنا اس صورت میں متصور تھا جب کہ آپ شوریٰ کے اندر ہی مخصوص لوگوں کے اشاروں کے پابند ہونے سے انکار کر دیتے؟

۵۔ صورتحال کا یہ نقشہ پیش کرنے کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ آپ کے لیے دو ہی صورتیں باقی رہ گئی تھیں، یا تو آپ استعفاء پیش کر دیتے یا جماعت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کا خطرہ مول لے کر اس صورتحال کو سختی سے دبا دیتے۔ آپ نے پہلی صورت اختیار کرنی چاہی لیکن شوریٰ نے آپ کو یہ صورت اختیار کرنے نہیں دی۔ دوسری صورت آپ نے اختیار نہ کی کہ اس سے جماعت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کا خطرہ تھا۔ چارو ناچار آپ نے شوریٰ کو ان غلط نتائج پعر پہنچ جانے کے لیے چھوڑ دیا، جن پر آپ کے خیال کے مطابق جائزہ کمیٹی کے ارکان اور ان کے جتھے کے شرکاء شوریٰ کو پہنچانا چاہتے تھے۔

آپ نے اپنے استعفاء کی جو وجہ بیان کی ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس میں آپ سے سہو ہو رہا ہے۔ میری موجودگی میں آپ کے استعفے کی جو وجہ آپ کی جانب سے پیش کی گئی تھی وہ یہ نہیں تھی کہ کوئی جتھہ بندی ہوگئی ہے یا آپ کا منہ بند کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے بلکہ یہ بیان کی گئی تھی کہ چونکہ جائزہ کمیٹی کی رپورٹ میں آپ پر بہت سے الزامات ہیں، اس لیے آپ یہ چاہتے ہیں کہ ان امور پر ارکان شوریٰ کسی دوسرے شخص کی رہنمائی میں غور کریں تاکہ ان کی رائے پر آپ کے اثر انداز ہونے کا کوئی سوال پیدا نہ ہو۔ ارکان شوریٰ میں سے

طفیل صاحب کے سوا شاید کسی نے بھی آپ کی علیحدگی کی یہ وجہ معقول تسلیم نہیں کی، کیونکہ رپورٹ میں صرف آپ پر ہی الزامات نہیں تھے بلکہ اکثر ارکانِ شوریٰ پر بھی تھے۔ یہاں تک کہ خود جائزہ کمیٹی کے ارکان پر بھی تھے، اس وجہ سے کوئی بھی اس پوزیشن میں نہ تھا کہ امارت کا عہدہ سنبھال لیتا تو وہ سوال نہ پیدا ہوتا جو آپ کی امارت کی صورت میں پیدا ہوتا۔ اس وجہ سے شوریٰ کی اکثریت اور بھاری اکثریت نے بہتری اسی میں سمجھی کہ اب صورتحال جیسی کچھ بھی ہے اس کا سب مل کر مواجہہ کریں اور یہ کام آپ کی راہنمائی ہی میں ہو۔ خوش قسمتی سے آپ نے شوریٰ کا یہ نقطۂ نظر تسلیم کر لیا اور تعطل دور ہو گیا۔

شوریٰ کو ایک غلط نتیجہ پر پہنچ جانے دینے کے لیے آپ نے جو عذر پیش کیا ہے اس کا ایک حصہ تو صحیح ہے کہ جماعت میں تفریق کا اندیشہ تھا اور یہ چیز فی الواقع ایسی تھی جس سے جماعت کو بچانا ضروری تھا، لیکن میں یہ سوال ضرور کروں گا کہ جن نتائج پر شوریٰ پہنچی کیا وہ آپ کے نزدیک اتنے مہلک اور غلط ہیں کہ شوریٰ کے ختم ہوتے ہی آپ نے نہ صرف شوریٰ کے فیصلہ کو الٹ دیا بلکہ ایک سازش کا مفروضہ کھڑا کر کے سارے آئین وقانون کی بساط ہی لپیٹ کر رکھ دی اور جس تفریق کے اندیشہ سے آپ نے اس فیصلہ کو قبول کیا تھا، اسی تفریق کا دروازہ اس سے زیادہ وسیع پیمانے پر کھول دیا؟

ذرا سوچیئے تو کہ شوریٰ کی قرارداد میں ایسی کون سی ہلاکت چھپی ہوئی ہے جس کے خطرہ نے آپ کو اتنے بڑے اقدام پر آمادہ کر دیا؟ کیا یہ خطرہ کہ انتخابی سرگرمیوں میں سر دست آپ حصہ نہ لیں گے بلکہ زیادہ زور تعمیری کاموں پر صرف کریں گے؟ اگر اس وقت انتخابی سرگرمیوں سے صرفِ نظر کر کے تعمیری پروگرام پر زور لگائیں گے تو آخر جماعت تباہ کیوں ہو جائے گی؟ کیا انتخابی سرگرمیوں میں حصہ لینا اور وہ بی اس مرحلہ میں کوئی دین کے واجبات میں سے ہے؟ کیا تعمیری جدوجہد آپ کے نزدیک انتخابات کے لیے میدان ہموار نہیں کرے گی؟ کیا لوگ موجودہ قیادت کو آپ کی قیادت سے بدلنے کے لیے اتنے بے تاب و بے قرار ہیں کہ اگر آپ نے میدان میں اترنے میں دیر لگائی تو کفر بازی لے جائے گا اور اسلام ہار جائے گا؟ موجودہ حالات میں اگر آپ انتخابات لڑیں گے اور اپنے اصولوں

پر قائم رہ کر لڑیں گے تو میرا خیال ہے اور آپ کے تمام اہل الرائے رفقاء اس خیال سے متفق ہیں کہ شاید اس سے بھی برا حشر ہو جو پنجاب کے انتخاب میں ہو چکا ہے اور اگر اپ دو ایک سیٹوں پر کہیں کامیاب بھی ہوں گے تو شاید اپنے شائع کردہ اصولوں کی اس سے بھی زیادہ قربانی دینی پڑے گی جتنی دو سیٹوں کے لیے بہاولپور میں دینی پڑی۔ پھر میں نہیں سمجھتا کہ آخر شوریٰ کی اس تجویز میں وہ کیا خطرناکی ہے جس کے اندیشہ سے آپ نے یہ اقدام کر ڈالا؟ اس قرارداد کا بڑا حصہ آپ کا اپنا مرتب کردہ ہے۔ صرف انتخابی سرگرمیوں سے متعلق حصہ ایسا ہے جس کے الفاظ اس کمیٹی کے تجویز کردہ ہیں، جو غالباً آپ ہی کے ایماء پر شوریٰ کے دونوں نقطۂ ہائے نظر کے وکیلوں پر مشتمل بنی تھی اور رد و قدح کے بعد آپ نے بھی ان الفاظ کو قبول کیا کہ اس میں کوئی حرج نہیں، اور ساتھ ہی اس پورے گروپ نے اس کو قبول کیا جو انتخابی سرگرمیوں ہی کو اب کُل دین بنائے بیٹھا ہے۔

شوریٰ کی اس قرارداد میں لٹریچر کے حجت ہونے اور نہ ہونے سے متعلق جو شق ہے وہ محض آپ کی خواہش پر رکھی گئی اور اس سے آپ کا مقصود در حقیقت ان لوگوں سے جان چھڑانا تھا جو ہمارے ہی لٹریچر کا آئینہ ہمارے سامنے پیش کر رہے تھے اور ہم اس میں اپنے چہرے دیکھنے سے گھبراتے تھے۔ اس چیز کا مطالبہ نہ جائزہ کمیٹی نے کیا تھا نہ ان کے ہم نواؤں نے لیکن یہ عجیب ستم ہے کہ اب اس شق کو بھی آپ کی مظلومیت کے ایک ثبوت کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے کہ دیکھو جائزہ کیٹی والوں نے مولانا مودودی کے لٹریچر کو بھی مردود قرار دے دیا۔

بہرحال میں بالکل نہیں سمجھ سکا کہ آخر اس تجویز نے وہ کیا خطرہ پیدا کر دیا تھا جس سے بچاؤ کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ جماعت اسلامی کا امیر ایک آمر مطلق کی تلوار سنبھال لے؟ میں انتخابات کے معاملہ میں کبھی یہ نہیں سمجھتا تھا کہ اب آپ کے نزدیک بھی جماعت اسلامی کا مرنا اور جینا اسی کے لیے ہے۔ رہی نظریات کی کشمکش تو کم از کم اس قرارداد کے اندر تو اس کا کوئی جرثومہ موجود نہیں ہے۔ یہ تو جماعت کی تمام سابقہ پالیسی کی واضح الفاظ میں تصدیق کرتی ہے۔ صرف تدابیر کی بعض غلطیوں کو تسلیم کرتی ہے اور وہ بھی تردد کے ساتھ۔

۶۔ شوریٰ کے اس اجلاس میں جن لوگوں نے آپ کی حمایت میں ایک سرکاری پارٹی کا پارٹ ادا کیا، ان کی صفائی میں آپ نے فرمایا ہے کہ یہ جائزہ کمیٹی اور اس کے حامیوں کی جتھہ بندی کا ردعمل تھا۔ میں اس کو بھی واقعہ کے خلاف سمجھتا ہوں۔ اصل یہ ہے کہ جائزہ کمیٹی کے خلاف ایک پارٹی شوریٰ کے اندر اور باہر پہلے ہی سے موجود تھی اور اس کی قیادت کی زمام خود مرکز کے ہاتھ میں تھی۔ میرے لیے یہ کہنا تو مشکل ہے کہ اس کو خود آپ کی آشیرباد حاصل تھی لیکن جائزہ کمیٹی کے ساتھ آپ کا رویہ چونکہ شروع ہی سے غیر ہمدردانہ رہا، اس لیے یہ پارٹی جرأت کے ساتھ جائزہ کمیٹی کے خلاف بدگمانیاں پھیلاتی رہی۔ بد قسمتی سے جب رپورٹ سامنے آئی تو معلوم نہیں کیوں آپ نے اس کو اپنے خلاف ایک چارج شیٹ سمجھ لیا۔ آپ کے اس تأثر کا سامنے آنا تھا کہ وہ سارے لوگ جو آپ کی خواہش کے خلاف کسی چیز کا صور بھی نہیں کر سکتے، ایک پارٹی کی شکل میں رپورٹ کی مخالفت کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔ میرے نزدیک اس جماعت اسلامی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ جماعت کے اندر جماعتیں بننے کا آغاز ہوا اور اس میں شبہ نہیں کہ اگر اس چیز کو اسی وقت نہ روکا گیا تو جماعت اور تحریک بڑے برے انجام سے دوچار ہو گی لیکن اسی کے ساتھ مجھے اس امر میں بھی اب کوئی شبہ نہیں رہا کہ اس چیز کو روکنے کے لیے آپ نے جو الٹا قدم اٹھایا ہے اس نے جماعت اور تحریک کو اس برے انجام سے دوچار کر دیا ہے اور اب خدا ہی ہے کہ جو جماعت کو اس انجامِ بد سے بچا سکتا ہے۔

۷۔ اس میں شبہ نہیں کہ شوریٰ کی قرارداد جہاں تک اس کے اس حصہ کا تعلق ہے جو جماعت کی پالیسی کے بارے میں رہنمائی دیتی ہے، ایک مصالحتی فارمولے پر مبنی ہے۔ اس فارمولے کے متعلق آپ کا دعویٰ یہ ہے کہ ایک جتھے نے اپنی شدت، ہٹ اور مشترک کوشش بلکہ جماعت میں تفریق پیدا ہو جانے کے خطرہ کا دباؤ ڈال کر آپ کو اور شوریٰ کے بقیہ ارکان کو اس کے ماننے پر مجبور کیا اور اس طرح گویا جماعت کی تاریخ میں مصالحتی فارمولے کی بدعت شروع ہوئی۔ اس کے متعلق میں یہ عرض کروں گا کہ اگر ضد اور ہٹ اور جتھہ بندی سے آپ کی مراد شوریٰ کے دونوں گروپوں کا اپنے اپنے نقطۂ نظر پر اصرار ہے تو یہ چیز بلا شبہ

موجود تھی اور اگر یہ چیز کوئی جرم ہے تو میں یہ کہوں گا کہ اس جرم میں دونوں گروپ برابر کے شریک ہیں۔ اب ایسی صورت میں کیا ہونا اور کیا کرنا ممکن تھا۔ فرض کر لیجئے کہ اسی گروپ کی بات مان لی جاتی جو یہ کہہ رہا تھا کہ جائزہ کمیٹی کی رپورٹ نے حالات اور خرابیوں کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ قابل اعتناء نہیں ہے، اگر صحابہؓ کے زمانہ میں بھی کوئی جائزہ کمیٹی بیٹھتی تو وہ بھی اسی طرح کی رپورٹ پیش کر دیتی جس طرح کی رپورٹ جائزہ کمیٹی نے پیش کی ہے، اس وجہ سے جو کچھ ہو رہا ہے وہی کرتے رہنا چاہیے، اس وقت اصل کام انتخابات کا ہے نہ کہ تعمیر سیرت و تطہیر اخلاق کا، تو اس کا نتیجہ کیا نکلتا؟ باہر اس کا جو نتیجہ نکلتا وہ نکلتا، خود شوریٰ کے اندر اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ آپ کی شوریٰ کی اہل الرائے کی اکثریت یا تو اس نقطہ نظر کو قبول نہ کرتی یا قبول کرتی تو سخت بددلی کے ساتھ۔ اس پالیسی کو قبول کرنے کے لیے صرف جائزہ کمیٹی کے ارکان ہی تیار نہیں تھے بلکہ باقر خان صاحب، صادق صاحب، وصی مظہر صاحب، مولانا عبدالحق صاحب اور چودھری عبدالحمید صاحب میں سے کوئی صاحب بھی تیار نہیں تھے۔ حد یہ ہے کہ چودھری غلام محمد صاحب بھی اپنی تقریر میں انتخابات اور انقلاب قیادت کے بارے میں اپنی بے اطمینانی کا اظہار کر چکے تھے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اگر ان لوگوں کی بات نہ مانی جاتی تو یہ سب جماعت کو چھوڑ جاتے، لیکن جس پالیسی پر شوریٰ کے ایسے ارکان غیر مطمئن تھے، آخر یہ پالیسی کن لوگوں کے بل پر چلتی اور اگر چلتی تو بتائیے کہ وہ کس انجام تک پہنچتی؟ ایسی صورت میں جن لوگوں نے مصالحتی فارمولے کی سوچھی، میرے نزدیک تو وہ جماعت کے بڑے ہی خیر خواہ تھے اور انھوں نے ایک مصالحتی فارمولا تلاش کر کے جماعت کو ایک بڑے خطرے سے نکال لیا، اور آپ نے بھی بڑی ہی دانشمندی کا کام کیا تھا کہ ان کو مان لیا تھا، لیکن افسوس ہے کہ اس کو مان لینے اور منوا لینے اور شوریٰ کے اختتام پر اس کی کامیابی کی دعا کر چکنے کے بعد اب آپ اس کو جماعت اسلامی کی بدقسمتی کا آغاز سمجھتے ہیں اور جماعت کو اس کی ہلاکتوں سے بچانے کے لیے آپ نے اور بعض اُن حضرات نے جہاد کا اعلان کر دیا ہے جو نہ صرف اس فارمولے کو ماننے والے رہے ہیں بلکہ اس کی تصنیف میں بھی انھوں نے بسلامتی ہوش و حواس حصہ لیا تھا۔ مصالحتی فارمولے کا ذکر آپ نے کچھ ایسے

انداز سے فرمایا ہے گویا جماعت کی تاریخ میں یہ کوئی بہت بڑی بدعت ہوئی ہے جس کی ماضی میں کوئی مثال نہیں ہے، حالانکہ مصالحتی فارمولا خصوصاً تدابیر کے معاملہ مُں، نہ کوئی کفر و بدعت ہے نہ ہماری شوریٰ کی تاریخ میں کوئی نئی بات ہے۔ ہم ہمیشہ سے جس طریق پر گامزن رہیے ہیں وہ یہی ہے کہ شوریٰ میں متفقہ فیصلہ کر کے اٹھتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی تھی کہ ہمارے یہاں کوئی اختلاف رائے نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کی وجہ یہ ہوتی تھی کہ جب کبھی شوریٰ میں کسی مسئلہ پر مؤثر اختلاف رائے محسوس کیا جاتا تھا تو کسر وانکسار کے اصول پر اس اختلاف کو تجاویز میں سمونے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ مصالحتی فارمولے کی اصل روح یہی ہوتی ہے اور یہی اس مرتبہ بھی ہوا۔ اگر اس چیز سے جماعت اس سے پہلے نہیں تباہ ہوئی تو اب کیوں اس پر قیامت ٹوٹ پڑے گی؟

یہ بات بھی میری سمجھ میں نہیں آئی کہ شوریٰ کا یہ اجلاس کوئی دن دو دن نہیں رہا بلکہ پورے پندرہ روز اس کے اجلاس ہوتے رہے۔ اس فارمولے کے تمام امکانات و مضمرات آپ کے سامنے تھے۔ میں اس دوران میں بار بار آپ سے یہ عرض کرتا رہا کہ اگر انتخابات کے بارے میں اس وقت صرفِ نظر کی پالیسی اختیار کر لی جائے تو اختلاف رفع ہو جائے گا اور آپ نے مجھ سے ہر بار یہی فرمایا کہ انتخابات کا معاملہ ایسا کیا معاملہ ہے کہ جس سے صرفِ نظر نہ کیا جا سکے۔ اس فارمولے کے بنانے والے چودھری غلام محمد صاحب، نعیم صدیقی صاحب، سلطان احمد صاحب، باقر خان صاحب اور غالباً وصی مظہر صاحب ہیں۔ جب اس کمیٹی نے شوریٰ کے سامنے یہ فارمولا پیش کیا تو تھوڑی سی بحث کے بعد آپ نے اور دوسرے سب لوگوں نے اس کو مان لیا اگر یہ فارمولا جماعت اسلامی کی بدقسمتی کا آغاز تھا تو اسی وقت آپ نے فرما دیا ہوتا کہ میں ایک فرض شناس امیر کی حیثیت سے اس بدقسمتی کا آغاز کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ لیکن اس وقت تو آپ نے اس کا آغاز فرمانا منظور کر لیا اور اپنی فرض شناسی آپ کو یاد نہ آئی، لیکن جب ارکان کو اتحاد و اتفاق کی تلقین، اور دعا و درود کے بعد مجلس برخاست ہو گئی اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو سدھار چکے تو آپ کو اپنی فرض شناسی یاد آئی۔ جماعت کی تاریخ میں مصالحتی فارمولوں کی مثالیں تو مجھے ملتی ہیں، لیکن امیر کی

فرض شناسی کی کوئی ایسی مثال نہیں ملتی، اور میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کی فرض شناسی کی مثال شاید ہی کوئی امیر یا وزیر پیش کر سکے۔ آپ کے اصحاب میں سے جو لوگ جماعتی زندگی کی نزاکتوں کو نہیں سمجھتے، جن کے نزدیک جماعت اسلامی نام ہی آپ کی ذات کا ہے ان کو تو میں کچھ کہنا بے فائدہ سمجھتا ہوں۔ لیکن آپ کی اس قلا بازی نے معاف کیجئے میرے اس حسن ظن کو بڑا ہی نقصان پہنچایا ہے جو میں آپ سے رکھتا تھا۔

۸۔ ہ ساری تمہید استوار کرنے کے بعد آپ جائزہ کمیٹی پر وہ فرد جرم عائد کرتے ہیں جس کے تحت آپ کو امیر جماعت ہونے کی حیثیت سے، اس کے ارکان کو، سخت سے سخت سزا دینے کا حق حاصل ہو سکے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں یہ رائے قطعاً نہیں رکھتا بلکہ مجھے اس کا شبہ بھی نہیں ہے کہ جائزہ کا یہ پورا کام اور مجلس شوریٰ میں جائزہ کمیٹی کے ارکان کا کردار ایک دانستہ سازش کا نتیجہ تھا۔ لیکن میرا احساس یہ ہے کہ اس سے عملاً وہی نتائج برآمد ہوئے ہیں جو ایک دانستہ سازش سے برآمد ہو سکتے تھے۔ میں جب آپ کی لکھی ہوئی ان سطروں کو پڑھتا ہوں تو سب سے پہلا اثر اس کا جو مجھ پر پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کے ان جباروں اور ڈکٹیٹروں کے خلاف میرا غصہ بہت کم ہو جاتا ہے جنہوں نے اپنے نہایت وفادار ساتھیوں پر سازشوں کے الزام لگائے اور ان کو دار پر کھینچا۔ اگر آپ محض اختلاف رائے کی بناء پر سلطان احمد صاحب، مولانا عبدالغفار حسن صاحب، غازی عبدالجبار صاحب اور عبدالرحیم اشرف صاحب جیسے لوگو پر سازش کا الزام لگا سکتے ہیں تو دنیا کے دوسرے ڈکٹیٹروں نے اگر اپنے اقتدار کو بچانے کے لیے اخلاق اور سیرت کے لحاظ سے ہمارے مذکورہ رفیقوں سے کہیں کم تر درجے کے لوگوں پر سازشوں کے الزام لگائے تو میرے نزدیک کوئی بڑا گناہ نہیں کیا۔

آپ کہیں گے کہ میں نے ان پر دانستہ سازش کا الزام تو نہیں لگایا بلکہ یہ کہا ہے کہ انہوں نے جو کام کیا ہے اس سے نتائج وہ برآمد ہوئے ہیں جو ایک دانستہ سازش کے ہوتے ہیں لیکن یہ کہنے سے نہ صرف یہ کہ ان پر لگائے ہوئے الزام میں کوئی کمی نہیں ہوئی بلکہ اس سے سازشوں کا ایک نیا فلسفہ ہمارے سامنے آتا ہے جو اس سے پہلے کسی کو نہیں سوجھا تھا اب

تک تو ہم یہی سمجھتے رہے ہیں کہ سازش وہی ہوتی ہے جو سازش کے ارادے سے کی جاتی ہے لیکن اب معلوم ہوا کہ نہیں سازش صرف وہی نہیں ہے جو سازش کے ارادے کے ساتھ کی جائے بلکہ ہر وہ کام سازش ہے جو خواہ کتنے ہی نیک ارادہ کے ساتھ کیا جائے لیکن اس کا نتیجہ ہماری خواہش کے خلاف نکلے۔ اگر ایسا ہو تو ہم اس کو سازش قرار دے کر اس کے مرتکب کو وہی سزا دے سکتے ہیں جو ایک سازشی کو دی جا سکتی ہے اگر یہ فلسفہ آپ سے پہلے دوسروں کو بھی معلوم ہوتا تو اپنے سے مختلف نقطہ نظر رکھنے والوں کو سزا دینے کے معاملہ میں وہ بہت سی قانونی موشگافیوں سے بچ جاتے۔ وہ بھی آسانی سے یہ کہہ سکتے کہ فلاں نے اگرچہ فلاں کام سازش کے ارادے سے نہیں کیا ہے، لیکن چونکہ اس کے فعل کا نتیجہ وہی نکلا ہے جو ایک سازش سے بھی نکل سکتا ہے، اس لیے یہ سازش ہے اور اس لیے یہ سازش کی سزا کا مستحق ہے۔ معلوم نہیں سازش کے اس فلسفہ کا ماخذ اسلام میں کیا ہے؟

لیکن محض آپ کے اتنے کرم سے ان بے چاروں کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے کہ آپ ان کو دانستہ سازش کرنے والا نہیں قرار دیتے۔ جبکہ بہت سے ایسے کام انہوں نے آپ کے خیال میں دانستہ کیئے ہیں جو بالآخر اس سازش پر منتج ہوئے ہیں مثلاً آپ کے ارشاد کے مطابق انہوں نے مندرجہ ذیل جرائم دانستہ کیئے ہیں:

☆ ......ایک یہ کہ انہیں اچھی طرح علم تھا کہ وہ ایک ہی طرح کے غیر مطمئن لوگ ہیں، لیکن انہوں نے اس کو راز رکھا، نہ آپ کو اس سے آگاہ کیا اور نہ شوریٰ کے ارکان کو۔

☆ ...... دوسرا یہ کہ انہوں نے مجلس شوریٰ کے تجویز کردہ حدود کار سے تجاوز کیا۔ خود اپنے حدودِ کار کو وسیع کر لیا اور ان امور کی تحقیقات اپنے ذمہ لے لی جن کی وہ خود تحقیقات کرنا چاہتے تھے۔

☆ ......تیسرا یہ کہ انہوں نے مجلس شوریٰ میں ایسے حالات پیدا کیئے جن میں دوسرا رکن شوریٰ تو درکنار، امیر جماعت بھی خود اپنی رائے آزادی کے ساتھ ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔

☆ ...... چوتھا یہ کہ انہوں نے ساری تحقیقات ایک مخصوص نقطۂ نظر سے کی اور اپنی رپورٹ میں جماعت کی صرف یک رخی تصویر پیش کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ سارے مواد کو اس

طرز پر مرتب کیا کہ جن انتہائی نتائج تک ہو مجلس شوریٰ کو پہنچانا چاہتے تھے ان کی تائید اس پورے مواد سے حاصل ہو۔

☆...... پانچواں یہ کہ انہوں نے جتھہ بندی کر کے آپ کے لیے ایسے حالات پیدا کیئے کہ امیر جماعت کے فرائض انجام دینے کے بجائے آپ بعض مخصوص لوگوں کے آلۂ کار اور ان کے اشاروں پر چلنے والے بن کر رہیں۔

☆...... چھٹا یہ کہ ان لوگوں نے آپ کو مجبور کر دیا کہ آپ مجلس شوریٰ کو ان غلط نتائج پر پہنچ جانے دیں جن پر یہ حضرات اپنی جتھہ بندی کے ذریعے سے مجلس شوریٰ کو پہنچانا چاہتے تھے۔

☆......اساتواں یہ کہ ان لوگوں نے اپنی ضد، بے جا اصرار، شدت اور جتھہ بندی کے زور سے مجلس شوریٰ کے اندر آپ کے حامیوں کو بھی مجبور کر دیا کہ وہ ایک مخالف پارٹی کی حیثیت سے نمایاں ہوں۔

☆......آٹھواں یہ کہ اپنی بات منوانے کے لیے مجلس شوریٰ میں آنے سے پہلے انہوں نے جماعت کے فراہم کئے ہوئے موقع سے فائدہ اٹھا کر پوری جماعت میں اپنے ہم خیال لوگ ڈھونڈے، ان کا ایک جتھہ بھی شوریٰ کے باہر تیار کیا، ان کے انفرادی خیالات ونظریات کو جمع کر کے ان کا ایک مقدمہ بنایا، اس مقدمہ کی پشت پر جماعت کے ان سارے لوگوں کی شکایات واعتراضات کو جمع کیا جن کے وہم وگمان میں بھی اس خاص مقدمہ کو مضبوط کرنے کا تخیل نہ تھا۔ پھر اس سارے سروسامان سے لیس ہوکر یہ حضرات یکا یک مجلس شوریٰ کے سامنے ایک پارٹی کی صورت میں نمودار ہوئے اور پوزیشن یہ اختیار کی کہ ان کے نظریات صرف انہی کے نظریات نہیں ہیں بلکہ باہر ''غیر مطمئن لوگوں کی ایک کثیر تعداد'' ان کی پشت پر ہے، لہٰذا یہ مجلس شوریٰ اسی راستہ پر لے جس پر وہ اسے چلانا چاہتے ہیں ورنہ جماعت میں ایک بڑی پھوٹ پڑ کر رہے گی۔

یہ آٹھ جرائم تو انہوں نے آپ کے ارشاد کے مطابق دیدہ ودانستہ اور بسلامتی ہوش و حواس کیئے ہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ اس کے بعد یہ فیصلہ دینے میں کیوں ہچکچائے کہ جائزہ کمیٹی کا یہ سارا کام اور مجلس شوریٰ میں جائزہ کمیٹی کے ارکان کا کردار ایک دانستہ سازش

کا نتیجہ تھا۔ غالباً آپ نے یہ خیال فرمایا ہوگا کہ یہ آپ کے ان واضح مقدمات کے بعد جب ایک غبی سے غبی آدمی بھی اس نتیجہ تک خود بخود پہنچ جائے گا تو آخر اس نتیجہ کو ظاہر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ صاف صاف بات کہنے کے بجائے کیوں نہ لگے ہاتھوں احتیاط اور تقویٰ کا بھی کچھ مظاہرہ کر دیا جائے۔

بہرحال میرے نزدیک یہ ایک غیر مبہم حقیقت ہے کہ آپ نے جائزہ کمیٹی کے ارکان پر ایک منظّم سازش کا الزام لگایا ہے اور یہ سازش ایسی منظّم تھی کہ اس کے جال میں نہ صرف شوریٰ کے بعض ارکان پھنس گئے بلکہ پوری شوریٰ امیر سمیت ایک ایسے فیصلہ پر اپنے انگوٹھے ثبت کرنے پر مجبور ہوگئی جو آپ کے نزدیک جماعت کو تباہ کرنے والا ہے۔

میں جب آپ کی دی ہوئی روشنی میں اس سارے معاملے پر غور کرتا ہوں تو آپ کا کیس یہ بنتا ہے کہ درحقیقت اس گمراہی کے فیصلہ کے لیے کچھ لوگوں نے تو سازش اور جتھہ بندی کی اور کچھ اس سازش اور جتھہ بندی سے مجبور ہو گئے۔ خود آپ اپنے آپ کو اس دوسرے گروہ میں شامل سمجھتے ہیں۔ ایسی صورت میں آپ کے لیے میرے نزدیک صحیح صورت، دستور کے بموجب یہ تھی کہ آپ پھر شوریٰ کا اجلاس بلاتے اور اس کے سامنے اپنا یہ نقطۂ نظر رکھتے اور اس ساری سازش کا پردہ چاک کرتے، تاکہ ارکان شوریٰ صحیح روشنی میں سارے معاملہ پر نظر ثانی کرتے اور ان لوگوں کو سزا دیتے جو ان کو گمراہ کرنے کے لیے اس سازش کے مرتکب ہوئے تھے۔

اگر خدانخواستہ شوریٰ اسی طرح پھر گمراہ ہو جاتی جس طرح پہلی مرتبہ ہوگئی تھی تو پھر آپ کے لیے دوسرا راستہ ''دستور کی رو سے'' یہ تھا کہ آپ ارکان کا اجتماع عام بلاتے اور وہاں شوریٰ کے خلاف اپنا مقدمہ پیش کرتے اور شوریٰ کو اس کا موقع دیتے کہ وہ اپنی صفائی پیش کرے۔ اس کے بعد اگر ارکان جماعت شوریٰ کے حق میں فیصلہ دیتے تو آپ مستعفی ہو جاتے اور اگر آپ کے حق میں فیصلہ دیتے تو شوریٰ مستعفی ہو جاتی اور آپ دوسری شوریٰ کا انتخاب کرا لیتے۔ میرے نزدیک معاملہ کے طے کرنے کا آئینی اور باعزت طریقہ یہ تھا۔ شوریٰ کے جس فیصلہ کے خلاف آپ نے یہ اقدام کیا ہے، وہ جن حالات میں بھی ہوا ہے

بہر حال بالاتفاق ہوا ہے۔اس کے متعلق یہ معلوم کرنا ابھی بقی ہے کہ اپنی مجبوری اور بے بسی کا جوشکوہ اس فیصلہ کو مان چکنے کے بعد آپ کرر ہے ہیں اوراس کا جو پس منظر آپ بنا رہے ہیں اس سے دوسرے ارکانِ شوریٰ بھی متفق ہیں یا نہیں؟

لیکن یہ معقول اور آئینی طریقہ اختیار کرنے کے بجائے آپ نے یہ راستہ اختیار کیا کہ جائزہ کمیٹی کے چار ارکان کو یہ حکم دے دیا کہ وہ اپنے استعفے لکھ کر بھیج دیں ورنہ آپ ان کے متعلق حلقوں کو یہ لکھ دیں گے کہ اگر وہ آپ سے امارت کی خدمت لینا چاہتے ہیں تو وہ اپنے ان نمائندوں کو واپس لے کر دوسرے نمائندے منتخب کریں اوران کے بقیہ ہم خیالوں کو یہ دھمکی دے دی کہ آپ ان سے بعد نمٹیں گے۔

میں حیران ہوں کہ آپ کسی رکن شوریٰ سے کس حق کی بناء پر یہ مطالبہ کر سکتے ہیں کہ وہ شوریٰ کی رکنیت سے استعفاء دے دے۔اگر آپ یہ فرماتے ہیں کہ اس نے کوئی سازش کی ہے یا کسی سازش کا شکار ہوا ہے تو یہ ایک الزام ہوا جو آپ کی طرف سے اس پر لگایا جا رہا ہے۔یہ الزام کسی موزوں جماعتی عدالت میں ثابت کئے بغیر کس طرح آپ کو یہ حق حاصل ہے کہ آپ اس کو نہ صرف یہ کہ مجرم بنا ڈالیں بلکہ اس کو سزا بھی دے دیں اور پھر اس سے یہ مطالبہ بھی کریں کہ وہ آپ کے حکم سے خود پھانسی کا پھندا اپنی گردن میں ڈال لے۔

آپ کسی حلقہ کے لوگوں کے سامنے ان کے نمائندے کا معاملہ اگر پیش کر سکتے ہیں تو یا تو اس حیثیت سے پیش کر سکتے ہیں کہ اس کے خلاف کوئی الزام ثابت ہو چکا ہے اس لیے وہ اس کو واپس بلا لیں یا اس حیثیت سے پیش کر سکتے ہیں کہ اس کے خلاف آپ کو کوئی شکایت ہے جس کی حلقہ والوں کو تحقیق کرنی ہے اور پھر اس پر فیصلہ دینا ہے۔پہلی صورت یہاں موجود نہیں تی اور دوسری صورت میں یہ ضروری تھا کہ آپ تحقیق اور فیصلہ دونوں ان پر چھوڑتے ،لیکن آپ نے یہ کیا ہے کہ ایک فیصلہ بھی پہلے ہی سے کر کے ان پر لا دیا ہے جس کو اگر وہ نافذ نہ کریں تو آپ استعفاء دے دیں گے۔آخر کس حلقہ کے لوگوں کی شامت آئی ہوئی ہے کہ وہ ایک رکن شوریٰ کی خاطر امیر جماعت کو مستعفی ہونے پر مجبور کرنے کا خطرہ مول لیں۔آپ کا یہ کہنا بھی ایک بالکل ہی بے معنی بات ہے کہ لوگوں کو اپنے حلقہ والوں

کے سامنے صفائی پیش کرنے کا پورا حق ہوگا۔ جب حلقہ والے اپنے فیصلہ میں آزاد نہیں ہیں تو ان کے سامنے صفائی پیش کرنے سے کیا حاصل؟ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ کسی حلقہ والوں کو اپنا منتخب کردہ نمائندہ اس کی کسی کوتاہی یا نا اہلی کی بناء پر واپس بلا لینے کا حق ایک معقول حق ہے، لیکن یہ ایک بالکل مختلف بات ہے اس بات سے کہ آپ کسی حلقہ کے نمائندے کو واپس کردیں کہ یہ سازشی ہے، درآنحالیکہ آپ نے اس کی سازش کسی جماعتی عدالت میں ثابت نہیں کی ہے۔

آپ کے قیم جماعت نے اپنی معروف سادگی کے ساتھ فرمایا تھا کہ اگر کسی شخص سے یہ کہا جائے کہ بھئی آپ کو شوریٰ کی رکنیت سے استعفاء دے دینا چاہیے تو جماعت مزاج کا تقاضا تو یہی ہے کہ وہ استعفاء دے دیں۔ یں نے ان سے کہا کہ عام حالات میں تو یہ ہوسکتا ہے لیکن اگر آپ کسی رکن سے یہ کہیں کہ تم سازشی ہو اس لیے شوریٰ کی رکنیت سے استعفاء دے دو ورنہ ہم تمہارے حلقہ والوں سے مطالبہ کریں گے کہ تم کو واپس بلا لیا جائے، تو وہ آپ سے ضرور پوچھے گا کہ حضرت میرے سازشی ہونے کا ثبوت کیا ہے؟

پھر جائزہ کمیٹی کے ارکان کا معاملہ الگ الگ چار انفرادی ارکان کا معاملہ نہیں ہے بلکہ ایک کمیٹی کا معاملہ ہے جس نے اگر کوئی جرم کیا ہے تو ایک کمیٹی کی حیثیت میں کیا ہے۔ ایک جرم جو مشترک نوعیت سے کیا گیا ہے اس کے مجرموں کو الگ الگ عدالتوں میں بھیج کر ان کے مقدمہ کی سماعت کرانے کا طریقہ ایک نرالا طریقہ ہے اور غالباً سب سے پہلے اس کا تجربہ جماعت اسلامی ہی کرے گی۔

جائزہ کمیٹی کے ارکان میں سے دو غیر علاقائی ارکان ہیں۔ آخر ان غیر علاقائی ارکان کے معاملہ کو حلقہ وار اجتماعات میں رکھنے کا کیا تک ہے؟ اگر ان کا معاملہ پیش ہوسکتا ہے تو ارکان کے اجتماع عام میں، اور پھر یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے سامنے جائزہ کمیٹی کی رپورٹ بھی پیش ہو۔

بہرحال میں اس معاملے پر جس پہلو سے بھی غور کرتا ہوں، کم از کم میری سمجھ میں تو آتا نہیں۔ اب تو صورت گویا یہ بنی کہ جو شخص شوریٰ کا رکن بنے وہ اگر چاہے تو ادب سے

آپ کی خدمت میں کوئی گذارش کر دیا کرے، لیکن اگر اس نے اپنی رائے پر اصرار کیا یا آپ پر کوئی اعتراض اٹھایا یا اپنے زورِ استدلال سے کچھ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو گیا تو آپ اس سے خود استعفاء وصول کر لیں گے ورنہ اس کے حلقہ والوں کو لکھ دیں گے کہ اگر میری امارت چاہتے ہو تو اس سازشی کو واپس بلا لو اگر یہی جمہوریت و شورائیت ہے تو اس کا درس بہت اچھی طرح مسولینی، ہٹلر اور اسٹالین دے گئے ہیں اور مذہبی روپ میں مرزا بشیر الدین محمود دے رہے ہیں۔ اس کے لیے قوم ہماری خدمات کی محتاج نہیں ہے۔

آپ نے از راہ عنایت ملزم ارکان کو یہ موقع عنایت فرمایا ہے کہ آپ ان کو حلقہ وار اجتماعات میں اظہار خیال کی آزادی دیں گے اور اگر وہ ارکان جماعت کی اکثریت کو ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے تو آپ قیادت ان کی طرف منتقل کر دیں گے۔ مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ حلقہ وار اجتماعات میں آپ استعفے کی دھمکی کے ساتھ کھڑے ہو جائیں گے تو جماعت کی اکثریت آپ ہی کا ساتھ دے گی۔ بد قسمتی سے --- جماعت کا مزاج شروع ہی سے کچھ ایسا بنایا گیا ہے کہ ہمارے بہت سے ارکان دلائل کے بجائے اشخاص کی روشنی میں مسائل کو دیکھتے ہیں۔ یہ صورتحال ایک افسوس ناک صورتحال رہی ہے اور اس کی اصلاح ہونی چاہیے تھی، لیکن میں صفائی کے ساتھ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جن لوگوں نے اس صورتحال کی اصلاح کی جرأت کی ان کا منہ برابر بند کرنے کی کوشش کی گئی اور اب تو کچھ عرصے سے یہ حال ہے کہ مرکز میں با قاعدہ یہ نظریہ بنا لیا گیا ہے کہ تحریکیں اپنے اصولوں کے بل پر نہیں چلا کرتی ہیں بلکہ شخصیت کے بل پر چلا کرتی ہیں۔ چنانچہ اب جماعت کے سارے نظم و نسق کو اسی نظریہ کے تحت چلایا جا رہا ہے اور جو چیز بھی اس کے خلاف نظر آتی ہے، شدت کے ساتھ اس کو روکا جاتا ہے۔ میں غیر مبہم الفاظ میں یہ بات بھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ جائزہ کمیٹی اور شوریٰ کا فیصلہ نیز جائزہ کمیٹی کے ہم خیال ارکانِ شوریٰ کے خلاف آپ کا یہ تازہ اقدام بھی اسی نظریہ کا ایک مظہر ہے۔ جائزہ کمیٹی کی رپورٹ سے غالباً پہلی مرتبہ آپ کو یہ احساس ہوا کہ جماعت میں اب بہت سے لوگ ان خرابیوں کو محسوس کرنے لگے

ہیں جو مرکز کے غلط رجحان کے سبب سے پیدا ہو چکی ہیں اور شوریٰ میں غالبًا پہلی مرتبہ آپ کو یہ تجربہ ہوا کہ شوریٰ کے اہل الرائے ان خرابیوں کی اصلاح کی ضرورت کو اس شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگے ہیں کہ آپ کے استعفے کی دھمکی کے باوجود بھی وہ وہ اصلاح کی ضرورت کے قائل ہیں۔ اس چیز نے آپ کو گھبرا دیا، لیکن شوریٰ میں آپ نے دیکھ لیا کہ استعفے کی دھمکی سے بھی لوگوں کو دبایا نہیں جا سکتا۔ اس وجہ سے اس وقت تو آپ شوریٰ کا فیصلہ ماننے پر مجبور ہو گئے لیکن شوریٰ کے ختم ہو جانے کے بعد آپ نے یہ محسوس کیا کہ گربہ کشتن روزِ اول باید، اگر یہ رجحان ترقی کر گیا تو پھر اس کا روکنا ناممکن ہو گا۔ چنانچہ اس کو روکنے کے لیے ایک قدم تو خاص مرکز کی قیادت میں یہ اٹھایا گیا کہ جماعتوں کے مقامی اجتماعات میں ایک مفروضہ سازش کا فسانہ اور آپ کی مظلومی اور بے کسی کا دکھڑا سنا سنا کر ارکانِ جماعت کو شوریٰ کی قرارداد کے خلاف خوب اکسایا گیا تا کہ حلقہ وار اجتماعات سے پہلے جائزہ کمیٹی، شوریٰ کی قرارداد اور جائزہ کمیٹی کی رپوٹ کی تائید کرنے والے ارکان شوریٰ کے خلاف فضا خوب گرم ہو جائے، اور دوسرا قدم آپ نے اپنے فرمان کی صورت میں اٹھایا تا کہ ان تمام ارکانِ شوریٰ کی سرکوبی کی جائے، جنھوں نے آپ کے حضور میں جرأت کے ساتھ اظہار رائے کی گستاخی او شدت کے ساتھ اصلاح حال کا مطالبہ کیا۔ میرے نزدیک آپ کے اقدام کا اصلی محرک یہ ہے کہ جائزہ کمیٹی کی رپورٹ نے ایک طرف تو ہماری تصویر ہمارے سامنے رکھی ہے اور دوسری طرف اس کے ارکان نے ہمارے ہاتھ میں ہمارے ہی لکھے ہوئے لٹریچر کا آئینہ بھی پکڑا دیا ہے۔ اب جب اس آئینہ میں ہم اپنی صوت دیکھتے ہیں تو وہ بڑی ہی بھیانک نظر آتی ہے۔ ہم یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ فی الواقع ہماری صورت ہی مسخ ہو چکی ہے۔ اس وجہ سے اس کے سوا چارہ نہیں کہ یہ آئینہ ہی توڑ کر پھینک دیا جائے اور ساتھ ہی ان لوگوں کے سر بھی توڑے جائیں جو یہ تصویر اور یہ آئینہ ہمارے سامنے لائے ہیں۔

(دستخط) امین احسن اصلاحی

باب سوم

مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کی رفاقت کا

تاریخی پس منظر

اور جماعت اسلامی کا تنظیمی ڈھانچہ

ارکانِ جائزہ کمیٹی پر الزام نامے کے جواب میں مولانا مودودی کے نام مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کا یہ خط --- جسے بعد میں ایک موقع پر پاکستان میں شام کے سابق سفیر جناب عمر بہاء الامیری نے اس شکوے کے باوجود کہ ''فيه بعض الخشونة'' (اس میں قدرے درشتی پائی جاتی ہے) ایک قاضی کا فیصلہ قرار دیا اور مولانا اصلاحی کو مخاطب کر کے اعتراف کیا کہ ''قد كتبت هذا الكتاب كما يكتب القاضي قضائه'' (آپ نے یہ خط بالکل ایسے لکھا ہے جیسے ایک قاضی اپنا فیصلہ لکھتا ہے)! ----- جماعت اسلامی کے ان دو چوٹی کے قائدین کے آپس کے تعلقات اور سترہ سالہ رفاقت کے اختتام کی تمہید بن گیا، اور اس خط کے ذریعے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے گویا مولانا مودودی پر عدم اعتماد کا تحریری اظہار کر دیا!

یہ چونکہ جماعت کی تاریخ کا ایک انتہائی اہم واقعہ ہے ---- لہٰذا ضروری ہے کہ اسے اچھی طرح سمجھ لیا جائے اور اس کے لیے ان دونوں حضرات کے تعلقات کے تاریخی پس منظر پر ایک سرسری نظر ڈالنا بہت مفید ہے۔

اصحاب ثلاثہ

۴۱ء میں جب جماعت اسلامی قائم ہوئی تو اس وقت جو لوگ مولانا مودودی کی

دعوت پر جمع ہوئے ان میں اخلاص، تقویٰ اور للّٰہیت کے اعتبار سے تو ہوسکتا ہے کہ کچھ دوسرے لوگ بہت آگے ہوں لیکن مشہور عالم دین اور معروف اہل قلم ہونے کے اعگبار سے متحدہ ہندوستان کی جانی پہچانی شخصیتوں میں سے مولانا محمد منظور نعمانی مدیر ''الفرقان'' لکھنؤ اور مولانا امین احسن اصلاحی مدیر ''الاصلاح'' سرائے میر اعظم گڑھ کے نام صف اول میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ اور مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے دو مشہور معروف تلامذہ یعنی مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم صف ثانی میں سے قابل ذکر ہیں۔ مولانا مودودی، مولانا نعمانی اور مولانا اصلاحی نہ صرف یہ کہ عمر کے اعتبار سے تقریباً برابر تھے بلکہ علمی وصحافتی زندگی کے اعتبار سے بھی تقریباً ہم سن تھے۔ مولانا مودودی کا ''ترجمان القرآن'' مولانا نعمانی کا ''الفرقان'' اور مولانا اصلاحی کا ''الاصلاح'' ----- ان تینوں پرچوں کی اشاعت تقریباً ایک ہی وقت شروع ہوئی --- ان ''اصحاب ثلاثہ'' میں سے مولانا محمد منظور نعمانی پر دینی تعلیم کے قدیم سلسلے سے گہرے تعلق اور اصحاب تقویٰ واحسان سے قریبی روابط کی بنا پر علم دین کے ساتھ تقویٰ کا رنگ غالب تھا۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب مولانا حمید الدین فراہیؒ کے تلمیذ رشید ہوے کی بنا پر فہم قرآن میں ایک ممتاز حیثی کے مالک تھے ----- اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جدید نظریات وافکار کے وسیع مطالعے اور نظام دین پر ایک مکمل ضابطہ حیات ہونے کے اعتبار سے خصوصی نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک عام فہم، دل نشین اور شگفتہ طرزِ تحریر کے مالک ہونے کی وجہ سے جدید علم کلام میں ایک خاص مقام رکھتے تھے۔

جس زمانے میں مولانا مودودی متحدہ قومیت کے نظریئے اور نیشنلسٹ مسلمانوں کے موقف پر شدید تنقید کے ضمن میں مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے حق میں دلائل دیتے ہوئے ''مسلم قوم پرستی'' کے انتہائی مقام تک پہنچ گئے تھے، ایک بار ''الاصلاح'' اور ''ترجمان القرآن'' میں شدید ٹکراؤ بھی پیدا ہوا اور مولانا مودودی کے موقف پر مولانا اصلاحی نے اس اعتبار سے شدید تنقید کی کہ مسلم قوم پرستی فی نفسہٖ اسلام کے موقف کی صحیح ترجمانی نہیں ہے۔ لیکن جب مولانا مودودی نے اپنے نقطہ نظر کو تبدیل کرلیا اور خالص

اسلامی نقطۂ نظر کے تحت وہ مضامین لکھے جو ان کی کتاب ''سیاسی کشمکش'' کے حصہ سوم میں شامل ہیں تو مولانا اصلاحی نے ان کے نقطۂ نظر کی صحت کو تسلیم کر لیا اور اس طرح ان حضرات کے مابین تعاون اور اتحاد کی راہ ہموار ہوئی۔ (۱)

علمی وصحافتی تعارف سے قطع نظر مولانا مودودی سے ملاقات اور براہ راست ربط و تعلق کا موقع مولانا نعمانی کو مولانا اصلاحی سے پہلے ملا ----- اور جب مولانا مودودی نے خالص اسلامی نصب العین پیش کر کے ''جماعت اسلامی'' کے قیام کی دعوت دی تو مولانا نعمانی ہی نے مولانا اصلاح کو مولانا مودودی کے بارے میں یہ اطمینان دلایا کہ اگرچہ ان کی شخصیت اس معیار پر تو پوری نہیں اترتی جو اقامت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کا جھنڈا اٹھانے والوں کے لیے لازمی ہے ----- تاہم مولانا مودودی ایک ''کام چلاؤ'' آدمی بہرحال ہیں اور ان کے ساتھ تعاون واشتراک کیا جانا چاہیے۔ مولانا نعمنی کی اس رائے کے پس منظر میں جو جذبہ کارفرما تھا اس کی نشاندہی خود انہوں نے اپنے ایک حالیہ مکتوب میں ان الفاظ میں کی ہے:

> ''اسلامی کی سربلندی کا نصب العین زیادہ چھان پھٹک اور کھود کرید کرنے نہیں دیتا تھا......''

مولانا اصلاحی صاحب کی مودودی صاحب سے پہلی ملاقات جماعت میں شمولیت

(۱): اس موقع پر ''تحریک جماعت اسلامی'' کے حصہ اول کے دیباچے کے یہ الفاظ ذہن میں تازہ کر لیے جائیں: ''لیکن یہ بہرحال ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ جماعت اسلای کا قیام ان نظریات کی اساس پر نہیں ہوا جو مولانا مودودی نے ''سیاسی کشمکش'' کے پہلے اور دوسرے حصوں میں بیان فرمائے ہیں بلکہ ان پر ہوا ہے کہ جو اس کے تیسرے حصے میں مفصل و مدلل بیان ہوئے ......! ان نظریات کو اساس بنا کر مولانا نے ۱۹۴۰ء میں ایک اسلامی جماعت کی تشکیل کی دعوت دی جس کو قبول کرنے والوں میں وہ بھی تھے جو مولانا مودودی کے پہلے سیاسی موقف سے سخت اختلاف رکھتے تھے اور اس پر شدید تنقیدیں کر چکے تھے۔

لہٰذا 'تحریک جماعت اسلامی'' کی ابتداء زیادہ سے زیادہ ۳۹-۱۹۳۸ء سے شمار کی جاسکتی ہے۔ اس تحریک کے داعی یقیناً مولانا مودودی ہی ہیں لیکن ان کی جس دعوت پر جماعت اسلامی قائم ہوئی وہ سیاسی کشمکش حصص اول و دوم کی نہیں بلکہ صرف حصہ سوم کی ہے''۔ (صفحہ ۱۲)

کے اعلان کے بعد ہوئی اور مولانا نعمانی صاحب کی رائے کے برعکس مولانا اصلاحی صاحب کی جو رائے مولانا مودودی کے بارے میں قائم ہوئی اس کا اظہار انہوں نے انہی دنوں مولانا نعمانی سے ایک گفتگو میں بایں الفاظ کیا کہ:-''**لا فرق بینهٗ و بین پرویز**''(ان کے اور پرویز صاحب کے مابین کوئی فرق نہیں ہے)!

اس کے باوجود مولانا اصلاحی صاحب کا جماعت میں شامل رہنا اس بنا پر تھا کہ ان کے نزدیک وہ مقصد او نصب العین جس کے لیے کام کرنے ی دعوت مولانا مودودی صاحب نے دی تھی بہرحال بالکل صحیح تھا، اور دین کے اصل تقاضے اسی طریقے پر کام کرنے سے ادا ہو سکتے تھے جس طریقے پر کام کرنے کی دعوت مولانا مودودی نے دی تھی!

متذکرہ بالا پس منظر میں جو اجتماعیت قائم ہوئی، اس کا ایک پہلو تو یہ ظاہر ہے کہ اس میں داعی کی قوت جذب وکشش سے زیادہ نہیں تو کم از کم اس کے برابر دخل جمع ہونے والوں کے ذوقِ انجذاب کو حاصل تھا ------ اور دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ دوسری قدیم یا ہم عصر دینی جماعتوں اور تحریکوں کے برعکس ''جماعت اسلامی'' کی اجتماعیت کی اساس و بنیاد کوئی ''شخصیت'' نہ تھی' بلکہ نصب العین اور مقاصد تھے ------ یہی وجہ ہے کہ اول روز ہی سے اس میں دستور اور قواعد وضوابط کو بنیادی اہمیت حاصل رہی![1]

---

(۱): یہاں مذکورۃ الصدر دیباچے کے یہ الفاظ لائق توجہ ہیں:۔

''مولانا مودودی صاحب کو یقیناً اس کا حق ہے کہ اپنے ذہنی ارتقاء کے مختلف منازل اور اس سفر کے دوران لئے گئے موڑوں (Turns) کی تاریخ بیان فرماتے ہوئے ابتداء جہاں سے چاہیں کریں لیکن جماعتِ اسلامی کی تحریک کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اس کی ابتداء اس طرز پر کرنا اس صورت میں درست ہوسکتا تھا کہ ''جماعت اسلامی'' کچھ لوگوں کے مولانا مودودی صاحب کے ہاتھ پر ''بیعت'' کرنے سے معرض وجود میں آئی ہوتی۔ اس صورت میں کسی دستور کا مرتب ہونا اور امیر جماعت کا منتخب کیا جانا بے معنی ہوتا'' (صفحہ۱۲)

''چنانچہ جیسا کہ اس سے قبل اشارہ کیا جا چکا ہے کہ یہ جماعت اس طرح وجود میں نہیں آئی کہ کچھ لوگوں نے مولانا مودودی صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی ہو بلکہ اس کی تشکیل اس طرح ہوئی کہ کچھ لوگوں نے ایک نصب العین کے بعد اس کی ایک مخصوص تشریح اور ایک مکمل دستور کے ساتھ وفاداری کا رشتہ ◄◄

جماعت کا پہلا تنظیمی بحران

جماعت کے قیام کے بعد جب ''دارالاسلام'' میں قرب میسر آیا اور ایک دوسرے کو قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے تو جلد ہی مولانا محمد منظور نعمانی صاحب اور دوسرے بہت سے حضرات نے یہ محسوس کیا کہ مولانا مودودی کی شخصیت کے بارے میں ان کے پہلے اندازے بھی بہت مبالغے پر مبنی تھے اور یہ کہ ان کی شخصیت کو اس کام سے سرے سے کوئی مناسبت ہی نہیں ہے جسے لے کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، چنانچہ اپنے قیام کے ایک ڈیڑھ سال کے اندر جماعت اسلامی اپنے پہلے بحران سے دوچار ہوگئی-----اور مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا جعفر پھلواروی اور دیگر بہت سی اہم اور معروف شخصیتوں سمیت جماعت اسلامی کے کل ارکان کی تقریباً ایک تہائی تعداد جماعت سے علیحدہ ہوگئی۔

مولانا اصلاحی کا موقف

اس موقع پر جو دو باتیں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے ان حضرات سے کہیں وہ بعد کے پیش آمدہ واقعات کے اعتبار سے انتہائی اہم ہیں:-

ایک یہ کہ آپ حضرات چونکہ خود تدین و تقویٰ کے اعتبار سے بلند مقامات پر فائز ہیں لہٰذا آپ کے لیے جائز ہے کہ آپ مودودی صاحب کی شخصیت کے ان پہلوؤں پر تنقید کریں، جو تقویٰ کے منافی ہیں-----لیکن میں چونکہ اس اعتبار سے خود تقریباً مولانا مودودی ہی کی سطح کا آدمی ہوں لہٰذا اس معاملے میں زبانِ طعن نہیں کھول سکتا!

دوسرے یہ کہ اگر جماعت میں شامل نہ ہوا ہوتا تو دوسری بات تھی، لیکن اب جبکہ میں جماعت اسلامی میں شامل ہو چکا ہوں تو اس سے علیحدگی کو معمولی بات نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک اب صحیح صورت یہ ہے کہ اصلاحِ احوال کی مقدور بھر کوشش کی جائے لہٰذا میں

◀◀ استوار کیا اور پھر انہوں نے اپنے میں سے ایک امیر اور اس کی ایک مجلسِ شوریٰ منتخب کی اور ان کے مابین اختیارات کی حدود کو متعین کر دیا'' (صفحہ ۱۴)

جماعت میں شامل رہ کر اس بات کی سعی کرتا رہوں گا کہ ہم لوگ ایک دوسرے کی اصلاح کرتے اور ایک دوسرے کی خامیوں کی تلافی کرتے ہوئے آگے بڑھتے جائیں اور دین کی خدمت کی کوشش کریں۔

متذکرہ بالا بحران اور علیحدگیوں کے بعد مولانا امین احسن اصلاحی جماعت کی صف اول میں مولانا مودودی کے ساتھ تنہا رہ جانے کی بنا پر جماعت کی تنظیم میں واضح طور پر شخص نمبر دو بن گئے-----اول تو یہی بات کہ ایک شخص کسی جماعت میں واضح طور پر شخص دوم بن جائے اس کی پوزیشن کو نازک بنا دینے کے لیے کافی ہے----- پھر جب صورت حال یہ ہو کہ مزاج اور نقطۂ نظر کے اعتبار سے اس کے اور امیر کے مابین نمایاں فرق موجود ہو اور وہ اپنے ذمے یہ کٹھن خدمت بھی لے لے کہ اسے مقاصد اور نصب العین سے تعلق خاطر کی بنا پر نہ صرف اس کے ساتھ نباہ کرنا ہے بلکہ اس کی خامیوں اور کمیوں کی تلافی بھی کرنی ہے تو صورت حال اور بھی نازل ہو جاتی ہے---لیکن یہ حقیقت ہے اور اس سے شاید ہی کوئی شخص انکار کی جرأت کر سکے کہ مولانا اصلاحی صاحب نے اس نازک اور کٹھن ذمہ داری کو کمالِ ہمت و تحمل کے ساتھ مسلسل سولہ سترہ سال نبھایا۔

مولانا اصلاحی کی خدمات

اس پورے عرصے میں مولانا امین احسن اصلاحی مولانا مودودی کے دست راست رہے، اور پوری تن دہی اور انہما کے ساتھ نہ صرف اس نصب العین کی خدمت میں لگے رہے جس کی خاطر جماعت اسلامی میں شمولیت اختیار کی تھی، بلکہ جماعت کے اندر یا اس کے باہر کے حلقوں سے جب بھی کوئی حملہ مولانا مودودی کی ذات پر ہوا تو اس کی مدافعت میں بھی ہمیشہ مولانا امین احسن اصلاحی ہی سینہ سپر ہوئے حتیٰ کہ اس سلسلے میں انہیں اپنے دیرینہ دوستوں اور رفیقوں ہی کی نہیں بلکہ اپنے بزرگوں اور ممدوحوں و مخدوموں تک کی کبیدگیٔ خاطر برداشت کرنی پڑی۔

تقسیم ہند سے قبل یعنی جماعت اسلامی کے دورِ اول میں مولانا امین احسن اصلاحی

صاحب نے تحریک اسلامی کی جو سب سے بڑی خدمت سرانجام دی وہ یہ تھی کہ اس تحریک کے اصول ومبادی اوراس کے طریق کار کے بعض انتہائی اہم پہلوؤں اوراس کی جدو جہد کے نمایاں مراحل کو براہِ راست قرآن حکیم کی روشنی میں واضح اور مستحکم اساس پر مرتب و مدوّن کیا ----- جس کے نتیجے میں ''دعوتِ دین اوراس کا طریق کار'' جیسی بلند پایہ اور مایۂ ناز کتاب منصۂ شہود پر آئی۔ یہ بات بہت کم لوگوں کومعلوم ہے کہ اسی کتاب کے اثر سے جماعت اسلامی کے لٹریچر میں مولانا مودودی صاحب کی بعض اہم اور بنیادی مگر سطحی اصطلاحات جیسے حکومت الٰہیہ کا قیام وغیرہ کا استعمال متروک ہوا، اوران کی جگہ شہادتِ حق اور اقامت دین کی قرآنی اصطلاحات رائج ہوئیں اور فی الجملہ جماعت کی تحریک پر دینی رنگ زیادہ گہرا ہوا ----- جماعت کی تقسیم ہند سے پہلے تک کی ''رودادوں'' کے مطالعے سے دوسری حقیقت جو واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جماعتی زندگی کے مقتضیات اوراسلامی نظم جماعت کے اصول وفروع اور خدوخال کی وضاحت کے معاملے میں بھی مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے اہم کردار ادا کیا۔ (۱)

تنظیم جماعت کے ضمن میں ایک اصولی اختلاف

اس تعاضد وتناصر کے ساتھ ساتھ اندر ہی اندر ایک معاملے میں مولانا اصلاحی اور مولانا مودودی کے مابین اختلاف بھی رہا ----- یہ معاملہ اسلامی نظامِ جماعت میں امیر کے اختیارات سے متعلق تھا۔ مولانا مودودی بحیثیت امیر جماعت اسلامی اپنے لیے غیر

(۱): یہی بات ہے جو ''تحریک جماعت اسلامی'' کے دیباچے میں اس طرح بیان ہوئی کہ:-

''رہے ان کے (مولانا مودودی کے) مخصوص ''کلامی نظریات'' اوران کا خاص تصورِ دین و تحریک اسلامی تو جہاں یہ واقعہ ہے کہ وہ اولاً بھی جماعت کی اساس میں موجود تھے اور بعد میں بھی پیہم اس کی رگ وپے میں سرایت کرتے رہے وہاں یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ کچھ اور اہل قلم کی تحریروں نے بھی جماعت اسلامی کے تصور دین اور تحریک اسلامی کے خطوط اور نقوش مرتب کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی تصانیف تو اس معاملے میں انتہائی مؤثر ثابت ہوئی۔ حتیٰ کہ یہ حقیقت ہے کہ جماعت کی تشکیل کے بعد اس کے تحریکی لٹریچر میں مولانا اصلاحی صاحب کی تحریروں کا پلڑا بھاری نظر آتا ہے۔'' (صفحہ ۱۳)

محدود اختیارات کے طلب گار تھے۔ان کے نزدیک شوریٰ کا مقام صرف یہ تھا کہ امیر کو اپنے مشورے سے مطلع کر دے۔اس کے مشورے کو قبول یا ردّ کر دینے کا مکمل اختیار امیر کو حاصل تھا گویا جدید اصطلاح میں مولانا مودودی کے نزدیک جماعت اسلامی کے امیر کو شوریٰ پر ''ویٹو'' کا حق حاصل تھا-----اس کے برعکس مولانا اصلاحی شدت کے ساتھ اس رائے کے حامل تھے کہ اسلامی نظم جماعت میں امیر کو شوریٰ کے فیصلوں کا پابند ہونا چاہیے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اس معاملے میں مولانا اصلاحی صاحب کے پیش نظر اس مسئلے کے خالص علمی (ACADEMIC) پہلوؤں کے علاوہ خاص طور پر جماعت اسلامی کے مخصوص حالات بھی ہوں، بہر حال مولانا اصلاحی صاحب ابتداء ہی سے اس معاملے میں اپنے نقطۂ نظر کو پوری قوت کے ساتھ پیش کرتے رہے-----حتیٰ کہ تقسیم ہند سے متصلاً قبل الٰہ آباد کے کل ہند اجتماع کے موقع پر منعقدہ مجلس شوریٰ کے اجلاس میں اس مسئلے پر خاصی تلخی بھی ہوئی -----تاہم تقسیم ہند سے قبل تک چونکہ جماعت کا فعال دَور شروع ہی نہیں ہوا تھا لہٰذا اس معاملے کی اہمیت بھی زیادہ تر علمی (ACADEMIC) ہی رہی!

یک جان دو قالب

تقسیم ہند کے بعد بھی مسلسل نو دس برس تک مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی مزاج کے شدید اختلاف کے باوجود یک جان دو قالب ہو کر ساتھ کام کرتے رہے----اور پاکستان کے عوام اور جماعت اسلامی کے ارکان تو کجا خود مرکزی مجلس شوریٰ کے زیادہ سے زیادہ ایک دو آدمیوں کے سوا کسی کو بھی اس کا احساس تک نہیں ہوا کہ ان دونوں حضرات کے مابین کسی معاملے میں کوئی قابل ذکر اختلاف موجود ہے۔واقعہ یہ ہے کہ یہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کا انتہائی ایثار تھا کہ انہوں نے اپنی شخصیت کو بالکلیہ مولانا مودودی کی شخصیت میں ضم ہی نہیں، گم کر دیا اور اس معاملے میں انہوں نے صرف اپنے دیرینہ رفقاء اور بزرگوں کے طعنے ہی برداشت نہیں کئے بلکہ اغیار کی پھبتیاں تک سہیں۔کسی نے انہیں مولانا مودودی کا انجلز قرار دیا----اور کسی نے حکیم نور الدین! بہرصورت انہوں نے کبھی

مولانا مودودی کے 'رجل ثانی' (SECOND MAN) قرار دیئے جانے میں عار محسوس نہ کیا۔

ایک اہم دستوری نکتہ

اوپر امیر اور شوریٰ کے مابین اختیارات کی تقسیم کے سلسلے میں مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے نقطۂ نظر کے جس اختلاف کا ذکر کیا گیا ہے وہ بالآخر اس طرح طے ہوا کہ جماعت اسلامی پاکستان کے دستور میں امیر اور شوریٰ ے اختلاف کی صورت میں جماعت کے عام ارکان سے استصواب کی راہ حتمی طور پر متعین کر دی گی اور طے کر دیا گیا کہ اگر جماعت کے ارکان کی اکثریت امیر کی رائے پر صاد کر دے تو شوریٰ خود بخود معزول ہو جائے گی اور نئی شوریٰ منتخب ہو گی۔ بصورتِ دیگر امیر معزول ہو جائے گا اور نئے امیر کا انتخاب ہو گا! -----

عملی صورتِ حال

اس سے یہ تو ضرور ہو گیا کہ نظری اعتبار سے جماعت اسلامی کے دستور میں امیر کے ساتھ شوریٰ کو بھی اہم اور مستقل بالذات حیثیت حاصل ہو گئی اور ان کے مابین نزاع کی صورت میں تصفیے کی ایک راہ متعین ہو گئی لیکن عملاً جماعت اسلامی پاکستان میں شورائیت بطور ایک نظام (INSTITUTION) کبھی رائج نہ ہو سکی۔

آزادی کے فوراً بعد جماعت اپنے فعال دَور میں داخل ہو گئی اور اس میں کچھ تو حالات اور واقعات کی رفتار اس قدر تیز رہی کہ ایک قسم کی ہنگامی صورت حال ہ وقت طاری رہی جس میں مشاورت کے امکانات خود بخود ہی کم ہو جاتے ہیں ----- اور کچھ مولانا مودودی نے مسلسل یہ طرز عمل اختیار کئے رکھا کہ ہر اہم فیصلہ خود کر لیتے اور اس کے تحت آئندہ کے لیے عملی اقدام کی ابتدا بھی ----- کسی جلسۂ عام کی تقریر یا اخباری بیان میں کر ڈالتے ----- اس کے بعد جب شوریٰ کا اجلاس ہوتا تو وہ غریب اس صورت حال سے دوچار ہو جاتی کہ ایک اقدام کیا جا چکا ہے اور اب جماعت کا وقار اور اس کے امیر کی عزت

(PRESTIGE) صرف اس طرح قائم رہ سکتی ہے کہ جماعت اس لائحہ عمل (LINE OF ACTION) کو اختیار کرلے!

جماعت کی سول سروس

پاکستان میں جماعت اسلامی نے جو طریق کار اختیار کیا ----- اور اس کے جو نتائج برآمد ہوئے ان سب پر ایک سیر حاصل بحث ''تحریک جماعت اسلامی'' کے حصہ اول میں کی جاچکی ہے لیکن موضوع زیر بحث کا تقاضا ہے کہ اس کے چند مزید گوشوں کو روشنی میں لایا جائے!

پاکستان میں جماعت کے کام کی تیز رفتاری اور اس کے تیزی کے ساتھ وسعت پذیر ہونے کے یہ نتائج تو ظاہری ہیں کہ نہ نئی بھرتی کے لیے سابقہ معیار قائم رکھا جاسکا اور نہ نئے آنے والوں کے لیے تربیت کا کا طر خواہ اہتمام ہوسکا ----- لیکن عواقب کے اعتبار سے اس کا سب سے زیادہ خطرناک نتیجہ جو برآمد ہوا وہ یہ تھا کہ نو وارد اور ہر اعتبار سے خام مگر ''تیز'' کارکنوں کی 'تیزی' کے ساتھ جماعت میں آگے بڑھنے کے مواقع مل گئے۔ اول تو جو لوگ جماعت کے اس 'سیاسی دَور' میں جماعت میں شامل ہوئے ان کے ذہن کی ساخت اور مزاج کی افتاد میں فطری طور پر شروع ہی سے 'سیاست' کا رنگ غالب تھا ----- پھر تیزی سے بڑھتی ہوئی ضروریات کے تحت جب جماعت کی CIVIL SERVICE توسیع پذیر ہوئی تو اس میں ایک فطری ضرورت کے تحت وہ لوگ کھپائے گئے جو جماعت سے تعلق کی بنا پر سرکاری ملازمتوں سے علیحدہ کئے گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب لوگ بلا استثناء علم دین سے بالکل کورے تھے اور بقول شخصے صرف تفہیمات اور تنقیحات کے 'فارغ التحصیل' تھے۔ حد یہ ہے کہ ان میں سے ایک اچھی بھلی تعداد نے جماعت کے تمام لٹریچر کو بھی بالاستیعاب نہ پڑھا تھا ----- اور ان کے بڑے بڑوں کے لیے بھی مولانا اصلاحی صاحب کی تحریریں تو بہت 'مشکل' اور 'روکھی' تھیں ہی! ----- جماعت کے حالیہ طریق کار کے پیش نظر جو سب سے بڑا وصف ان لوگوں میں تلاش کیا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ وہ تقریر کرسکیں،

اچھے منتظم ہوں اور دفتری و تنظیمی ذمہ داریوں کو با قاعدگی اور نفاست کے ساتھ ادا کر سکیں یعنی یہ کہ فی الجملہ ''تیز کارکن'' ہوں۔ چنانچہ ان میں سے جو جتنا 'تیز' ثابت ہوا، اسی قدر تیزی کے ساتھ مقامی اور ضلعی جماعتوں کی قیمیت سے ہوتا ہوا قیم حلقہ کے مقام تک جا پہنچا -----اور دیکھتے ہی دیکھتے جماعت کی پوری مشینری پر ان حضرات کا مکمل تسلط ہو گیا۔

اہل علم' جماعت میں اول تو پہلے ہی کم تھے۔ پھر ان کی بھی ایک بڑی تعداد ہندوستان میں رہ گئی -----اور پاکستان کی جماعت کے حصے میں جو آئے وہ رفتہ رفتہ آٹے میں نمک کے برابر ہوتے چلے گئے۔ رہے دینی مزاج رکھنے والے متدین اور سنجیدہ و متین لوگ تو ان کا کچھ عرصے تک تو احترام کیا جاتا رہا اور بعض ذیلی امارتوں پر ایسے حضرات فائز رہے، لیکن رفتہ رفتہ یہ منصب بھی ان 'نکمے اور سست' لوگوں سے چھین کر 'مستعد کارکنوں' کے حوالے کر دیئے گئے -----حتیٰ کہ حلقوں کی امارت پر بھی یہی 'کارکن' لوگ قابض ہو گئے! -----اور رفتہ رفتہ صورت یہ ہو گئی کہ یہی لوگ مولانا مودودی کے اصل دست و بازو اور جماعت اسلامی کی اصل قوت و طاقت بن گئے۔ اور اہل علم اور متدین مزاج لوگ پیچھے ہٹتے اور گوشوں میں سمٹتے چلے گئے۔ لے دے کے صرف ایک خیریت رہی اور وہ یہ کہ جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ میں خصوصاً غیر علاقائی نشستوں پر بالعموم اہل علم اور متدین لوگ ہی منتخب ہوتے رہے اور اس میں آخر وقت تک ایسے حضرات کو ایک مؤثر حیثیت حاصل رہی اور اگر چہ ان وجوہات کی بنا پر جو اوپر بیان ہو چکی ہیں، یہ لوگ جماعت کی مجموعی پالیسی پر کبھی اثر انداز نہ ہو سکے تاہم اتنا ضرور ہوا کہ مرکزی مجلس شوریٰ میں 'کارکن' حضرات کو زیادہ سر اٹھانے کا موقع نہ مل سکا اور علم اور اہل علم کا ای وقار اور دبدبہ اس طرح قائم رہا کہ نئے نئے فلسفے اور نظریات اور تازہ رجحانات جو جماعت کے اس فعال عنصر میں پیدا ہوئے وہ اگر چہ عملاً جماعت کی رگ و پے میں سرایت کرتے رہے تاہم شوریٰ میں کبھی بار نہ پا سکے بلکہ شوریٰ میں بالعموم ان پر نکیر ہی ہوتی رہی۔

شخصیت(۱) گری

ان نئے نظریات میں سب سے زیادہ خطرناک نظریہ یہ تھا کہ تحریکیں مجرد اصولوں کے بل پر نہیں چلا کرتیں بلکہ شخصیتوں کے بل پر چلا کرتی ہیں لہٰذا جماعت اسلامی کی کامیابی کے لیے لازمی ہے کہ مولانا مودودی کی شخصیت کو ابھار کر سامنے لایا جائے۔ اس خیال نے خاص طور پر اس وقت بہت زور پکڑا جب ۵۱ء میں سابق صوبہ پنجاب میں جماعت کو انتخابات میں بری طرح شکست ہوئی اور 'کارکن' حضرات کے حوصلوں اور امنگوں کو زبردست دھچکا لگا۔ اس وقت جہاں ایک طرف یہ سوچا گیا کہ ٹھیٹھ اصول پرستی کو ترک کر کے عوام میں مقبولیت کے لیے کچھ نعرے (SLOGANS) اختیار کئے جائیں، وہاں ایک دوسری راہ یہ تجویز ہوئی کہ مولانا مودودی کو جلد از جلد پاکستان کا ''قائداعظم'' بنا دیا جائے ----- بدقسمتی سے پاکستان کے ابتدائی چند سالوں میں جماعت اسلامی کی ''مطالبے'' کی مہموں اور ان کی خصوصی تکنیک نے ملک کی فضا میں ایک وقتی اور عارضی سا تہلکہ واقعتاً مچا دیا تھا اور اسی ضمن میں خاص طور پر کراچی کے چند جلسوں میں مولانا مودودی کو بڑی بھاری تعداد میں سامعین نے سنا تھا۔ اس بنا پر اس کا امکان محسوس کیا گیا کہ 'پیراں نمی پرند مریداں می پرانند' کے اصول پر کام کیا جائے تو بہت جلد مولانا مودودی کو پاکستان کا قومی رہنما اور ہیرو بنایا جا سکتا ہے ----- چنانچہ ایک طرف جماعت کے ادیبوں اور انشا پردازوں نے مولانا مودودی کی ذات کے مختلف پہلوؤں کو عظمت اور تقدس کے خوش نما فریموں میں سجا کر عوام کے سامنے پیش کرنا شروع کیا اور دوسری طرف استقبالوں، جلوسوں، استقبالیہ دعوتوں، سپاسناموں اور نذرانے کی تھیلیوں کے ذریعے کم سے کم ایک بار تو انہیں ایک مکمل قومی لیڈر کے روپ میں پیش کر ہی دیا گیا۔

جماعت میں اس نئے رجحان نے پرانے سنجیدہ اور متدین لوگوں کو سخت پریشان کر دیا اور ان کی جانب سے اس قسم کی سرگرمیوں پر ناپسندیدگی کا اظہار ہونا شروع ہوا، لیکن اول تو

---

(۱): PERSONALITY CULT

اس مہم کی سرکردگی مرکز کے فعال عناصر کررہے تھےاوردوسرے یہ بھی محسوس ہورہا تھا کہ اس معاملے میں ان حضرات کومولانا مودودی کی مکمل تائیدنہیں تو کم ازکم اشیرواد ضرور حاصل تھی۔مولانا مسعود عالم مرحوم نے خودمولانا مودودی کی ذات میں اس رجحان کو بہت پہلے محسوس کرلیا تھا اور یہ بات انہیں جس قدر ناپسند تھی اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ہمشیہ اپنے شعبے (دارالعروبہ) کو جماعت کے مرکز سے دُور ہی رکھا۔مولانا عبد الغفارحسن صاحب نے ایک باران سے اس معاملے میں استفسار کیا کہ اس کا کیا سبب ہے کہ آپ مرکز سے دُور ہی رہتے ہیں تو انہوں نے نے فرمایا:-

''مولانا مودودی چاہتے ہیں کہ میں دارالعروبہ کے ذریعے عرب ممالک میں ان کی ذات کا پروپیگنڈہ کروں لیکن جب تک میں دارالعروبہ میں موجود ہوں انشاءاللہ ان کی یہ خواہش پوری نہی ہوگی!''

اس سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس رجحان کی مزاحمت ہرکسی کے بس کی بات نہ تھی اور مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے سوا جماعت میں اورکسی شخص کو یہ مقام حاصل نہیں تھا کہ وہ اس فتنے کی سرکوبی کر سکے۔ چنانچہ یہ ناخوشگوارفرض انہی کوانجام دینا پڑااور وقتاً فوقتاً جب بھی اس نظریئے نے جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ میں سراٹھایا انہوں نے اس کی سختی سے مذمت کی اور بارہا ایسا ہوا کہ انہیں اس نظریئے کے علمبرداروں کودرشتی سے ڈانٹ دینا پڑا-----!اور یہ بات مولانا مودودی کے مقتدین کےنزدیک اس امر کا کافی ثبوت بن گئی کہ مولانا اصلاحی مولانا مودودی کی بڑھتی ہوئی شہرت اور روز افزوں مقبولیت کی بنا پر ان سے حسد کرنے لگے ہیں!

دوسرا بحران اور مولانا اصلاحی

ان حقائق کو پس منظر میں رکھ کران واقعات پرغور کیا جائے جو جائزہ کمیٹی اوراس کی رپورٹ کے بعد پیش آئے تب صورتِ حال کی صحیح تصویر سامنے آتی ہے۔۱۹۵۵ء میں جبکہ جماعت کو پاکستان میں ایک خاص نہج پرکام کرتے ہوئے آٹھ سال ہو چکے تھے، جماعت کے عام ارکان کی جانب سے جماعت کی پالیسی اورطریق کاراورخصوصاً اس کے دینی و

اخلاقی انحطاط کے بارے میں تشویش کا ایک عام اور پُر زور اظہار ہوا‘ اس وقت تو مولانا مودودی نے غالباً بر بنائے ’حکمت‘ اس عام بے چینی اور بے اطمینانی کا مواجہہ کرنے کی بجائے جائزہ کمیٹی کے تقرر کو غنیمت سمجھا لیکن بعد میں یہی جائزہ کمیٹی ان کے گلے کا ہار بن کر رہ گئی!

جماعت کے مرکز کے ’فعال‘ اور ’کارکن‘ عنصر نے جائزہ کمیٹی کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں بھی ڈالیں لیکن مرکزی مجلس شوریٰ میں ان کی پیش نہ گئی اور پہلی جائزہ کمیٹی پر اعتراض کئے گئے تو شوریٰ نے اسے توڑ کر ایک دوسری جائزہ کمیٹی مقرر کردی -----ایک سال کے بعد جب یہ جائزہ کمیٹی اپنی رپورٹ لے کر شوریٰ کے سامنے پیش ہوئی تو اس کے جمع کردہ مواد نے شوریٰ کی ایک فیصلہ کن اکثریت کو اس قطعی نتیجے پر پہنچا دیا کہ جماعت ایک بالکل غلط رُخ پر بڑھ آئی ہے۔ اور اب خیریت اسی میں ہے کہ اس کے رُخ کو تبدیل کر دیا جائے! مولانا مودودی اور ان کے ہم خیال لوگوں نے پہلے خود جائزہ کمیٹی پر جرح کرنے کی کوشش کی لیکن جائزہ کمیٹی کے اراکین کی وضاحتوں نے اس حملے کو پسپا کر دیا۔ بدرجۂ مجبوری مولانا مودودی نے اپنے استعفے کے ذریعے اظہارِ ناراضگی کیا لیکن شوریٰ کا تأثر اس قدر گہرا تھا کہ ان کی یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی -----اور جماعت اسلامی کی تاریخ میں غالباً پہلی اور آخری مرتبہ مجلس شوریٰ نے مولانا مودودی کے مقابلے میں اپنے موقف پر اصرار کیا -----اب جماعت کے دستور کی رو سے مولانا مودودی کے سامنے دو ہی راستے کھلے رہ گئے تھے۔ یا یہ کہ شوریٰ سے مفاہمت کرلیں -----اور یا پھر اپنے اور شوریٰ کے نزاع کو لے کر عام ارکان کے سامنے پیش ہوں۔ اس صورت میں مولانا مودودی بحیثیت امیر جماعت ایک فریق ہوتے اور پوری مرکزی شوریٰ فریق ثانی بنتی! -----مولانا مودودی نے پہلی راہ اختیار کی اور ایک مصالحتی فارمولے پر دستخط ثبت کرکے ’بقول مولانا اصلاحی‘ دعا و درود کے بعد شوریٰ برخاست ہوگئی۔

یہ تو سوائے عالم الغیب والشہادۃ کے کوئی نہیں جانتا کہ مولانا واقعتاً مصالحت پر آمادہ ہوگئے تھے----یا ان کا یہ اقدام خالص ’’حکمت عملی‘‘ پر مبنی تھا لیکن جو کچھ عالم واقعہ میں

ظہور پذیر ہوا وہ یہ تھا کہ ایک طرف ان کے فعال اور کارکن نائبین نے ہنگامہ کھڑا کر دیا اور لاہور، لائل پور اور راولپنڈی کے مقامات پر شوریٰ اور خاص طور پر اس کے ''قدامت پسند'' ارکان کے خلاف شورش برپا کر دی، اور دوسری طرف دس دن کے اندر اندر مولانا مودودی کا وہ ''الزام نامہ'' ارکانِ جائزہ کمیٹی کے ہاتھوں میں پہنچ گیا----!! جو ہر اعتبار سے صریح ناانصافی اور زیادتی اور سراسر ظلم اور دھاندلی تھا۔

ظاہر ہے کہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے علاوہ جماعت میں کسی اور شخص کو یہ مقام حاصل نہ تھا کہ وہ اس موقع پر مولانا مودودی کے ہاتھ پکڑ سکتا اور انہیں اس ظلم اور زیادتی سے باز رکھ سکتا۔ چنانچہ نبی ﷺ کے اس فرمان مبارک کہ: ''اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا'' پر عمل کرتے ہوئے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے مولانا مودودی کو سمجھانے اور اس ظلم سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی -----لیکن جب انہیں اس میں ناکامی ہوئی تو ان پر سخت مایوسی طاری ہوئی اور مولانا مودودی پر ان کا اعتماد متزلزل ہو کر رہ گیا......اسی مایوسی اور دل شکستگی کے عالم میں مولانا اصلاحی صاحب نے مولانا مودودی کے نام وہ مفصل خط لکھا، جس نے مولانا مودودی کے ''الزام نامے'' کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں اور ان کی ناانصافی اور دھاندلی کو بالکل عریاں کر کے ان کے سامنے رکھ دیا۔

مولانا اصلاحی نے اپنے اس خط میں اگرچہ جائزہ کمیٹی کے تقرر سے لے کر شوریٰ کے اختتام تک کے تمام واقعات پر مفصل تبصرہ کیا اور مولانا مودودی کے الزام نامے کے ایک ایک لفظ کا پوسٹ مارٹم کیا لیکن ان کا اصل زور دستور اور ضابطے کی پابندی ----اور جمہوریت اور شورائیت کے نظام کو برقرار رکھنے پر تھا! ---اور ان کے خط کے اسی مرکزی نقطے کی وضاحت کے لیے اس کے پس منظر کو اس قدر تفصیلاً بیان کرنا ضروری تھا۔

باب چھارم

مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے استعفے

مصالحت کی نئ کوشش

اور راقم الحروف کا موقف

مولانا مودودی کا استعفاء اس از امارتِ جماعت ......اپنے اس خط میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے جائزہ کمیٹی اوراس کی رپورٹ پر مولانا مودودی کے الزامات کی قلعی کھولنے اور جائزہ کمیٹی کے تقرر سے لے کر شوریٰ کے اختتام تک مولانا کے طرزِ عمل کا تجزیہ کرنے کے ساتھ ساتھ -----اس امکان کے پیش نظر کہ عین ممکن ہے کہ مولانا نے شوریٰ میں واقعی صدق دل کے ساتھ 'مصالحت' کی ہو لیکن بعد میں ان پر اس کے نقصانات واضح ہوئے ہوں----- جماعت کے دستور کی رو سے یہ صاف اور سیدھی راہ کھول کر بیان کر دی کہ آپ مجلس شوریٰ کا اجلاس دوبارہ بلائیں اور اس میں اپنا نقطہٴ نظر پوری وضاحت سے رکھ دیں۔ پھر اگر شوریٰ آپ کے نقطہٴ نظر کو قبول کر لے تو فبہا' ورنہ آپ شوریٰ کے خلاف اپنا مقدمہ ارکانِ جماعت کے سامنے پیش کر دیں۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بالفرض اجلاسِ شوریٰ کے دوران مولانا مودودی کسی ذہنی کشمکش اور تذبذب میں مبتلا رہے بھی تھے تو اب بہر حال وہ ایک واضح اور متعین لائحہ عمل اختیار کر چکے تھے اور جائزہ کمیٹی کے نام ''الزام نامہ'' انہوں نے کسی غلطی یا چوک کی بنا پر نہیں بلکہ ایک مستقل فیصلہ کر کے تحریر کیا تھا ----- چنانچہ مولانا اصلاحی صاحب کا خط ملنے پر انہوں نے فوری طور پر یہ فیصلہ کر لیا کہ منطق اور دلیل ----- اور قاعدے اور قانو کو بالائے طاق رکھ کر سیدھی طرح اپنی 'شخصیت' کا زور آزما لیا جائے اور دلائل و براہین کے

چھوٹے چھوٹے باٹ چھوڑ کر ایک بار اپنی 'شخصیت' کا پورا وزن ایک پلڑے میں ڈال کر فیصلہ کرلیا جائے۔ اور یہ کوئی انوکھی بات بھی نہ تھی! -----تحریکوں اور جماعتوں کی تاریخ میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ رفیقوں کے ایثار اور کارکنوں کی محنت و مشقت سے بنی ہوئی 'شخصیتیں' بالآخر اپنی 'شخصیت' ہی کو اپنے قریب ترین رفیقوں کے مقابلے میں ''برہانِ قاطع'' کے طور پر استعمال کرتی رہی ہیں۔

چنانچہ مولانا مودودی نے مولانا اصلاحی صاحب کو ان کے خط کا جواب تو کوئی نہ دیا البتہ یہ کہلوا دیا کہ میں امارت سے مستعفی ہو رہا ہوں اور دوسرے ہی روز اخبارات میں مولانا مودودی کا استعفاء امارتِ جماعت اسلامی ان الفاظ میں شائع ہو گیا:[1]

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جماعت اسلامی پاکستان کی امارت سے مستعفی ہو گئے

مولانا کے استعفاء پر غور کرنے کیلئے مرکزی مجلس شوریٰ کا اجلاس طلب کرلیا گیا

لاہور۔۱۰ر جنوری' جماعت اسلامی پاکستان کے امیر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے جماعت کے جنرل سیکرٹری کے نام ایک خط لکھا ہے جس میں وہ جماعت کی امارت سے مستعفی ہو گئے ہیں۔ جماعت کے جنرل سیکرٹری نے ۱۲ر جنوری کو مرکزی مجلس شوریٰ کا اجلاس طلب کرلیا ہے جس میں مولانا کے استعفاء پر غور کیا جائے گا۔

مولانا کے استعفاء کا متن حسب ذیل ہے:

''میں جماعت اسلامی پاکستان کی امارت سے استعفاء پیش کر رہا ہوں۔ براہِ کرم اس کے متعلق ضابطہ کے مطابق کررروائی کریں۔

۱۹۵۵ء میں رہائی کے بعد جب مجلس شوریٰ نے مجھے جماعت اسلامی کا امیر منتخب کرنا چاہا تھا میں نے یہ گزارش کی تھی کہ میں اب صرف ایک معمولی رکن

(۱): اس کی اشاعت کے سلسلہ میں مولانا امین احسن اصلاح صاحب کا بیان ملاحظہ ہو:-

''امیر جماعت کے استعفے کے متعلق جماعت کی مجلس مشاورت نے بالاتفاق یہ طے کیا کہ اس کو راز میں رکھا جائے اور شوریٰ کا ہنگامی اجلاس بلا کر صرف اس کے سامنے اس کو پیش کیا جائے لیکن مرکزی سٹاف نے ----مجلس مشاورت کے فیصلے کے خلاف اس کو بڑی دھوم دھام سے اخبارات میں شائع کرایا۔''

جماعت کی حیثیت سے خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ مجھ میں ذمہ داری کا منصب سنبھالنے کی اب طاقت نہیں ہے لیکن اُس وقت میری معذرت قبول نہ کی گئی اور مجھے امیر منتخب کرلیا گیا۔ پھر نومبر ۱۹۵۶ء میں جب مجلس شوریٰ کا اجلاس ہوا تو میں نے استعفاء پیش کیا اور یہ بھی گزارش کی کہ وجوہ کوزی بحث لائے بغیر مجھے سبکدوش کر دیا جائے لیکن افسوس ہے کہ میری یہ درخواست بھی رد کردی گئی۔ اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ میرا امیر جماعت رہنا جماعت کے لیے مفید ہونے کی بہ نسبت نقصان دہ زیادہ ہے، اس لیے میں اس منصب کو چھوڑنے میں ایک لمحہ کی دیر لگانا بھی گناہ سمجھتا ہوں اور یہ بات واضح کیے دیتا ہوں کہ یہ استعفاء واپس لینے کے لیے پیش نہیں کیا جارہا ہے میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ اب جماعت میں کوئی منصب بھی حتیٰ کہ مجلس شوریٰ کی رکنیت بھی قبول نہ کروں گا۔ میں جماعت کے نصب العین اور نظام کی جو کچھ بھی خدمت کرسکتا ہوں ب صرف ایک رکن جماعت کی حیثیت سے کرسکتا ہوں۔

الحمدللہ کہ جماعت اسلامی کے ساتھ میرا علق نہ محض ضابطہ کا ہے اور نہ کسی منصب پر موقوف ہے۔ یہ ایک گہرا تعلق وروحانی رشتہ ہے جو کسی حال میں ٹوٹ نہیں سکتا اور جماعت کا مقصد میرا اپنا مقصد زندگی ہے' جس کی خاطر ہی میرا مرنا اور جینا ہے۔ اس لیے میری خدمات جماعت کے لیے جس طرح آج تک وقف رہی ہیں اسی طرح انشاءاللہ ہمیشہ وقف رہیں گی اور جو بی امیر جماعت ہوگا اس کا خیر خواہ اور اس کی اطاعت فی المعروف کا پابند رہوں گا۔ میں اس بات سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ جس چیز کی تعمیر کے لیے میں نے آج تک جان کھپائی ہے اب میں ہی اس میں کسی خرابی کے پیدا ہونے کا ذریعہ بنوں۔

امارت کا منصب چھوڑتے ہوئے میں جماعت کو دو باتوں کی نصیحت کرتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ میرے رفقاء میرے ان مشوروں کو جو خالص خیر خواہی کی بنا پر میں عرض کر رہا ہوں قبول فرمائیں گے۔ میری پہلی نصیحت یہ ے کہ ہر وہ شخص جو اس جماعت کی بھلائی چاہتا ہے میرے استعفاء کے وجوہ کو زیر بحث لانے سے کلی اجتناب کرے اور اخبارات میں یا محفلوں اور مجلسوں میں اس کے متعلق چاہے کیسی ہی قیاس آرئیاں اور رائے زنیاں ان کو صبر وسکوت کے ساتھ ٹال دے۔ اس بحث

میں بھلائی اگر کچھ ہو بھی تو وہ برائی کی بہ نسبت بہت کم ہے۔ دوسری نصیحت میں یہ کرتا ہوں کہ امارت کا نیا انتظام بالکل اسی طرح کیا جائے جس طرح ایک امیر جماعت کے اچانک مر جانے پر کیا جانا چاہیے۔ کوئی بحث جو اس سے پہلے پیدا ہوئی ہو نہ تازہ کی جایے اور نہ اس کا پس منظر ہی پیش نظر رکھا جائے بالکل نئے سے کام کا آغاز کرنے ہی میں جماعت کی بھلائی ہے۔

میں تمام رفقائے جماعت کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے میرے ہر دورِ امارت میں نہایت اخلاص و محبت اور پورے اعتماد کے ساتھ میرا ہاتھ بٹایا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر انہیں جزائے خیر دے۔ اس کے ساتھ میں ان تمام رفقاء سے معافی بھی چاہتا ہوں جنہیں پچھلے پندرہ سال میں کبھی مجھ سے کوئی تکلیف پہنچی ہو۔ خصوصیت کے ساتھ حال میں مجلس شوریٰ کے جن ارکان کے بارے میں، میں نے کارروائی کی تھی، مجھے احساس ہے کہ انہیں اس سے ضرور اذیت پہنچی ہوگی۔ ایک شخص جو کسی ذمہ داری کے منصب پر ہو اسے کبھی نہ کبھی اپنے ذاتی تعلقات کو نظر انداز کر کے اپنے فرائض کی انجام دہی میں ایسے کام کرنے پڑ جاتے ہیں جن سے اس کے دوستوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میری امارت کے ساتھ اس معاملہ کو بھی ختم کر دیا جائے اور اس کی یاد بھی ذہن میں نہ رکھی جائے۔ میں اپنے ان رفقاء سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس کے متعلق ہر شکایت دل سے نکال دیں اور مجھے معاف کر دیں''۔ (ماخوذ از روزنامہ کوہستان مورخہ ۱۱/جنوری ۱۹۵۷ء)

ہنگامے .... اس استعفاء کی اشاعت سے ایک طرف تو یہ فطری ردّعمل ظاہر ہوا کہ جماعت اسلامی کے ارکان، متفقین، ہمدردوں اور متأثرین کے حلقے میں ایک انتہائی جذباتی اور ہنگامی صورت حال پیدا ہوگئی۔ قریب کے شہروں سے جماعت کے لوگوں کے وفود مرکز جماعت میں آنے شروع ہو گئے اور دُور دراز کے علاقوں سے تاروں کا تانتا بندھ گیا۔ اور پوری جماعت میں پریشانی اور فکرمندی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور اس طرح ایک ایسی فضا تیار ہوگی جس میں صحیح کیا ہے اور غلط کیا کے فیصلے سے زیادہ توجہ اس امر پر مرکوز ہوگئی کہ کسی طرح مولانا مودودی کو استعفاء واپس لینے پر آمادہ کیا جائے!!

اور دوسری طرف مولانا کے فعال نائبین نے ارکانِ جائزہ کمیٹی اور ان کے ہم خیال اراکین شوریٰ کے خلاف ایک باقاعدہ مہم شروع کر دی۔ لاہور، لائل پور اور راولپنڈی اس مہم کے اہم مورچے تھے۔ لاہور میں اس مہم کے کمان دار جناب نعیم صدیقی تھے۔ لائل پور میں جناب اسعد گیلانی اور راولپنڈی میں جناب صدیق الحسن گیلانی۔ یہ مہم جس طور سے چلائی گئی اس کا اندازہ اس ایک واقعے سے ہوسکتا ہے کہ لاہور میں ارکانِ جماعت کے ایک اجتماع میں جب نعیم صدیق صاحب نے جائزہ کمیٹی اور شوریٰ کے ''رجعت پسند'' ارکان کے خلاف دھواں دھار تقریر کی اور ان پر شدید قسم کے ذاتی حملے کئے اور جماعت کے کچھ ارکان نے انہیں ٹوکا کہ ان لوگوں کی عدم موجودگی میں اس طرح کے الزامات لگانا اسلامی تعلیمات کے منافی ہے تو ----- ملک نصر اللہ خاں عزیز صاحب نے طنز اور تمسخر کے ملے جلے جذبات کے ساتھ فرمایا کہ ----- ''جی ہاں! آج جس تقویٰ کی تعلیم دینا چاہتے ہیں اس کی مثال ایسی ہے کہ کچھ غنڈے کسی شریف اور پردہ دار گھرانے میں گھس کر عورتوں کی عزت و ناموس پر حملہ کر رہے ہوں اور باہر کچھ متقی حضرات داخلے کے اِذن کے انتظار میں کھڑے رہ جائیں!'' ----- یعنی عام ارکانِ جماعت کے سامنے ان حضرات نے صورت حال کا جو نقشہ پیش کیا وہ یہ تھا کہ مولانا مودودی جو اس تحریک کے مؤسس اور داعی اول بھی ہیں اور از یوم تاسیس تا امروز اس کی قیادت بھی کرتے رہے ہیں' آج ایک انتہائی مظلومانہ صورت حال سے دوچار ہیں اور جائزہ کمیٹی کے ارکان اور شوریٰ کے کچھ لوگوں نے مل کر ان پر ایسا ستم توڑا ہے کہ وہ انتہائی بے چارگی کے عالم میں امارتِ جماعت کے منصب سے مستعفی ہونے پر مجبور ہو گئے!

روپیگنڈے کی اس انتہائی افسوسناک مہم کے ساتھ ساتھ ----- بعض ''امرائے حلقہ'' نے اپنے اختیارات کا 'بھرپور' استعمال بھی شروع کر دیا۔ چنانچہ جناب امیر حلقہ لائلپور نے مرکزی مجلس شوریٰ کے دو اراکین یعنی حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب اور چودھری عبدالحمید صاحب کی رکنیت جماعت ہی کو معطل کر دیا ----- اسی قسم کی کارروائی جناب سعید ملک صاحب کے ساتھ بھی ہونے والی تھی کہ انہیں خبر ہو گئی۔ چنانچہ انہوں نے پیشگی

وار کر دیا اور ایک با قاعدہ پریس کانفرنس بلا کر اس میں جماعت سے اپنے استعفے کا اعلان کر دیا اور ساتھ ہی جامعت کی قیادت پر بہت سنگین قسم کے الزامات عائد کیے-----مولانا عبدالجبار غازی صاحب نے اس موقع پر بھی اپنی روایتی شرافت کا ثبوت دیا اور وہ کچھ کہے سنے بغیر خاموشی کے ساتھ جماعت کی رکنیت سے مستعفی ہو گئے!

جناب قیم جماعت' میاں طفیل محمد صاحب نے مولانا کے استعفاء پر غور کرنے کے لیے مرکزی مجلس شوریٰ کا ہنگامی اجلاس طلب فرمایا تو اس میں ایک 'خصوصی احتیاط' یہ برتی کہ چونکہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اُس وقت اتفاقاً کسی ٹیکنیکل رکاوٹ کی بنا پر شوریٰ کے با قاعدہ رکن نہ تھے لہٰذا انہیں شوریٰ میں شرکت کی دعوت نہ دی۔ (حالانکہ اس سے قبل شوریٰ کے پندرہ روزہ اجلاس میں مولانا شریک رہے تھے)۔ادھر لائل پور سے حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے فون پر دریافت کیا کہ ''میرے پاس بیک وقت دو 'حکم نامے' پہنچے ہیں۔ایک آپ کا جس میں آپ نے شوریٰ میں شرکت کے لیے طلب فرمایا ہے اور دوسرا جناب امیر حلقہ کا جس میں میری رکنیت جماعت ہی معطل کر دی گئی ہے!-----تو فرمائیں کہ میرے لیے کیا حکم ہے؟-----تو جواباً ارشاد فرمایا کہ ''آپ لاہور چلے آئیے' شوریٰ کے پہلے اجلاس میں یہ مسئلہ طے کر لیا جائے گا کہ آپ شریک ہو سکتے ہیں یا نہیں!'' اور جب حکیم صاحب نے مزید اصرار کیا کہ انہیں لاہور پہنچے اور پھر شوریٰ میں شریک ہوئے بغیر لوٹنے کی ذلت سے بچا لیا جائے تو ارشاد ہوا کہ 'گھبرائیے نہیں! آپ کو آمد و رفت کا کرایہ دے دیا جائے گا-----! اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن!!

شوریٰ کی قرار دادِ اعتماد..............ان حالات میں مرکزی مجلس شوریٰ کا ہنگامی اجلاس منعقد ہوا تو ظاہر ہے کہ اس کے معزز اراکین اس کے سوا اور کیا سوچ سکتے تھے کہ جیسے بھی ہو پہلے روٹھے ہوئے امیر کو منایا جائے۔باقی باتیں بعد میں دیکھی جائیں گی۔چنانچہ شوریٰ نے مولانا مودودی صاحب اعتماد کی قرار داد پاس کی اور ان سے استعفاء واپس لینے کی درخواست کی۔روزنامہ ''کوہستان'' لاہور کی ۱۳ر جنوری کی اشاعت کی خبر ملاحظہ ہو۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے استعفاء واپس لینے کی درخواست!

جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کی قرارداد

لاہور ۱۲ر جنوری۔ مجلس شوریٰ جماعت اسلای پاکستان کا ایک خاص اجلاس آج صبح ۱۱ بجے جماعت کے مرکزی دفتر چوہدری غلام محمد امیر حلقہ کراچی کی صدارت میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے جماعت کی امارت سے استعفاء پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوا اور حسب ذیل قرارداد بالاتفاق رائے پاس کی۔

’’اس وقت جماعت اسلامی جن غیر معمولی حالات سے دوچار ہے ان کے ہوتے ہوئے امیر جماعت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا منصب امارت سے اچانک مستعفی ہو جانا مجلس شوریٰ کی نگاہ میں ایک عظیم سانحہ ہے۔ درحقیقت ’جماعت‘ موصوف کی رہنمائی کی جتنی محتاج اس وقت ہے اتنی شاید پہلے کبھی نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے استعفاء نے جماعت کو ایک شدید اضطراب میں مبتلا کر دیا ہے۔ مجلس شوریٰ اس موقع پوری جماعت کی نمائندگی کرتے ہوئے بالاتفاق مولانا مودودی کی قیادت پر مکمل اعتماد کا اظہار کرتی ہے۔ مولانا کی پندرہ برس کی خدمات اور قربانیوں کے پیش نظر ان کے ہوتے ہوئے امارت کے منصب کے لیے جماعت اسلامی کی نگاہ کسی اور طرف اٹھ ہی نہیں سکتی اور نہ کوئی دوسری شخصیت اس تحریک کو اتنی خوش اسلوبی سے چلا سکتی ہے جس کی مثال جماعت کے داعی اول نے قائم کی ہے۔ عمر، صحت اور کسی ایسے غیر اختیاری تقاضے کے تحت خدانخواستہ اگر کبھی مولانا کو اس بارِ گراں سے سبکدوش ہونا پڑے تو وہ بالکل دوسری صورت ہوگی اور ایسے عالم معذوری میں جماعت ان کے اوپر ظلم کرنا کبھی پسند نہ کرے گی لیکن اس وقت خدا کے فضل سے مجلس شوریٰ کے نزدیک ایسی صورت نہیں ہے۔

بنا بریں مجلس شوریٰ متفقہ طور پر امیر محترم سے یہ درخواست کرتی ہے کہ جماعت سے ان کی جو والہانہ محبت ہے، اسے پوری طرح بروئے کار لا کر موصوف انا استعفاء واپس لے لیں۔ مجلس شوریٰ یہ یقین دلاتی ہے کہ نہ صرف اس مجلس کے اعضاء بلکہ عام ارکانِ جماعت حسب سابق پوری طرح خیر خواہی اور اخلاص کے

ساتھ اطاعت وتعاون کرتے رہیں گے۔

مجلس شوریٰ مولانا عبدالغفار حسن، شیخ سلطان احمد، چودھری غلام محمد، ملک نصراللہ خاں عزیز، مولانا عبدالحق، خان سردار علی خاں اور خان محمد باقر خاں پر مشتمل ایک وفد کو مامور کرتی ہے کہ وہ اس قرارداد کو مجلس کی طرف سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی خدمت میں پیش کرے اور ان پر زور ڈالے کہ وہ مجلس کی اس مخلصانہ اپیل کو کسی صورت میں بھی مسترد نہ فرمائیں۔"

اس کے ساتھ ہی اخبار مذکور نے جو یہ 'خبریں' بھی شائع کیں کہ:-

"آج مرکزی مجلس شوریٰ اور اس کے معتمد کے نام متعدد مقامات سے اس مضمون کے تار موصول ہوئے کہ شوریٰ کو چاہیے کہ مولانا مودودی کا استعفاء ہرگز ہرگز قبول نہ کرے اور اپنی پہلی ہی نشست میں اس کی نامنظوری کا اعلان کردے۔

کل کی طرح آج بھی مرکز میں صبح سے شام تک لاہور اور باہر کے مختلف مقامات سے لوگ آتے رہے۔ اکثر حضرات جو باہر سے آئے ہوئے ہیں وہ کل سے یہی پر مقیم ہیں۔ راولپنڈی اور اوکاڑہ سے مزید لوگ پہنچے۔ ان کے علاوہ سیالکوٹ' بہاولپور اور کراچی سے بھی لوگ یہاں آئے۔ آج کی ڈاک میں تار اور ٹیلیفون کے ذریعے مختلف مقامات پر پاس شدہ قراردادیں بھی موصول ہوئی"۔

تو صاف ظاہر ہے کہ یہ سارا مواد جماعت کے مرکزی سٹاف ہی کا فراہم کردہ تھا! اور اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جماعت نے قیام پاکستان کے بعد ابتدائی چند سالوں میں 'مطالبہ' کا جو خصوصی تکنیک ایجاد کیا تھا جس کی اس کے کارکنوں کو خاصی مشق ہو چکی تھی کس طرح خود اس کے اندرونی معاملات میں وہ پورا تکنیک ہو بہو استعمال ہوا۔ ع

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

اس کے علاوہ -----اسی شوریٰ نے یہ بھی طے کیا کہ جلد از جلد ارکان جماعت کا ایک کل پاکستان اجتماع عام منعقد کیا جائے' جس میں جماعت کی آئندہ پالیسی اور امیر جماعت کے استعفاء کے وجوہ وغیرہ پر غور کیا جائے۔ شوریٰ کے اس اجلاس نے یہ بھی طے کیا کہ:

’’چونکہ اس مجلس شوریٰ نے اجتماع ارکان کی اس ضرورت کو محسوس کر کے منعقد کرنا طے کیا ہے کہ ارکانِ جماعت آزادانہ بحث کر کے جماعت کی آئندہ پالیسی اور لائحہ عمل طے کریں اور مجلس شوریٰ کی یہ خواہش ہے کہ پالیسی کی اس بحث میں کوئی سابق فیصلہ کسی حیثیت سے حائل نہ ہو، اس لیے مجلس شوریٰ یہ مناسب سمجھتی ہے کہ مجلس نے اپنے گزشتہ اجلاس میں جو قرارداد پالیسی کے متعلق پاس کی تھی وہ آئندہ کُل پاکستان اجماع ارکان کے وقتِ آغاز سے کالعدم قرار پائے۔‘‘

شوریٰ کے اس فیصلے پر شیخ سلطان احمد صاحب نے باصرار اپنا یہ اختلافی نوٹ (NOTE OF DISSENT) ریکارڈ کرایا کہ:-

’’مجلس شوریٰ ن ء اپنے گزشتہ اجلاس منعقدہ ۲۵ رنومبر تا ۹ ردسمبر ۵۶ ء کے اختتام پر خوب اچھی طرح بحث اور غور کر لینے کے بعد جماعت اسلامی کی پالیسی اور طریق کار کے بارے میں جو قرارداد منظور کی تھی وہ مجلس کی طرف سے ایک متفقہ فیصلہ کی حیثیت سے ارکانِ جماعت کے سامنے پیش کی گئی تھی اور اس پر شرکائے مجلس میں سے کسی نے بھی اپنے اختلاف کا اظہار آخر وقت تک بھی نہیں کیا تھا۔

اب اگر ارکانِ جماعت یا ارکانِ شوریٰ یا امیر جماعت کو اس فیصلہ پر اطمینان نہیں ہو سکا ہے یا شوریٰ کی قرارداد کی تشریح اور تعبیر میں اختلاف واقع ہو رہا ہے تو میری رائے میں اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اسی مجلس کے سامنے تمام اعتراضات اور عدم اطمینان کے وجوہ پیش ہونے چاہئیں تا کہ پچھلی بحثوں کے تمام پہلوؤں اور گزشتہ اجلاس کی کارروائی کو از سرنو تازہ کیے بغیر پیش نظر رکھتے ہوئے مجلس اپنی قرارداد پر عائد شدہ اعتراضات پر کما حقہ غور کر سکے۔ اس کے بعد ہی شوریٰ اس فیصلہ کی ترمیم، تنسیخ یا توثیق کرنے میں پوری طرح حق بجانب ہو گی۔ اگر خدانخواستہ مجلس شوریٰ دوبارہ غور کر لینے کے بعد متفق الرائے نہ ہو سکے تو پھر اختلاف امور بغرضِ استصواب متعین طور پر ارکان جماعت کے اجتماع عام میں پیش کیے جا سکتے ہیں اور وہاں ایک ایک مسئلہ پر اظہار رائے کے بعد آخری اور قطعی فیصلہ کیا جا سکتا ہے لیکن اعتراض یا بے اطمینانی کی وجہ سامنے رکھے اور اس پر کوئی رائے ظاہر کیے بغیر مجلس شوریٰ کی ایک متفقہ قرارداد کا خود بخود کالعدم قرار دیا جانا میرے نزدیک بالکل غلط،

جماعت کے لیے ایک بری نظیر اور مجلس کے لیے سخت بدنامی کا باعث ہوگا اور اس طرح شوریٰ کا یہ تازہ فیصلہ اشخاص اور جماعت کے بارے میں عائد شدہ بعض نہایت سخت الزامات کی نادانستہ طور پر تصدیق کر دینے کا ہم معنی بن جائے گا۔

بنا بریں میں اس فیصلہ سے اپنے اختلاف کا صاف صاف اظہار کر رہا ہوں''۔ (سلطان احمد ۱۳/جنوری ۵۷ء)

لیکن جب اس اجلاسِ شوریٰ کی کارروائی جماعت میں شائع (CIRCULATE) کی گئی تو 'فرط احتیاط' س اس اختلافی نوٹ کا ذکر تک نہ کیا گیا۔ اس پر شیخ سلطان احمد صاحب نے حسب ذیل 'احتجاج' جناب قیم جماعت کی خدمت میں ارسال کیا:-

''آپ کا سرکلر نمبر ۲۷-۴-۱۱۸ مورخہ ۱۹/۷/۱۹۵۷ء موصول ہوا۔ اس مراسلہ میں آپ نے مرکزی مجلس شوریٰ منعقدہ ۱۲ تا ۱۵ جنوری ۵۷ء کی روداد اور فیصلے شائع کیے ہیں لیکن پیراگراف نمبر ۵ میں جماعت کی آئندہ پالیسی کے بارے میں شوریٰ کا فیصلہ درج کرتے ہوئے آپ نے نہ صرف اس کی کوئی تصریح نہیں فرمائی کہ یہ فیصلہ متفقہ طور پر ہوا ہے یا ارکانِ شوریٰ کی اکثریت کی رائے سے، بلکہ آپ نے میرے اختلافی نوٹ کا سرے سے کوئی تذکرہ ہی نہیں کیا ہے جو میری رائے میں قابل اعتراض بات ہے۔

کسی مجلس میں فیصلہ کے دو ہی طریقے ہوتے ہیں، یا متفقہ طور پر یا کثرتِ رائے سے۔ پہلی صورت میں تو کسی وضاحت کی ضرورت ہی نہیں لیکن دوسری صورت میں اس بات کی صراحت ضروری ہے کہ فیصلہ اکثریت کا ہے نہ کہ پوری مجلس کا......آراء کا شمار یا اختالف کرنے والوں کے بارے میں تفصیل بیان کرنا بے شک ضروری نہیں مگر جہاں رائے شماری کی نوبت آنے سے پہلے ہی کسی رکن کی طرف سے تحریری طور پر اختلافی نوٹ پیش کر دیا گیا ہو، وہاں یہ لازمی ہے کہ فیصلہ کے ساتھ ساتھ اختلاف کرنے والے کے وجوہ دلائل بھی سامنے رکھے جائیں تا کہ اختلافی نقطۂ نظر پر بھی لوگ غور کر سکیں۔

اختلافی نوت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اراس کو محض کارروائی کے رجسٹر میں بند کر دیا جائے اور محض یک طرفہ رائے لوگوں کے علم میں لائی جائے۔

خصوصیت کے ساتھ اس نوٹ کی اشاعت اس لیے اور بھی ضروری تھی کہ اس میں اختلاف کرنے والے نے آنے والے اجتماعِ ارکان سے متعلق مجوزہ کارروائی ہی سے اختلاف کیا ہے اور اس بات پر متنبہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ جس طرز پر اجتماعِ ارکان کی کارروائی ہونے جا رہی ہے اس سے جماعت کو بڑے نقصان کا اندیشہ ہے۔ اب اگر ارکانِ جماعت اس خطرہ سے بروقت آگاہ نہیں کئے جاتے پھر اس تنبیہ کا موقع کب باقی رہے گا ----- اگر آپ کا ارادہ میرے اختلافی نوٹ کو سرے سے شائع کرنے ہی کا نہیں ہے یا آپ اس کو اجتماع ارکان کے بعد یا عین اس وقت پر پیش کرنا چاہتے ہیں تو مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ میری رائے یہی ہے کہ میرا یہ اختلافی نوٹ اجتماع سے پہلے پہلے ارکان جماعت کے علم میں لایا جانا چاہیے، اس لیے میں اس مسئلہ پر آپ کی فوری توجہ مبذول کرا رہا ہوں۔''

والسلام

احقر سلطان احمد

لیکن یہ احتجاج بھی صدا بصحرا ثابت ہوا -----!

استعفے کی واپسی ....شوریٰ کی قرارداد کے جواب میں مولانا مودودی صاحب نے جو خط شوریٰ کو لکھا اس کا متن حسب ذیل ہے۔ (ماخوذ از روزنامہ ''نوائے وقت'' اشاعت ۱۴ ار جنوری ۵۷)

''آپ کی قرارداد اور ارکان و متفقین جماعت کی عام خواہشات کا احترام کرتے ہوئے میں عارضی طور پر اپنا استعفاء کُل پاکستان اجتماع ارکان کے انعقاد تک کے لیے واپس لیتا ہوں۔ میں انشاء اللہ اجتماع کے موقع پر تمام رفقاء کے سامنے اپنی وہ مشکلات رکھ دوں گا جن کی بنا پر میں اپنے آپ کو فرائض امارت کی انجام دہی کے قابل نہیں پاتا ہوں اور وہ مصالح اور ضروریات بھی بیان کر دوں گا، جن کے لحاظ سے میرا اس منصب پر رہنا مناسب نہیں ہے۔ ان سارے پہلوؤں کی وضاحت ہو جانے کے بعد ارکانِ جماعت جو رائے بھی قائم کریں گے وہ انشاء اللہ میری انفرادی رائے سے معتبر ہوگی۔ چونکہ مجھے دستورِ جماعت کی رو سے ایسی حالت میں اپنا قائم مقام مقرر کرنے کا حق ہے جبکہ میں فرائض امارت انجام نہ دے سکوں اس

لیے میں چودھری غلام محمد صاحب کو قائم مقام امیر مقرر کرتا ہوں''۔

اس طرح وہ استعفاء جو اس ''وضاحت'' کے ساتھ دیا گیا تھا کہ ''یہ بات واضح کیے دیتا ہوں کہ یہ استعفاء واپس لینے کے لیے پیش نہیں کیا جا رہا......'' تین دن کے اندر اندر واپس ہو گیا ---اگرچہ واپسی اس احتیاط کے ساتھ ہوئی کہ استعفے کی سیف قاطع جس نے سرکش شوریٰ کو 'اطاعت وتعاون' پر مجبور کیا تھا ارکانِ جماعت کے اجتماع عام کے سر پر بھی لٹکتی رہے!

مولانا امین احسن اصلاحی کا استعفیٰ از رکنیت جماعت .... مرکزِ جماعت اسلامی میں پیش آنے والے ان تمام ڈرامائی واقعات کی خبریں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اپنی رہائش گاہ پر مقیم ایسی بے بسی کے ساتھ سنتے رہے جیسے وہ وہاں 'نظر بند' ہوں۔

روداد چمن اس طرح سے سنتا ہوں قفس میں
جیسے کبھی آنکھوں سے گلستان نہیں دیکھا!

اور اسی بے چارگی اور دل شکستگی کے عالم میں انہوں نے جماعت اسلامی کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔(۱)

---

(۱) مولانا کے اپنے الفاظ میں:-

''شوریٰ کا یہ اجلاس ایک بالکل ہنگامی اجلاس تھا۔ یہ شوریٰ صرف امیر جماعت کے استعفیٰ سے پیدا شدہ صورت حال پر غور کرنے کے لیے پر غور کرنے کے لیے فوری طور پر بلائی گئی تھی، اس لیے کوئی ایجنڈا نہ تھا۔ اس کے بعض ارکان' کے ساتھ یہ معاملہ بھی پیش آیا کہ ادھر مرکز سے ان کو شوریٰ کی شرکت کے دعوت نامے ملے لیکن جب وہ گھروں سے روانہ ہونے لگے تو ادھر حلقہ سے ان کو یہ اطلاع ملی کہ وہ جماعت کی رکنیت سے معطل کر دیئے گئے۔ یہ شوریٰ جماعت کی پالیسی وغیرہ کے مسائل پر کوئی فیصلہ دینے کی مجاز نہ تھی۔ لیکن اس نے صرف امیر جماعت پر اظہارِ اعتماد ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ امیر جماعت کو خوش کرنے کے لیے اس نے پالیسی کے معاملہ میں بھی مداخلت کی۔ مجھے اس شوریٰ میں شرکت کی دعوت نہیں دی گئی تھی۔ اس وجہ سے میرے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ میں اس کے اندر جا کر اس کی خلاف دستور کارروائیوں پر ٹوک سکتا لیکن میں نے اس کے دورانِ انعقاد ہی میں اس کے سامنے جماعت کی رکنیت سے اپنا استعفاء پیش کر دیا، کیونکہ میں امیر جماعت پر اس کے غیر مشروط اظہارِ اعتماد کو ان تمام اقدامات کی تصدیق کے ہم معنی سمجھتا ہوں جو امیر جماعت نے جائزہ کمیٹی کے ارکان اور شوریٰ کے متفقہ فیصلہ کے خلاف کیے تھے!

اتفاق کی کیفیت پھر کبھی پیدا نہ ہو سکی۔

جن لوگوں کو مولانا اصلاحی صاحب کی شخصیت کے قریبی مطالعے کا موقع نہیں ملا ہے ان کے لیے یہ بات واقعتاً بالکل نا قابل فہم ہے کہ مولانا مودودی کے بارے میں وہ انتہائی رائے قائم کر چکنے کے بعد جو مولانا اصلاحی صاحب کے خط سے ظاہر ہوتی ہے----اور اب مولانا کے اس رویے کا بچشم سر مشاہدہ کر لینے کے بعد کہ وہ ہر فیصلہ اپنی 'شخصیت' کی 'برہانِ قاطع' کے بل پر کرنے پر تُل گئے ہیں----- وہ آخر کس امید میں مصالحت کنندگان کے ساتھ تعاون کرتے رہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا کی طبیعت کی ظاہری سختی اور مزاج کی ظاہری درشتی کے پردوں میں ایک انہائی صلح جو اور آخری حد تک آمادۂ مصالحت شخصیت چھپی ہوئی ہے اور وہ کسی کام کو شروع کر لینے کے بعد اس کو جاری رکھنے کے لیے آخری حد تک مصالحت (Compromise) کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ چاہے اس سے ان کی ذات کتنی ہی مجروح ہو اور ان کی پوزیشن کتنی ہی خراب ہو جائے-----!

یہی وجہ ہے کہ مولانا اس وقت تک مصالحانہ مساعی کے ساتھ تعاون کرتے رہے جب تک خود مصالحت کنندگان تھک ہار کر نہ بیٹھ رہے اور اسی بنا پر ان کے بعد کے رویے میں 'منطقی ربط' نظر نہیں آتا اور مستقبل کے مؤرخ کے لیے یہ حق باقی رہ جاتا ہے کہ چاہے تو ان کے طرز عمل کو انتہائی دردمندانہ اور مخلصانہ صلح جوئی کا نتیجہ قرار دے اور چاہے تو کمزوری پر محمول کر لے۔

مولانا اصلاحی صاحب نے اپنے استعفے کی واپسی کی توجیہہ یہ بیان فرمائی ہے:

''میرے استعفیٰ کے بعد چودھری غلام محمد صاحب (جو قائم مقام امیر جماعت بنائے گئے تھے محمد باقر خاں صاحب کے ساتھ مجھ سے ملے اور یہ اطمینان دلایا کہ امیر جماعت پر اظہار اعتماد ہرگز ان کے ان اقدامات کی توثیق کے ہم معنی نہیں ہے جو انہوں نے شوریٰ کے فیصلہ اور جائزہ کمیٹی کے ارکان کے خلاف کئے ہیں انہوں نے صاف الفاظ میں یہ بھی کہا کہ جائزہ کمیٹی کے ارکان کے خلاف امیر جماعت

نے جو اقدام کیا ہے وہ اس کو نہ صرف واپس لیں گے بلکہ ان سے معافی بھی مانگیں گے انہوں نے یہ بھی وضاحت کی کہ جائزہ کمیٹی کی رپورٹ قائم ہے، دسمبر کی شوریٰ کی قرارداد بھی قائم ہے، البتہ اجتماع عام کے انعقاد تک لوگوں کو پالیسی کے معاملہ میں کوئی بحث ونزاع برپا کرنے سے روک دیا گیا ہے۔انہوں نے یہ باتیں اس قدر گہرے تاثر اوراس قدر وثوق واعتماد کے ساتھ کہیں کہ مجھے اپنا استعفاء واپس لے لینا پڑا''۔

یہاں فوری طور پر جو سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ----کیا مولانا اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ 'جماعت اسلامی' میں اصل مؤثر اور فیصلہ کن شخصیت مولانا مودودی کی تھی؟ -----ذہن اسے قبول نہیں کرتا۔اس لیے کہ جماعت کی مخصوص تنظیم ہیئت میں جو مقام مولانا مودودی کو حاصل تھا اس سے سب سے زیادہ واقف خود مولانا امین احسن اصلاحی صاحب تھے-----! تو پھر سوچنے کی بات تو یہ تھی کہ جس شخصیت نے اپنی مقبولیت کی دلیل کے آگے خود مولانا اصلاحی صاحب کو بے بس کر دیا تھا، اس کے سامنے اپنے پورے سوز اور سارے اخلاص کے باوجود یہ غریب یقین دلانے والے کیا حیثیت رکھتے تھے! -----چنانچہ مندرجہ بالا تصریحات کے معاً بعد جب مولانا اصلاحی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ:

''ان وعدوں میں سے یہ حضرات کسی ایک وعدے میں بھی سچے ثابت نہیں ہوئے''۔(۱)

تو محسوس ہوتا ہے کہ ایسا ہونا بالکل فطری تھا-----البتہ مولانا کا ان حضرات کی یقین دہانیوں کی بنیاد پر خیر کی امیدیں وابستہ کر لینا زیادہ سے زیادہ نیک خواہشات کی کارفرمائی قرار دیا جاسکتا ہے!!

حالات جو رخ اختیار کر چکے تھے-----اور جہاں تک پہنچ گئی تھی اس کے لحاظ سے اب مولانا اصلاحی صاحب اوران کے ہم خیال ارکانِ شوریٰ اور دیگر اصحاب رائے کے لیے

---

(۱) یہ تمام اقتباسات مولانا اصلاحی صاحب کے اس سائیکلوسٹائل شدہ وضاحتی خط سے ماخوذ ہیں جو انہوں نے جماعت سے مستعفی ہونے کے لوگوں کے استفسارات کے جواب میں تحریر فرمایا تھا!

دو ہی راہیں عقلاً صحیح تھیں۔

ایک یہ کہ-----اگر ان کے نزدیک مولانا مودودی کی ذات سے قطع نظر---- اب بھی مجموعی اعتبار سے جماعت اسلامی میں شَر پر خیر غالب تھا تو وہ خاموشی سے جماعت سے علیحدہ ہو جاتے اور وہ طرزِ عمل اختیار کرتے جو اس سے قبل مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی اور ان کے رفقاء نے اختیار کیا تھا-----اور جو اس موقع پر بھی مولانا عبد الجبار غازی صاحب نے اختیار کیا۔ اس صورت میں آئندہ کے لیے صحیح لائحہ عمل یہ ہوتا کہ 'اقامت دین' کی ہمہ گیر جدو جہد کی طرف سے صبر کا گھونٹ پی کر دین کی کسی 'جزوی خدمت' میں اپنے آپ کو کھپا دیا جاتا-----اور جماعت کو فی الحال اس کے حال پر چھوڑ دیا جاتا۔ اس لیے کہ اس صورت میں جماعت سے علیحدہ ہو کر بھی اس پر تنقید کرنے کا حق انہیں نہ ہوتا اور جماعت کے عام ارکان کی یہ حجت ان پر قائم ہو جاتی کہ آپ حضرات نے جماعت کے اندر اپنے اختلافِ رائے کا اظہار کیوں نہ کیا-----! (الّا یہ کہ بعد میں کسی مرحلے پر یہ محسوس کیا جاتا کہ جماعت کسی صریح دینی فتنے میں مبتلا ہو گئی ہے اور اس کا 'ابطال' ایک 'دینی فریضہ' بن گیا ہے!)

دوسری یہ کہ-----اگر ان کی رائے میں مولانا مودودی کی غلط رہنمائی اور ان کے غلط اقدامات کی بنا پر جماعت میں خیر پر شَر غالب آ چکا تھا یا آنا لازمی تھا-----تو پھر ایک ہی طرز عمل صحیح تھا' اور وہ یہ کہ جماعت میں کھل کر اختلاف رائے کا اظہار کیا جاتا اور ڈٹ کر مولانا مودودی کی مخالفت اور ان کے غلط اقدامات کی مذمت کی جاتی۔ متذکرہ بالا رائے قائم ہو جانے کے بعد نہ صرف یہ کہ عقلاً صرف یہی طرز عمل صحیح تھا بلکہ جماعت کا دستور اور وہ 'جمہوریت' اور 'شورائیت' بھی اسی کے متقاضی تھے جن کے پودوں کو خود مولانا اصلاحی صاحب نے اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا-----اور جماعت کے عام ارکان کے 'حق نصح' کی ادائیگی کی واحد صورت بھی یہی تھی-----اس طرز عمل سے بدترین نتیجہ جو نکل سکتا تھا وہ یہ کہ جماعت بالکل منتشر ہو جاتی تو ایک ایسی جمعیت کا منتشر ہو جانا جس میں شر غالب آ چکا ہو' بجائے خود ایک خیر ہے!-----ایک بعید امکان اس کا تھا کہ مولانا مودودی متہم

(DISCREDIT) ہو جاتے اور جماعت کی رہنمائی کی ذمہ داری کسی اور کو سنبھالنا پڑتی تو یہ جماعتی زندگی کے لوازم میں سے ہے اور اس سے پہلو بچانا کسی کے لیے جائز نہیں!

-----ایک امکان یہ تھا کہ جماعت تقسیم ہو جاتی تو اس میں بھی کوئی حرج نہ تھا۔ ہر حصہ اپنے اپنے نظریات کے مطابق 'اقامت دین' کی ہمہ گیر جدو جہد میں مشغول ہو جاتا۔ بدرجۂ آخر یہ کہ اہل اختلاف دلیل کر کے نکال دیئے جاتے تو اس صورت میں بھی کم از کم یہ تو ہو جاتا کہ ان کی جانب سے پوری جماعت پر اتمامِ حجت ہو جاتا۔ اور جماعت سے علیحدہ ہونے کے بعد بھی انہیں اس کی پالیسی پر تنقید کا حق بجا طور پر حاصل رہتا۔

بدقسمتی سے عملاً جو کچھ ہوا وہ یہ کہ مولانا اصلاحی صاحب اور ان کے ہم خیال ارکانِ شوریٰ نے نہ پہلی راہ اختیار کی نہ دوسری! ----- بلکہ کچھ مخلص مصالحت کنندگان کے زیر اثر یہ حضرات ایک ایسی ''نیمے دروں نیمے بروں'' پالیسی پر عمل پیرا ہو گئے جس سے عام اراکنِ جماعت پر 'اتمامِ حجت' تو کیا ہوتا ان کا 'حق نصح' بھی ادا نہ ہو سکا۔ بلکہ ان حضرات کی اپنی پوزیشن اکثر ارکانِ جماعت کے لیے نا قابل فہم -----اور بعض حالات میں مضحکہ خیز تک ہوتی چلی گئی -----!! رہے وہ 'مصالح' جن کے پیش نظر یہ 'درمیانی راہ' اختیار کی گئی تھی تو ان کی پوری فصل مولانا مودودی نے کاٹ لی -----!!!

مصالحت .... اس مرتبہ مصالحت کنندگان میں سرفہرست اگرچہ چودھری غلام محمد صاحب (قائم مقام امیر جماعت) اور جناب محمد باقر خاں صاحب مرحوم تھے اور ابتداءً شیخ سلطان احمد صاحب نے بھی مصالحانہ کوششوں میں حصہ لیا۔ لیکن اس سلسلے میں فیصلہ کن مساعی تحریک مسلم لیگ کے ایک پرانے سرگرم کارکن جناب ظفر احمد انصاری صاحب کی ثابت ہوئیں جنہوں نے گفت وشنید اور مذاکرات (Negotiations) کے خداداد ملکہ سے کام لے کر مولانا اصلاحی صاحب کو چند ایسے وعدوں (Commitments) کا پابند کر لیا جو مولانا کی ذاتی شرافت اور مروّت کی بنا پر آئندہ کے لیے ان کے پاؤں کی بیڑیاں بن گئے!

مصالحت کے فلسفے کا بنیادی پتھر یہ تھا کہ ----- جماعت اسلامی کے عام ارکان کی

تربیت اس طرز پر نہیں ہوئی ہے کہ وہ پالیسی اور طریق کار کی دقیق بحثوں میں سکون، اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ حصہ لے سکیں اور اپنے اکابر کے باہمی اختلا (قطع نظر اس سے کہ وہ نجی نوعیت کے ہوں یا جماعت کی پالیسی سے متعلق) پر ٹھنڈے دل سے غور کر سکیں، لہٰذا اگر کبھی ایسی صورت حال پیدا ہوگی کہ مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی متبادل پروگرام لے کر ایک دوسرے کے بالمقابل جماعت کے عام ارکان کے سامنے پیش ہوئے تو اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہ نکلے گا کہ جماعت بالکل منتشر ہو جائے گی اور اقامت دین کے لیے کی گئی ساری محنت اکارت ہو کر رہ جائے گی -----! مولانا مودودی کے انتہائی اقدامات (ارکانِ جائزہ کمیٹی پر الزامات اور پھر استعفیٰ از امارتِ جماعت وغیرہ) کے بارے میں غالباً یہ رائے قائم کی گئی کہ یہ سب کچھ محض جذبات میں ہو گیا ہے اور بالکل غلط ہے۔ تاہم جماعت کی مصلحت اسی میں ہے کہ مولانا مودودی کو زیادہ متہم (Discredit) نہ کیا جائے۔ جماعت کے عام حالات کی اصلاح اور اس کے آئندہ رخ کی تبدیلی کے بارے میں غالباً یہ طے ہوا کہ مصلحت اسی میں ہے کہ یہ سب کچھ خاموشی کے ساتھ اور رفتہ رفتہ ہو[1] اور سر دست صرف اس پر اکتفا کیا جائے کہ ایک تو اس ہنگامی دور کے انتہائی اقدامات کو کالعدم قرار دیا جائے اور دوسرے جماعت کی آئندہ پالیسی کے بارے میں ارکانِ جماعت کے سامنے اس مرتبہ پھر شوریٰ کی جانب سے ایک متفقہ قرارداد پیش کی جائے۔

چنانچہ جن ارکان کی رکنیت معطل کی گئی تھی وہ بحال کر دی گئی (جنا عبدالجبار غازی صاحب اور سعید ملک صاحب چونکہ از خود مستعفی ہوئے تھے لہٰذا ان کا معاملہ جدا تھا) اور ماچھی گوٹھ کے اجتماع ارکان سے متصلاً قبل اسی مقام پر مرکزی شوریٰ کا ایک اجلاس اس

(ا): غالباً مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کو ابھی اس کا اندازہ نہیں ہوا تھا کہ مولانا مودودی جماعت میں اپنی مقبولیت کے نشے میں ''جمہوریت'' اور ''شورائیت'' کی اس برائے نام بساط کو بھی بالکل لپیٹ دیں گے جو ابھی کم از کم جماعت کے دستور میں قائم تھی ...... اور 'مجلس عاملہ' کا ایک نیا ادارہ (Institution) قائم کر کے مجلس شوریٰ کو ایک بالکل غیر مؤثر اور محض علامتی ادارہ بنا دیں گے----- اور اصلاحی صاحب اور ان کے ہم خیال اراکین شوریٰ مع جمیع مصالحت کنندگان ایک انتہائی غیر مؤثر اقلیت بن کر رہ جائیں گے-----!!

غرض سے طلب کرلیا گیا کہ اس میں جماعت کی آئندہ پالیسی سے متعلق کوئی ایسا مصالحتی فارمولا تیار (EVOLVE) کرلیا جائے جسے عام ارکان جماعت کے سامنے شوریٰ کی جانب سے ایک متفقہ قرارداد کی صورت میں پیش کر دیا جائے۔

راقم الحروف کا موقف ....راقم الحروف تک جب یہ اطلاع پہنچی کہ جماعت کے 'اوپر کے حلقے' میں پھر 'مصالحت' کی کوششیں ہورہی ہیں اوراس امر کا امکان ہے کہ ارکانِ جماعت' مال اور وقت کا صرفِ کثیر کر کے ماچھی گوٹھ کے مقام پر جمع تو اس خیال سے ہوں کہ پالیسی اورطریق کار کے بارے میں مختلف نقطہ ہائے نظر تفصیل کے ساتھ ان کے سامنے آئیں گےاور وہ اپنے آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں خودسوچ سمجھ کر فیصلہ کریں گے -----لیکن ہو یہ کہ پھر شوریٰ کی ایک ''متفقہ مصالحتی قرارداد'' ان کے سامنے پیش کر دی جائے ----- اور وہ جیسے جائیں ویسے ہی لوٹ آئیں ----- تو راقم الحروف نے جماعت اسلامی منٹگمری کے پانچ دوسرے ارکان کی معیت میں ایک متفقہ تحریر قائم مقام امیر جماعت کی خدمت میں ارسال کی ----- جو درج ذیل ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترمی ومکرمی ----- قائم مقام امیر جماعت اسلامی پاکستان

اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

''ہم اراکین جماعت اسلامی منٹگمری آپ کی وساطت سے مندرجہ ذیل امور مرکزی مجلس شوریٰ کے اس اجلاس میں پیش کرنا چاہتے ہیں جو اجتماع ارکان سے قبل منعقد ہورہا ہے۔امید ہے کہ آپ اس تحریر کو اس اجلاس میں پڑھ کر سنا دیں گے۔

ا۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اس امر کی کوشش کی جارہی ہے کہ بجائے اس کے کہ آئندہ اجتماع ارکان میں پالیسی کے متعلق تمام آراء من وعن پیش ہوں اور ایک کھلی بحث کے بعد پالیسی کا تعین کیا جائے اس سے قبل شوریٰ ہی میں پالیسی کے بارے میں ارباب حل وعقد کے درمیان کوئی سمجھوتہ ہو جائے اور ارکانِ جماعت کے سامنے اسی طرح کی کوئی متفقہ قرارداد پیش کی جائے جیسی کہ شوریٰ نومبر دسمبر ۵۶ء میں منظور ہوئی تھی' اور تمام اراکین شوریٰ بجائے اپنی اپنی آراء کو پیش کرنے کے

اجتماعِ ارکان میں اس قرارداد کی حمایت کریں۔ نیز یہ کہ اس سمجھوتہ کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ یہ محسوس کیا جارہا ہے کہ اگر پالیسی کی بحثیں اور اکابرین جماعت کے آپس کے اختلافات اجتماع ارکان میں لے آئے گئے تو پھر اس جماعت کے باقی رہنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

۲۔ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اسی کوئی بھی کوشش خواہ وقتی طور پر کتنی ہی خوشنما اور مفید معلوم ہو، جماعت اسلامی کے وجود اور استحکام کے لیے بالآخر سخت مضر اور مہلک ثابت ہوگی۔ لہٰذا ہم شوریٰ سے درخواست کرتے ہیں کہ ایسی کسی تجویز کو زیر عمل لانے سے قبل وہ اس کے بظاہر مفید پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ان مضر نتائج پر بھی غور کرلے کہ جو ہماری ناچیز رائے میں جلد یا بدیر لازماً رونما ہوں گے۔

۳۔ یہ بات اب ایک ناقابل تردید حقیقت بن چکی ہے کہ جماعت اسلامی کے سوچنے سمجھنے والے لوگوں میں پالیسی کے بارے میں دو نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں اور ان کے حامل گروہ اپنے اپنے طرز فکر میں پختہ ور اپنی آراء میں شدید ہیں۔ ایک گروہ (جس کے ہاتھ میں اس وقت جماعت کی قیادت ہے) موجودہ پالیسی کو اس کے اصولی موقف کے اعتبار ہی سے نہیں بلکہ تفصیلی فروعی تدابیر کے لحاظ سے بھی بالکل صحیح سمجھتا ہے اور اس میں کسی اصولی تغیر کو صحیح نہیں سمجھتا جبکہ دوسرا گروہ بعد از تقسیم ملک کی پالیسی کو قبل از تقسیم کی پالیسی کے لحاظ اصولی انحراف سمجھتا ہے اور موجودہ پالیسی میں بنیادی تغیر چاہتا ہے۔ یہ دونوں گروہ پالیسی کے بارے میں اپنی اصولی آراء ہی کی حد تک نہیں بلکہ اپنے ذوق اور رجحان کے اعتبار سے بھی ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں۔

ان گروہوں کے درمیان جماعت میں ایک عرصہ سے کشمکش چلی آتی ہے۔ ابھی تک یہ کشمکش صرف اصحابِ شوریٰ تک محدود تھی اور عام اراکین کو اس کا علم تک نہ تھا لیکن اب اکثر باتیں اس محدود حلقہ سے نکل کر ایک وسیع دائرے میں پھیل گئی ہیں اور عام اراکین کی ایک بہت بڑی تعداد ان سے باخبر ہوگئی ہے۔

۵۶ء میں ان دو گروہوں کے درمیان مفاہمت اور مصالحت کی جو کوشش کی گئی تھی اور اس کے نتیجہ میں جو مصالحتی فارمولا اراکین جماعت کے سامنے رکھا گیا تھا۔ اس کا جو حشر ہوا ہے، اس سے دو باتیں اخذ کی جانی ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ ان

دو گروہوں کے درمیان مصالحت اور سمجھوتہ کی کوشش لا حاصل ہے۔ یہ اپنے نقطہ ہائے نظر، اپنے طرز ہائے فکر اور اپنے مذاق و رجحان کے اعتبار سے ایک دوسرے سے اتنے دُور ہو چکے ہیں کہ ان کو نزدیک لانے کی کوشش ایک مبارک خواہش تو کہی جا سکتی ہے لیکن عملاً بار آور نہیں ہو سکتی اور دوسرے یہ کہ آج سے قبل شوریٰ کی کلھیا میں جو گُڑ پھوڑا جاتا رہا ہے وہ اب چوراہے میں بکھر گیا ہے۔ اور اب وہ کیفیت باقی نہیں رہی کہ باتیں صرف اراکین شوریٰ تک محدود تھیں، جماعت کے دست و بازو یعنی ارکان اس سے واقف نہ تھے۔ اب یہ باتیں پھیل چکی ہیں۔ اب اگر ''بڑے آدمی'' مل کر بیٹھ بھی جائیں تو ''چھوٹوں'' کا خلجان رفع ہونا مشکل ہے۔

۴۔ ان حالات میں ہمارے نزدیک جماعت کی بقا اور اس کے استحکام اور اس کے عملاً کوئی کام کر سکنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ آئندہ اجتماعِ ارکان میں ہر شخص کھلے دل کے ساتھ جو کچھ دل و دماغ میں رکھتا ہے، ارکان کے سامنے رکھ دے اور ایک عام اور کھلی (OPEN HEARTED) بحث کے بعد طے ہو جائے کہ جماعت اسلامی کے ارکان اپنے مستقبل کے لیے کون سی پالیسی کو پسند کرتے ہیں۔ اس کے بعد جو کو اس پالیسی پر انشراح صدر ہو جائے وہ جماعت میں رہے اور جو انقباض محسوس کریں ان کی طرف سے جماعت کی خیر خواہی کا پہلو اسی میں ہے کہ وہ خاموشی کے ساتھ جماعت کو چھوڑ جائیں اور اپنے ذوق اور نظریات کے مطابق جو کام بھی کر سکتے ہوں علیحدہ ہو کر کرتے رہیں۔ اس صورت میں خواہ وقتی طور پر جماعت کو ایک نقصان برداشت کرنا پڑے اور ایسا محسوس کیا جائے کہ جماعت کو ایک بڑا دھکا لگا ہے لیکن بالآخر یہ محسوس کیا جائے گا کہ اسی میں جماعت کی بھلائی تھی۔ اس طرح جماعت کو ایک مرتبہ پھر یکسوئی، یکرنگی اور یکجہتی حاصل ہو جائے گی اور وہ سکون کے ساتھ ایک طرف جا سکے گی۔

۵۔ اس کے برعکس اگر اس وقت ''انتشار کے خوف'' سے ایک مصالحت کر بھی لی گئی تو اول تو اس بات ہی کا قوی اندیشہ ہے کہ پہلی مصالحت کی طرح یہ بھی زیادہ سے زیادہ پندرہ دن کی ''طویل'' عمر پا سکے لیکن اگر اس مرتبہ جماعت کے اکابرین نے ذرا زیادہ بڑے ظرف کا ثبوت دیا۔ تب بھی یہ تو یقینی ہے کہ جماعت زیادہ دُور نہ چل پائے گی کہ یہ کشمکش پھر پیدا ہو کر رہے گی اور جماعت اپنی اندرونی کشمکش میں

اس طرح الجھ کر رہ جائے گی کہ اور کوئی مفید کام اس کے لیے ممکن نہ رہے گا۔ یہ تو ممکن ہے کہ یہ کشمکش ''خفی'' رہے اور پہلے کی طرح ''جلی'' نہ ہو۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ ختم ہو جائے۔

۶۔ اس وقت کی ''مصالحت'' کے بارے میں تین باتیں بالکل واضح ہیں۔

(الف)...... یہ کہ اس کی بنیاد کسی مثبت جذبے کی بجائے ایک ''منفی خدشہ'' پر ہے اس وقت محض انتشار کے خطرے سے بچنے کی غرض سے یہ کوشش کی جا رہی ہے۔ بجائے اس کے کہ گفت وشنید اور بحث ومباحثہ کے بعد ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کے قریب آنے کی وجہ سے مفاہمت ہو رہی ہو اور اب فریقین اپنے اپنے مقام سے واقعتاً ہٹ کر ایک جگہ آ کھڑے ہوئے ہوں ---- صورت حال یہ ہے کہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر ہیں۔ (بلکہ حالیہ واقعات نے تلخی میں اضافہ کر دیا ہے) لیکن انتشار کے خوف سے دبک کر بیٹھ رہے ہیں۔ اس طرح ''حب علیؓ'' کی بجائے ''بغض معاویہؓ'' پر جو اتحاد قائم ہو ظاہر ہے کہ اس کی بنیاد بے حد کمزور ہوگی۔

(ب)......مولانا مودودی صاحب اور ان کے رفقاء کے ارادوں اور ان کی نیتوں کے بارے میں کوئی بات نہ کہی جا سکے تو بھی ''اختلاف'' رکھنے والے لوگوں کے بارے میں تو ہمیں یقین کے ساتھ یہ بات معلوم ہے کہ وہ اس موقع پر مصالحت اس لیے کر رہے ہیں کہ آئندہ کشمکش کا موقع باقی رہے۔ عین اس وقت جبکہ یہ حضرات مصالحت کی باتیں کر کے آئے ہوتے ہیں ان کی آراء دوسرے لوگوں کے بارے میں انتہائی سخت ہوتی ہیں اور اپنے طرز فکر کے لوگوں کے سامنے سخت ترین آراء کا اظہار کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے ----- اس لحاظ سے کم از کم ہم لوگوں کو تو یہ ایک ''منافقانہ مصالحت'' معلوم ہوتی ہے' جس کا چند روز سے زیادہ چل جانا مشکل اور کسی مفید نتیجہ تک پہنچنا ناممکن ہے۔

(ج)......مولانا مودودی صاحب اور ان کے رفقاء یہ محسوس کر رہے ہیں کہ خیریت اسی میں ہے کہ کسی نہ کسی طرح یہ اجتماع گزر جائے۔ اس وقت ان کے لیے اپنے نقطۂ نظر کو پیش کر کے اور اپنی بات پر اصرار کر کے اجتماع میں کامیابی مشکل نظر آ رہی ہے۔ کہاں تو وہ کیفیت تھی کہ اپنے وجوہِ استعفاء انہوں نے اجلاسِ شوریٰ میں بیان کرنے کی بجائے اجتماع ارکان میں رکھنے مناسب سمجھے تھے اور ۳۲ء سے

آج تک مختلف اوقات و ادوار میں اپنی اختیار کردہ پالیسی کو ایک طویل تقریر میں پیش کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا۔ کہاں اب یہ باتیں سننے میں آ رہی ہیں کہ وہ ایسی کوئی تقریر بھی نہیں کریں گے اور اپنے استعفاء کے وجوہ بھی سامنے نہیں لائیں گے۔

۷۔ ان حالات میں شوریٰ سے ہماری درخواست یہ ہے کہ اب مصالحت اور مفاہمت کی کسی نئی کوشش میں وقت ضائع نہ کیا جائے اور اس سے قبل کی ایسی ہی کوشش اور اس کے انجام سے عبرت حاصل کر کے آئندہ اجتماعِ ارکان کی نوعیت وہی رکھی جائے جو اس کا اعلان کرتے ہوئے پیش نظر تھی ----- یعنی یہ کہ مولانا مودودی صاحب جو اس تحریک کے داعی، مؤسس اور از یوم تاسیس تا امروز قائد اور امیر رہے ہیں، وہ تفصیل کے ساتھ اور بغیر کسی (MENTAL RESERVATION) کے اپنا ذہن جماعت کے ارکان کے سامنے رکھ دیں اور ماضی کی پالیسی کی وضاحت کے ساتھ ساتھ صاف صاف بتا دیں کہ آئندہ وہ جماعت کو کس رُخ پر لے کر جانا چاہتے ہیں اس کے بعد تمام ارکانِ جماعت عام اس سے کہ وہ عام رکن ہو یا رکن شوریٰ اگر اس سے کوئی فروعی یا اصولی اختلاف رکھتے ہوں تو اسے واضح کرے ایک کھلی بحث کے بعد طے ہو جائے کہ آئندہ پالیسی کیا ہوگی اور اس کے بعد جو لوگ اس پالیسی سے مطمئن نہ ہوں وہ جماعت سے علیحدہ ہو جائیں اور اپنے نظریات کے مطابق جو کام کر سکتے ہوں کریں اور جماعت یکسوئی کے ساتھ اپنی طے کردہ پالیسی پر عمل پیرا ہو سکے۔

ہماری ناچیز رائے میں اسی میں جماعت کی بھلائی مضمر ہے۔!!!

خطرہ بیان کیا جا رہا ہے کہ اس طرح جماعت منتشر ہو جائے گی۔ ہم عرض کرتے ہیں کہ اگر یہ جماعت ایسی ہی کچھی بنیادوں پر قائم ہے کہ ایک مرتبہ کی (OPEN DISCUSSION) ہی سے ختم ہو جائے گی تو آپ کس چیز کے بھروسے پر اسے آگے لیے جا رہے ہیں؟ جو جماعت اندرونی اختلاف کا ایک حادثہ برداشت نہ کر سکے وہ آخر آگے کیا کام کر سکے گی-----؟ دوسرے یہ کہ اگر واقعتاً گند اس قدر زیادہ ہے کہ اس کے سامنے آتے ہی یہ جماعت نسیاً منسیاً ہو جائے گی تو پھر آخر آپ اس کو چھپا کر کب تک رکھ سکیں گے؟

۸۔ اگر یہ چیز منظور نہ ہو اور یہ چیز متفق علیہ ہو کہ اس طرح جماعت ختم ہو جائے گی تو پھر ہماری گزارش شوریٰ کے اختلاف کرنے والے گروہ سے یہ ہے کہ وہ لوگ جماعت کے اتنے ہی خواہ ہیں تو پھر ان کو چاہیے کہ وہ خاموشی کے ساتھ جماعت سے علیحدہ ہو جائیں ایک ایسی جماعت کو کہ جو ابھی منزل مقصود سے بہت دُور ہے اور جسے اپنا مقصود حاصل کرنے کے لیے ابھی ایک طویل اور SOLID جدوجہد کرنی ہے، آپس کی کشمکش میں مبتلا کئے رکھنے کو اس کی خیر خواہی سمجھنا حماقت نہیں تو غلط فہمی ضرور ہے۔ اگر وہ اس پر بضد ہیں کہ جماعت میں رہنا بھی ہے اور اسے اپنے نظریات پر موڑنا بھی ہے تو یہ موقع موجود ہے۔ دیانت داری کے ساتھ اپنی بات ارکان کے سامنے رکھ دیں، اگر جماعت ان کی بات مان لے تو فبہا ورنہ پھر سیدھے سیدھے جماعت کو دوسری طرف جانے دیں اور مزید روڑے نہ اٹکائیں۔ نہ اس جماعت کی چلتی گاڑی کو بریک لگا کر کھڑا رکھ چھوڑیں اور اگر وہ اس میں جماعت کی تباہی دیکھتے ہیں اور یہ انہیں ناپسند ہے تو پھر ایک ہی راہ ہے کہ خاموشی سے علیحدہ ہو جائیں۔

۹۔ اور گر نہ شوریٰ ہماری بات مانے ----- نہ اختلاف کرنے والے حضرات کو ہماری بات سے اتفاق ہو تو پھر ہم اپنے بارے میں دو شکلیں تجویز کرتے ہیں۔

(ا)...... یہ کہ کم از کم ہمیں اس بات کا پورا موقع دیا جائے کہ ہم اجتماع ارکان میں اپنے نقطۂ نظر کو ضاحت سے رکھ دیں۔ اس کام کے لیے جتنا وقت ہمیں درکار ہو، دیا جائے اور ہم پر کوئی روک ٹوک نہ کی جائے کہ یہ کہا جا سکتا ہے اور یہ نہیں! ----- تا کہ ہم پورے طور پر مطمئن ہو جائیں کہ ہم نے اپنی بات کہہ دی ہے۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ ہم ''منافقت'' کے ساتھ جماعت کے ساتھ چلنے کو اپنے اوپر بھی ظلم سمجھتے ہیں اس لیے کہ اس طرح آخرت میں اجر تو دُور رہا، عذاب کا خطرہ نظر آتا ہے۔ اور جماعت پر بھی ظلم سمجھتے ہیں کہ ہم اس کے مجموعی ذہن سے علیحدہ ایک ذہن رکھتے ہوں اور پھر بھی ساتھ چلیں اور عملاً اس کا حاصل یہ ہو کہ ----- نہ خود چلیں اور نہ دوسروں کو چلنے دیں۔

(ب)...... اور اگر یہ بھی قابل قبول نہ ہو تو ہمیں اجتماع سے قبل ہی مطلع کر دیا جائے۔ ہم اس کے لیے پورے انشراحِ صدر کے ساتھ تیار ہیں کہ خاموشی کے

ساتھ جماعت سے علیحدہ ہو جائیں اور نہ اپنی منزل کھوٹی کریں اور نہ جماعت کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑے ہوں۔ ہماری اس طرح کی علیحدگی بھی انشاءاللہ جماعت کے لیے نقصان کا موجب نہ ہوگی بلکہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس طرح ہم شاید جماعت کی کوئی نہ کوئی خدمت ہی سرانجام دے سکیں گے۔

مزید تشریح مناسب ہے کہ بصورتِ اول ہمیں کم از کم اتنا وقت درکار ہے کہ ہم اپنے اس متفقہ بیان کو جو ہم نے جائزہ کمیٹی کے سامنے پیش کیا تھا پڑھ کر اجتماعِ ارکان میں سنا دیں اور آئندہ کے بارے میں ایک قرارداد مرتب کر کے اسے وضاحت کے ساتھ پیش کر سکیں۔

ہم ۱۶/تاریک تک کسی اطلاع کے منتظر رہیں گے اور صرف پہلی شکل کی منظوری کی صورت میں اجتماع کے لیے حاضر ہوں گے۔ براہ کرم ہمیں ۱۶/فروری کو بارہ تا ۲ بجے دوپہر فون نمبر ۱۸۷ پر فیصلہ سے مطلع کر دیا جائے۔ تاکہ ہم اجتماع میں شریک ہونے' یا یہاں کے دوسرے ارکان کے ہاتھ اپنے استعفے بھجوانے کا فیصلہ کر سکیں۔ فقط والسلام!

ہم ہیں اراکین جماعت اسلامی منٹگمری

(چھ اراکین کے دستخط)

اس تحریر کے جواب میں ہمیں بذریعہ تار مطلع کیا گیا کہ اجتماعِ ارکان میں سب کو اظہارِ رائے کا پورا موقع دیا جائے گا!

———☆☆☆☆———

﴿وَلَا تَكُوۡنُوۡا كَالَّتِىۡ نَقَضَتۡ غَزۡلَهَا مِنۡۢ بَعۡدِ قُوَّةٍ اَنۡكَاثًا﴾

نقض غزل

حصہ دوم

یعنی

اجتماع ماچھی گوٹھ اور اس کے بعد

النحل:۹۲

اور اس عورت کے مانند نہ بن جاؤ جس نے مضبوطی
سے کاتا ہوا سوت ٹکڑے ٹکڑے کر دیا-----!

اجتماع ماچھی گوٹھ اور اس کے بعد

--------------(۱)--------------

ماچھی گوٹھ

ع آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے!

۵۳ء میں لاہور کے ایک مشہور صحافی (۱) نے جماعت اسلامی کے برے میں لکھا تھا۔

''کیا عجب کہ یہ تحریک بھی جو پٹھان کوٹ سے شروع ہوئی ہے، بالاکوٹ پر ختم ہو جائے''۔

راقم الحروف کو جو اُس وقت اسلامی جمعیت طلبہ کا رکن اور اس کے ایک پندرہ روزہ پرچے ''عزم'' کا مدیر تھا' اتفاق سے انھی دنوں بالاکوٹ کے سفر کا موقع ملا۔شہدا کی قبروں پر فاتحہ خوانہ کے وقت ذہن اچانک مندرجہ بالا خیال کے جانب منتقل ہوگیا۔اس کے جواب میں جو جذبات دل میں پیدا ہوئے وہ الفاظ کا جامہ پہن کر صفحۂ قرطاس پر منتقل ہو گئے۔

''اگر واقعی ایسا ہو جائے تو کیا یہ ناکامی ہوگی؟

کون کہہ سکتا ہے کہ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ناکام ہوئی؟

بالاکوٹ کا ذرہ ذرہ شہادت دے رہا ہے کہ جنہوں نے یہاں نقد حیات ہاری ہے ان سے زیادہ نفع میں کوئی نہیں جنہوں نے یہاں جانیں دی ہیں وہی ہیں کہ جو حیاتِ جاوداں پا گئے۔ بالاکوٹ کی پشت پر کھڑا ایک مہیب پہاڑ شہادت دے رہا ہے کہ اس نے جو معرکہ آج سے سوا سو سال قبل اپنے دامن میں ہوتا دیکھا تھا اس سے زیادہ کامیاب معرکہ ہندوستان میں اسلام نے کبھی نہ لڑا۔کنہار کی اچھلتی کودتی موجیں گواہی دیتی ہیں کہ جس خون نے آج سے سوا سو سال قبل انہیں سرخی عطا کی

---

(۱) شورش کاشمیری مرحوم

تھی وہی ہے کہ جس نے ہند میں اسلام کے پودے کو سینچا ہے۔ بالاکوٹ کی فضا کانوں میں سرگوشیاں کرتی ہے کہ اس کے سہمے سہمے سکوت میں درختوں کے جھنڈ تلے جو چند نفوس آرام کر رہے ہیں وہی ہیں جو "ہند میں سرمایۂ ملت کے نگہبان" بنے۔ وہی ہیں جو ہار کھا کر جیتے، جن کی شکست میں کامرانی پوشیدہ تھی، جن کی شہادت میں حیات جاوداں مسکرا رہی تھی ...... وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ. فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ. يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ.

ماخوذ از "عزم" ۱۰ راگست ۵۳ء)

کاش واقعتاً جماعت اسلامی پاکستان کی تاریخ کسی بالاکوٹ کے مقامِ بلند تک پہنچ کر ختم ہوئی ہوتی ...... تا کہ اس کی یاد سے آنے والی نسلوں کے دلوں میں ایمان تازہ ہوتا اور جذبۂ اعلاءِ کلمۃ اللہ کے چشمے ابلتے رہتے۔ لیکن افسوس کہ اس کے برعکس یہ تحریک ریگ زارِ بہاولپور کے ایک دُور افتادہ قریے ماچھی گوٹھ میں ایک ریگستانی ندی کی طرح جذب ہو کر رہ گئی۔ جہاں اس کے قائدے اپنی بہترین صلاحیتیں اپنے ان دیرینہ ساتھیوں سے خیالی نبرد آزمائی میں صرف کیں جو کچھ اپنے خلوص کے باعث اور کچھ انتشار کے خوف کی بنا پر شکست کھانے کے لیے از خود تیار تھے----- اور اس نبرد آزمائی میں 'حکمت عملی' کی مہارتِ تامہ کے ساتھ پس پردہ مصالحت اور بر سر عام دعوتِ مبارزت کا وہ کھیل کھیلا جس کی یاد بھی سخت نفرت انگیز اور کراہت آمیز ہے!

قائم مقام امیر جماعت کی ہدایات .... 'مصالحت کنندگان' اجتماعِ ماچھی گوٹھ کو جس جذبے کے تحت منعقد کرنا چاہتے تھے اس کا اندازہ اس سرکلر سے کیا جا سکتا ہے جو قائمقام امیر جماعت کے دستخط سے ۱۶ رجنوری ۱۹۵۷ء کو جاری ہوا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رفقاء محترم -----! شوریٰ منعقدہ ماہ نومبر ۵۶ء کے بعد ہماری جماعتی زندگی میں

بعض ایسے واقعات نمودار ہوئے ہیں جن کے واقع ہونے کی توقع نہ ہم کوتھی اور نہ جماعت کے باہر کے لوگوں کوتھی۔ان واقعات سے بعض جگہ جماعت کا داخلی استحکام بھی متأثر ہوا ہے اور باہر کے لوگوں کی نگاہوں میں بھی ان سے جماعت کا وقار مجروح ہوا ہے۔ جولوگ ہم سے حسن ظن رکھتے تھے اوراس ملک کی اصلاح سے متعلق ہم سے امیدیں قائم کئے ہوئے تھے اُن پر دل شکستگی اور مایوسی طاری ہوئی ہے اور جن کو ہم سے مخالفت تھی ان کو خوش ہونے اور ہمارے خلاف بدگمانیاں پھیلانے کا کافی مواد ان چند ہفتوں میں ہاتھ آیا ہے۔

میں سارے حالات کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ جو کچھ پیش آیا ہے اس کا بہت تھوڑا حصہ ہے جس کے پیش آنے کے لیے فی الواقع کوئی وجہ موجود تھی۔اس کا بڑا حصہ ایسا ہے جس کے پیش آنے کی کوئی ادنیٰ وجہ بھی موجود نہیں تھی بلکہ چند لوگوں کی محض ناسمجھی' بے احتیاطی اور بدگمانی نے اس کے اسباب فراہم کر دیئے ہیں۔بعض لوگوں نے شوریٰ کی کارروائیوں سے متعلق بالکل غلط اور بے بنیاد تأثرات دیئے۔بعض لوگوں نے قرارداد کے متن کی ایسی تاویل کرنے کی کوشش کی جو اس کے منشاء کے خلاف تھی۔بعضوں نے شوریٰ کے ارکان کی طرف غلط باتیں منسوب کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ بعض مقامات پر ذمہ داروں نے اپنے حقوق واختیارات کے استعمال میں جلد بازی اور بے احتیاطی سے کام لیا۔اسی طرح بعض نے شدتِ تأثر میں اپنے جذبات پبلک پر ظاہر کر دیئے۔ان ساری باتوں نے مل کر چند دنوں کے لیے جماعت کے مزاج کو اس طرح بگاڑ دیا کہ لوگوں کے ذہن ہر طرح کی باتیں قبول کرنے اور ہر طرح کی باتیں پھیلانے کے لیے بالکل بے قید ہو گئے اور شریعت اور اخلاق کے حدود کی بھی پرواہ بہت کم ہو گئی۔ یہ اللہ کا احسان ہے کہ یہ صورت ایک خاص رقبہ ہی کے اندر محدود رہی اور زیادہ متعدی نہ ہونے پائی تاہم ان چند ہفتوں کے اندر جو باتیں ہوئی ہیں وہ ہماری شفاف جماعتی زندگی کو داغدار کرنے والی ہیں اور اب ہم سب کا یہ فرض ہے کہ ہم ان داغوں کو مٹانے کی کوشش کریں اور آئندہ کے لیے اس طرح کی باتوں سے محفوظ رہنے کا عہد کریں۔

میں اس موقع پر ارکانِ جماعت کو چند ہدایات کرتا ہوں اور متوقع ہوں کہ وہ بلا تاخیر

ان کا اہتمام کریں گے۔

۱۔ ہر شخص جس سے اس موقع پر کوئی دانستہ یا نا دانستہ بے احتیاطی صادر ہوئی ہے وہ اپنے آپ کو کوئی الاؤنس دیئے بغیر توبہ و استغفار کرے اور اپنے رویہ کی اصلاح کا عہد کرے۔

۲۔ جس نے اپنے کسی دوسرے رفیق کے خلاف کوئی بات زبان سے نکالی ہو وہ ازخود کھلے دل سے اس سے معافی مانگ لے اور دوسرا کھلے دل سے اس کو معاف کر دے۔

۳۔ اس سلسلہ کی ساری باتوں کو نسیاً منسیاً کر دیا جائے۔ نہ نجی مجلسوں میں ان کا کوئی چرچا کیا جائے نہ جماعتی اجتماعات میں ان کا کوئی ذکر ہو۔

۴۔ جہاں جہاں دلوں میں کدورتیں پیدا ہوئی ہوں، وہاں اجتماعی تربیات کے مواقع پیدا کر کے دلوں کے ملانے اور خوشگوار تعلقات بڑھانے کی صورتیں نکالی جائیں اور اس کام میں وہ ارکان رہنمائی کا فرض انجام دیں جو خوش قسمتی سے اس موقع پر ان آلائشوں سے پاک رہے ہیں۔

۵۔ جماعت کی پالیسی سے متعلق بحث و مباحثہ بند کر کے ساری توجہ تعمیری و اصلاحی کاموں پر مرکوز کی جائے اور پالیسی وطریق کار کی بحث کو ہونے والے اجتماعِ ارکان پر چھوڑ دیا جائے۔

۶۔ مقامی طور پر کارکنوں کی تربیت کے لیے انتظام کیا جائے۔

میں تمام رفقاء سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ ان ہدایات پر خلوص کے ساتھ عمل اور جماعت کو اس کی صحیح سمت میں موڑنے میں میرے ساتھ تعاون کریں گے۔ میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں شیطان کے فتنوں سے امان میں رکھے اور ہم اپنے دماغ، زبان اور قلم کی ساری طاقتیں اس کے دین کی خدمت میں صرف کرنے کی توفیق پائیں۔

جن مقامات پر ضرورت محسوس ہو وہاں ان باتوں کو متفقین تک بھی پہنچا دیا جائے۔

(دستخط) غلام محمد

قائمقام امیر جماعت اسلامی پاکستان

'حزبِ اقتدار' کی تیاریاں .... اس کے برعکس مولانا مودودی اور ان کے سیکرٹریٹ نے اس 'معرکے' کو سر کرنے کے لیے جو تیاریاں کیں ان کا اندازہ مولانا امین احسن اصلاحی کے حسب ذیل بیان سے کیا جا سکتا ہے۔

> ''پالیسی کے معاملہ میں ساری جماعت کو تو کوئی گفتگو کرنے سے روک دیا گیا' لیکن خود امیر جماعت پوری دھوم دھام کے ساتھ 'ترجمان' اور 'تسنیم' میں پالیسی سے متعلق اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے رہے۔ اس مقصد کے لیے شوریٰ کی وہ کارروائیاں بھی شائع کی گئیں' جن کی اشاعت شوریٰ کی اجازت کے بغیر جائز نہیں تھی اور بعض اشخاص کے خلاف غلط تأثر دینے کے لیے ان کے دوران بحث کی نجی باتوں کی بھی تشہیر کی گئی۔ اس دوران میں امیر جماعت نے 'ترجمان' میں یہ اصول بھی پیش فرمایا کہ نظریاتی حکمت اور ہوتی ہے اور عملی حکمت اور ہوتی ہے' جو لوگ ان کے قول و عمل کے تضاد پر اعتراض کرتے ہیں وہ اس رمز کو نہیں جانتے کہ نظریہ جب عمل کا جامہ پہنتا ہے تو اس کی شکل کیا بنتی ہے۔ اس فلسفہ کو مدلل کرنے کے لیے ایک مثال بھی پیش کی گئی کہ دیکھو نبی ﷺ زندگی بھر مساوات کا درس دیتے رہے لیکن وفات کے وقت 'الائمۃ من قریش' کہہ کر خلافت اپنے خاندان والوں کے سپرد کر گئے''۔

حقیقی عزائم .... ان تیاریوں کے پیچھے جو عزائم کارفرما تھے ان کا کسی قدر اندازہ اس گفتگو سے کیا جا سکتا ہے جو ماچھی گوٹھ کے لیے روانگی کے موقع پر مولانا مودودی اور چودھری غلام محمد صاحب کے مابین ہوئی۔ یہ گفتگو راقم الحروف کو حکیم عبد الرحیم اشرف صاحب نے سنائی اور ان سے اس کا تذکرہ خود چودھری صاحب نے ماچھی گوٹھ میں اس وقت کیا جب حکیم صاحب نے کسی بات پر مشتعل ہو کر اپنے اس ارادے کا اظہار کیا کہ وہ اجتماع ارکان میں اپنا اختلاف کھلم کھلا بیان کریں گے۔ حکیم صاحب راوی ہیں کہ چودھری صاحب نے مولانا مودودی سے سوال کیا کہ ''مولانا! ماچھی گوٹھ میں کرنا کیا ہے؟'' اس پر مودودی صاحب نے بے ساختہ فرمایا: ----- ''میں ان لوگوں سے تنگ آ چکا ہوں اور اب مزید ان کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ انہیں

ذلیل کر کے جماعت سے نکال دیا جائے!'' چودھری صاحب کے لیے یہ بات بہت غیر متوقع تھی۔ چنانچہ پہلے تو وہ سکتے میں آ گئے اور پھر انہوں نے ریل کے ٹکٹ مولانا کے سامنے پھینک دیئے اور کہا:-----''مولانا! یہ رہے ٹکٹ' آپ لوگ ماچھی گوٹھ جائیں اور جو چاہیں کریں۔ میں سیدھا کراچی جا رہا ہوں!''-----اپنے اس غالی معتقد اور انتہائی معتمد علیہ رفیق کو آمادۂ بغاوت دیکھ کر جس کے ہاتھ میں اُس وقت اتفاقاً بہت سے اختیارات بھی تھے مولانا مودودی نے کچھ توقف کیا اور پھر کہا: ''اچھا تو پھر ان لوگوں کو ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کریں گے!''

یہ واضح رہے کہ کچھ ہی دنوں پہلے مولانا مودودی 'حکمت عملی' پر ایک مبسوط تحریر لکھ کر شائع کر چکے تھے-----!!

اجلاس مرکزی شوریٰ............اجتماع ارکان سے متصلاً قبل ماچھی گوٹھ ہی میں مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی پاکستان کا ایک اجلاس منعقد ہوا' جس میں مولانا امین احسن اصلاحی بھی بطور خاص مدعو تھے۔

اس اجلاس میں کارروائی کی پہلی ہی شق پر ہنگامہ برپا ہو گیا اور میاں محمد طفیل صاحب نے بحیثیت معتمد مجلس شوریٰ کے گزشتہ دو اجتماعات کی روداد پڑھ کر سنائی تو شوریٰ کی واضح اکثریت نے ان پر الزام لگایا کہ انہوں نے شوریٰ کی کارروائی کو غلط طور پر پیش کیا ہے اور وہ جماعت کے سب سے زیادہ با اختیار ادارے کے ریکارڈ میں تحریف کر کے جماعت کے ساتھ بدترین خیانت کے مرتکب ہوئے ہیں-----اس پر میاں صاحب نے بقول شخصے ''اپنے روایتی انداز میں'' زار و قطار رونا شروع کر دیا-----اور شوریٰ کی کارروائی میں تعطل پیدا ہو گیا۔ اس تعطل نے طول کھینچا اور اجتماع ارکان بالکل سر پر آ پہنچا تو 'مخلص مصالحت کنندگان' پھر برسر کار ہوئے اور ان کی کوششوں کے زیر اثر دوسری باتوں کو چھوڑ کر اس قرار داد پر غور شروع ہوا جو اجتماع ارکان میں پیش کرنے کے لیے مولانا مودودی نے

مرتب فرمائی تھی! اس پر جو کچھ ہوا وہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے الفاظ میں سنئے :-

''اس اجلاس میں پہلی [1] مرتبہ وہ قرارداد میرے سامنے آئی جو امیر جماعت اجتماع عام میں جماعت کے سامنے لانے والے تھے۔ اس قرار داد پر میں نے --------

--------نہایت سخت الفاظ میں تنقید کی۔ میں نے شوریٰ کو بتایا کہ اگر آپ لوگ اس قرارداد کو اجتماع عام میں لائیں گے تو میں دسمبر والی شوریٰ کی قرارداد جماعت کے سامنے پیش کروں گا اور امیر جماعت اور ان کے اصحاب نے اس قرارداد کو دفن کرنے کے لیے جو مہمیں چلائی ہیں اور جو اقدامات کیئے ہیں وہ سب اجتماع عام میں بیان کروں گا۔ میرے یہ مؤقف اختیار کر لینے کے بعد شوریٰ میں تعطل پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد اکثر ارکان شوریٰ مجھ سے ملے اور اس صورت حال کے پیدا ہو جانے پر اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ میں نے ان کو یہ

---

(۱):اس ''پہلی مرتبہ'' کے اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اجتماع ماچھی گوٹھ سے قبل لاہور 'مصالحت' کے سلسلے میں جو گفت وشنید ہوتی رہی تھی اس میں اولاً مولانا اصلاحی اس پر مصر رہے تھے کہ ماچھی گوٹھ کے اجتماعِ ارکان میں دسمبر ۵۶ء والی شوریٰ کی متفقہ قرارداد ہی استصواب کے لیے پیش کی جائے۔ لیکن جب مصالحت کنندگان، خصوصاً مولانا ظفر احمد انصاری صاحب نے مولانا سے استدعا کی کہ وہ اس پر اصرار نہ کریں۔ اس قرارداد کے ساتھ بہت سی تلخ یادیں وابستہ ہوگئی ہیں اور یہ اب مولانا مودودی کے ذاتی وقار (Prestige) کا مسئلہ بن گیا ہے۔ آخر بعینہٖ اسی قرارداد پر کیا منحصر ہے۔ اگر وہی مفہوم دوسرے الفاظ میں ادا ہو جائے تو کیا حرج ہے! تو مولانا اصلاحی اس پر آمادہ ہو گئے کہ اسی مفہوم پر مشتمل کوئی دوسری قرار داد ماچھی گوٹھ کے اجتماع ارکان میں پیش کر دی جائے۔ مولانا ظفر احمد انصاری صاحب نے مولانا کو یہ یقین دلایا کہ مولانا مودودی ماچی گوٹھ میں پیش ہونے والی قرارداد پہلے ہی انہیں دکھا دیں گے اور ان دونوں کے اتفاق کے بعد ہی کوئی قرارداد اجتماع ارکان میں پیش ہوگی-----ان پختہ یقین دہانیوں کے بعد مولانا انصاری تو اچانک غائب ہو گئے (اور پھر ان کی صورت ماچھی گوٹھ ہی میں نظر آئی) اور مولانا اصلاحی اس انتظار میں رہے کہ ماچھی گوٹھ میں پیش ہونے والی قراری زیارت کا اشتیاق ہی لیے ہوئے ماچھی گوٹھ پہنچ گئے۔ اور وہاں شوریٰ کے اجلاس میں ''پہلی مرتبہ'' انہیں اس کی زیارت نصیب ہوئی!

بھی بتایا کہ میری تقریر کے وقت میرے ہاتھ میں قرآن ہوگا اور میں اپنے داہنے امیر جماعت کو بٹھاؤں گا اور بائیں قائمقام امیر جماعت چودھری غلام محمد صاحب کو' یہ دونوں حضرات میری جس بات کو کہہ دیں گے کہ یہ جھوٹ ہے، میں بغیر کسی حجت کے اس کو واپس لے لوں گا۔ مگر جماعت کے بزرگوں نے مجھے باصرار ایسا کرنے سے روکا کہ اس سے جماعت میں انتشار پیدا ہو جائے گا۔

بالآخر چوبیس گھنٹوں کے بعد باقر خان صاحب میرے پاس قرارداد لے کر آئے اور یہ کہا کہ امیر جماعت فرماتے ہیں کہ اگر تم اس میں کوئی لفظی ترمیم کرنا چاہتے ہو تو وہ تجویز کرو' اس پر غور کر لیا جائے گا لیکن کسی بنیادی ترمیم کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ میری تقریر تیار ہو چکی ہے۔ کسی لفظی ترمیم سے میرا مدعا حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس وجہ سے اس پیشکش کو قبول کرنا میرے لیے ناممکن تھا' لیکن محض اس خیال سے میں نے ناممکن کو ممکن بنایا کہ امیر جماعت کی ضد کے باوجود میں کوئی ایسی بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا جس سے جماعت میں انتشار پیدا ہو۔ چنانچہ میں نے قرارداد میں بعض لفظی ترمیمات کر کے اس کو جماعت کے اصل نصب العین کے قریب بنانے کی کوشش کی۔ امیر جماعت اور شوریٰ نے کچھ ردّ و قدح کے بعد میری یہ ترمیم قبول کر لی''۔ (۱)

اس طرح خدا خدا کر کے تعطل دُور ہوا اور کچھ بھلے لوگوں کی سر توڑ محنت سے بظاہر ایسی صورت بن گئی کہ اجتماع ارکان میں جماعت کی سابقہ اور آئندہ پالیسی کے بارے میں مرکزی مجلس شوریٰ کی جانب سے ایک متفقہ قرارداد مولانا مودودی پیش کریں گے ----- ساتھ ہی یہ بھی طے کر لیا گیا کہ اجتماع ارکان میں مولانا مودودی پر اظہار اعتماد کی

---

(۱) لیکن جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا مولانا نے یہ ترمیم دل سے قبول نہ کی تھی بلکہ اسے صرف مصلحت وقت کا تقاضا سمجھ کر مجبوراً قبول کیا تھا۔ اس لیے کہ اس موقع پر ان کے فعال نائبین میں سے ایک دوسری انتہائی اہم شخصیت یعنی محمد باقر خان مرحوم آمادۂ بغاوت ہو گئے تھے! ----- ضرورت کے وقت خم کھا جانا ----- اور پھر موقع دیکھ کر خم ٹھونک کر میدان میں آ جانا مروّجہ دنیوی سیاست کے اعتبار سے کامیابی کے ناگزیر لوازم میں سے ہے ---- یہ دوسری بات ہے کہ ؏

ایں حال نیست صوفی عالی مقام را !!

قرارداد پیش کی جائے گی جس کی سب تائید کریں گے۔ چنانچہ مولانا اپنا استعفیٰ واپس لے لیں گے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ رہے عام ارکانِ جماعت تو ان کے بارے میں غالباً یہ کافی خیال کیا گیا کہ انہیں کچھ رپورٹیں اور کچھ تقریریں سنوا کر رخصت کر دیا جائے' پالیسی سے متعلق اختلافی بحثوں میں انہیں الجھانے سے سوائے انتشار کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔

اس طرح ایک مرتبہ پھر جماعت کے اربابِ حل وعقد میں جماعت کی پالیسی کے بارے میں ''اتفاق واتحاد' پیدا ہو گیا۔ رہی یہ بات کہ یہ اتحاد سطحی تھا یا گہرا-----اور حقیقی تھا یا مصنوعی' تو ظاہر ہے کہ اس کا علم سوائے ارکانِ شوریٰ (یا جماعت سے بالکل باہر کے ایک شخص یعنی مولانا انصاری) کے اور کسی کو نہ تھا۔ جماعت کے عام ارکان تو دُور رہے ان لوگوں کے سامنے بھی جو ان مسائل میں پوری طرح الجھے ہوئے تھے لیکن رکن شوریٰ نہ تے معاملے کی جو صورت آئی اس کا اندازہ ان الفاظ سے کیا جا سکتا ہے جو راقم الحروف نے بعد میں اپنے استعفیٰ میں تحریر کیئے:-

''ماچھی گوٹھ حاضر ہوا تو جس چیز کا خدشہ تھا وہی ہوا۔[۱]

کاھیا میں گُڑ پھوڑا جا چکا تھا۔ ایک متفقہ قرارداد شوریٰ کی طرف سے اجتماعِ ارکان میں پیش ہوئی تھی' اجتماع کا سارا پروگرام ایک سوچی سمجھی سکیم کے ساتھ اس طرح بنایا جا چکا تھا کہ اول تو کوئی اختلافی آواز اُٹھا ہی نہ جا سکے۔ اور اُٹھے بھی تو پوری طرح محبوس ہو کر! میں یہاں منتظمین اجتماع کی نیتوں پر حملہ نہیں کرنا چاہتا۔ انہوں نے جو کچھ کیا انتہائی خلوص کے ساتھ ''اھون البلیّتین'' کے مشہور ومعروف فلسفے کے تحت ایک بہت بڑے شَر یعنی جماعت کے انتشار سے بچنے کے لیے کیا۔ لیکن یہ بھی بہر حال اپنی جگہ ایک واقعہ ہے کہ اجتماع کو جس طرح CONDUCT[۲] کیا گیا اس میں کسی اختلافی آواز کا اٹھنا خصوصاً ایسی حالت میں کہ ''اکابرین'' میں سے تو کوئی میدان میں رہا ہی نہیں تھا چند بے وقعت ''اصاغرین'' باقی تھے ممکن نہ تھا......''

---

(۱) ملاحظہ ہو راقم الحروف کا وہ خط جو اس نے قائم مقام امیر جماعت کے توسط سے مرکزی مجلس شوریٰ کو لکھا۔

(۲) اس کی تفصیلات آئندہ بیان ہوں گی۔

اجتماعِ ارکان

ڈاکٹر عثمانی صاحب کا نعرۂ حق............اجتماعِ ارکان کی پہلی نشست کا آغاز ہوا ہی تھا کہ کراچی کے درویش منش رکن ڈاکٹر سید مسعود الدین حسن عثمانی دہائی دیتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے مطالبہ کیا کہ سب سے پہلے انہیں اس کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنی اس تحریر کو پڑھ کر سنا دیں جو انہوں نے قائم مقام امیر جماعت کے توسط سے مرکزی مجلس شوریٰ کو ارسال کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی جرأتِ ایمانی کا مظاہرہ کچھ ایسے طریقے سے ہوا کہ منتظمین اجتماع نے بے چوں و چرا ان کو اپنی تحریر پڑھ کر سنانے کی اجازت دے دی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس تحریر میں مرکزی مجلس شوریٰ کے وسط جنوری کے اجلاس کے بعض فیصلوں سے شدید اختلاف کیا اور زیر انعقاد اجتماعِ ارکان کے سلسلے میں کچھ تجاویز پیش کیں' ساتھ ہی قیم جماعت کے اس بیان پر شدید تنقید کی جو انہوں نے سعید ملک صاحب کے بیان کے جواب میں دیا تھا اور مولانا مودودی کے اس اقدام کے سلسلے میں وضاحت طلب کی جو انہوں نے ارکانِ جائزہ کمیٹی کے خلاف کیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کا موقف یہ تھا کہ یہ طریقہ کہ امیر جماعت' جماعت کے آج تک کے اختیار کردہ طریق کار کی پوری تاریخ بیان کریں اور آئندہ کی پالیسی کے بارے میں ایک قرارداد پیش کریں ----- جماعت کی سابقہ روایات کے بالکل خلاف ہے اور موجود حالات میں اس سے بدگمانی اور سوءِ ظن کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اس کے برعکس ہونا یہ چاہیے کہ شوریٰ نومبر دسمبر ۵۶ء کی متفقہ قرارداد ہی کو اس اجتماع ارکان میں استصواب کے لیے پیش کیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب کے اپنے الفاظ میں:

> ''اس زمنے میں جب کہ شیطان نے ہمارے داخلی استحکام کو منہدم کرنے کے لئے بھر پور حملہ کیا تھا اور جب کہ شیطان کو یہ موقع پوری طرح مل گیا تھا کہ وہ جماعت میں اعتماد اور حسن ظن کی فضا کو مسموم کر دے، اس امر کی سخت ضرورت تھی کہ جماعت کے ہونے والے کُل پاکستان اجتماع میں مسائل اور معاملات پیش کرنے کے لیے

ایسا طریق کار تجویز کیا جاتا جو ہر شک وشبہ سے بالاتر ہوتا......لیکن مجلس شوریٰ کے تجویز کردہ طریق کار پر غور کرنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں غور و فکر کا پورا حق ادا ہونے سے رہ گیا ہے......ہم بہر حال اپنے اکابر کے سلسلے میں حسن ظن سے کام لینے کے عادی رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ موجودہ غیر معمولی حالات میں حسن ظن کی انتہائی حد کو کام میں لانے کے باوجود دل کو اطمینان حاصل نہیں ہوتا ......''

''یہ امر بھی انتہائی تشویش کا باعث ہے کہ مجلس شوریٰ نے اس قرارداد کو جو شوریٰ کے اجلاس منعقدہ نومبر دسمبر میں پندرہ یوم کے غور وخوض کے بعد متفقہ طور پر منظور کی گئی تھی ارکان کے اجتماع کے آغاز سے کالعدم قرار دینے کا فیصلہ کرلیا۔ اس سلسلے میں جو وجوہ بیان کیے گئے ہیں وہ کسی طرح دل کو مطمئن نہیں کرتے ......میری ناقص رائے میں اگر اب بھی اسی قرارداد کو ارکان کے اجتماع میں فیصلے کے لیے پیش کیا جائے تو یہ بہت ہی مناسب ہوگا......''۔

اپنی تحریر کو پڑھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب جذبات سے بہت زیادہ مغلوب ہو گئے اور شدتِ تأثر میں ان کی آواز بھی گلوگیر سی رہی۔ نتیجتاً ان کی بات عام ارکانِ جماعت میں سے تو شاذ ہی کسی کی سمجھ میں آئی۔ رہے وہ لوگ جن کا سمجھنا مفید ہوسکتا تھا تو وہ سب کچھ سمجھ کر بھی نہ سمجھنے کا تہیہ کیے ہوئے ہی تھے! بہر حال اپنی طرف سے ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس فرض کو ادا کرنے کی بھرپور کوشش کی جس کے بارے میں خود ان کے الفاظ یہ ہیں:

'حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر میں اپنے آپ کو اس بات پر مجبور پاتا ہوں کہ اس فرض کی ادائیگی کے لیے اُٹھ کھڑا ہوں جس کا اقرار میں نے جماعت کے ساتھ خدا کو حاضر ناظر جان کر کیا تھا......ایک دن ضرور آئے گا کہ ظاہر و باطن سے سارے پردے اُٹھ جائیں گے اور اس روز میں اپنی اس کوشش کو اپنے پروردگار کے سامنے رسوائی سے بچنے کا ذریعہ بناؤں گا''۔

آخرت میں ڈاکٹر صاحب اپنی اس حق گوئی کا جو اجر چاہیں پائیں' جماعت اسلامی پاکستان کے کل پاکستان اجتماعِ ارکان میں بہر حال ان کی کوئی شنوائی نہ ہوئی اور اجتماع کی کارروائی طے شدہ پروگرام کے مطابق جاری رہی۔ چنانچہ اس کے بعد قیم جماعت نے

ایک مفصل رپورٹ پڑھ کرسنائی اوراجتماع کی ایک پوری نشست اس کے نذر ہوگئی۔

امیر جماعت پر اظہار اعتماد ....قیم جماعت کی رپورٹ کے بعد سب سے پہلے مولانا مودودی پر اظہار اعتماد اوران سے استعفیٰ واپس لینے کی درخواست پر مشتمل قرارداد پیش ہوئی اوراس پر دھواں دھار تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا' جواکثر و بیشتر ان ہی مضامین پر مشتمل تھیں جوکسی بھی اظہار اعتماد کی قرارداد میں ہوتے ہیں یعنی مولانا مودودی کی تعریف و توصیف اور اقامت دین کے لیے ان کی سعی و جہد کوخراج تحسین اوران کے تدبر اورفہم و فراست پر کامل اعتماد کا اظہار۔ اس خیال سے کہ جماعت کے ارباب حل وعقد کے مابین اختلاف وانتشار کی خبروں سے جوتشویش عام ارکانِ جماعت کے قلوب واذہان میں پیدا ہو گئی ہےاس کوکم کیا جائے،اس قرارداد پران لوگوں سے بطور خاص تقریریں کرائی گئیں جن کے بارے میں مشہور تھا کہ ان کومولانا مودودی سے اختلاف ہے-----ان حضرات نے اگرچہ اپنی حدتک اپنی تقریروں میں محتاط الفاظ استعمال کیئے-----اور بعض مواقع پر ذو معنی باتیں بھی کہیں جن کا اصل مفہوم یا وہ خود جانتے تھے یا مولانا مودودی اور یا وہ چندلوگ جو پورے پس منظر سے باخبر تھے۔لیکن عام ارکان جماعت نے ان کو بہر حال ان کے ظاہری مفہوم ہی پرمحمول کیا۔اوریہی اس وقت سب کا مطلوب ومقصود بھی تھا۔

مولانا اصلاحی نے اس قرارداد پر جوتقریر کی وہ فن خطابت کا ایک حسین مرقع تھی اور اس میں ان کا تخاطب بظاہر تمام شرکائے اجتماع سے لیکن دراصل صرف مولانا مودودی سے تھا۔اپنی اس تقریر میں مولانا نے دراصل مولانا مودودی کو اس امر پر سرزنش کی تھی کہ اقامت دین کے لیےلوگوں کو بلانے اورانہیں اپنے اپنے ماحول ومشاغل سے منقطع کرنے کے بعداب ان کا یہ رویہ بالکل غلط ہے کہ ساتھیوں اور رفیقوں کے مشوروں کو بالکل نظرانداز کر کےصرف اپنی من مانی کرنے پر اصرار کریں اوران کی جانب سے معمولی سے اظہارِ اختلاف اور ذراسی تنقید پر استعفاء کی دھمکیاں دینی شروع کر دیں۔اسی سلسلۂ کلام میں جب انہوں نے عام ارکانِ جماعت سے خطاب کرتے ہوئے کچھ اس طرح کے الفاظ کہے کہ:

''آپ لوگ چاہیں تو مولانا مودودی کے پاؤں پڑیں اور چاہیں تو ان کا دامن پکڑنے کی کوشش کریں لیکن میں ان کا گریبان پکڑ کر ان سے سوال کرتا ہوں کہ سب کو جمع کر کے اب وہ خود کہاں جانا چاہتے ہیں''۔

تو ظاہر ہے کہ اس کا اصل مفہوم صرف مولانا مودودی ہی سمجھ سکتے تھے!

یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ راقم الحروف سٹیج پر حاضر ہوا اور اس نے اولاً ان لوگوں کے طرزِ عمل پر اظہارِ حیرت کیا جن کے بارے میں اسے یہ معلوم تھا کہ وہ مولانا مودودی کے نقطۂ نظر سے شدید اختلاف رکھتے ہیں اور ان کے دلوں میں اب واقعتاً مولانا مودودی کے لیے کوئی احترام باقی نہیں رہ گیا ہے کہ وہ کس طرح اس قرارداد کی تائید میں تقریریں کر رہے ہیں۔ اس پر منتظمین اجتماع اور دوسرے لوگوں میں سے خصوصاً نعیم صدیقی صاحب نے شور مچایا کہ اس قسم کی باتیں اس موقع پر نہیں کہی جا سکتیں، جس کو بھی ایسی کوئی بات کہنی ہے وہ اس نشست میں کہے جو احتساب کے لیے محسوس کی گئی ہے [1] ----- مجبوراً میں نے اس بات کو یہیں چھوڑ کر ضابطے اور قاعدے کی بات پیش کی کہ:

''یہ اجتماع ارکان اس غرض سے بلایا گیا تھا کہ ارکان جماعت پالیسی اور طریق کار کے بارے میں مختلف نقطہ ہائے نظر کا جائزہ لے کر آئندہ کے لیے اپنا لائحہ عمل طے کریں گے۔ اس اجتماع کی ابتداء کسی بھی شخص پر اظہار اعتماد کے ساتھ کرنا صحیح نہیں ہے۔ کجا ان امیر جماعت پر جو از یوم تاسیس تا امروز جماعت کی امارت کے منصب پر فائز رہے ہیں اور جماعت کے موجودہ طریق کار سمیت اس کی آج تک کی تمام پالیسی ان ہی کے ذہن کی تخلیق ہے۔ ان پر اظہار اعتماد کی قرارداد منظور ہو جانے کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ اجتماع ارکان ان کی جملہ پالیسی کی بھی توثیق کر رہا ہے-----

---

(۱): ظاہر بات ہے کہ اگرچہ میری اس تنقید کا براہ راست ہدف وہ بزرگ ارکان جماعت تھے جو پالیسی اور طریق کار کے بارے میں وہی نقطۂ نظر رکھتے تھے جو میرا تھا لیکن اگر میری یہ بات بڑھنے دی جاتی تو اس سے اجتماع کا رخ بالکل تبدیل ہو جاتا اور اتحاد و اتفاق کا سارا طمع اسی موقع پر اتر کر رہ جاتا۔ اور کیا عجب کہ پورے ڈرامے کا ڈراپ سین اسی وقت ہو جاتا۔ لہٰذا لطف کی بات یہ ہے کہ اس موقع پر بزرگ اصحاب اختلاف کی جانب سے مدافعت ان صاحب (نعیم صدیقی) نے کی جنہوں نے بعد میں خود اپنی تقریر میں انہیں امراضِ دماغی میں مبتلا قرار دیا۔

پھر کسی مزید بحث وتمحیص کا جواز باقی رہ جائے گا؟''۔

میری یہ بات اس وقت تو نقار خانے میں طوطی کی صدا ہو کر رہ گئی ---- اور میرے بعد پھر اظہار اعتماد سے بھرپور تقاریر کا سلسلہ شروع ہو گیا لیکن کچھ دیر بعد خود مولانا مودودی سٹیج پر آئے اور انہوں نے راقم الحروف کا نقطۂ نظر قبول کر کے قرارداد غور اور بحث کو ملتوی کر دیا۔

--------------- (۲) ---------------

یہاں 'نقض غزل' کا وہ حصہ ختم ہو گیا جو اب سے تئیس (۲۳) سال قبل ۶۷-۱۹۶۶ء میں شائع ہوا تھا۔ جب اُن تلخ حوادث و واقعات پر صرف دس (۱۰) برس گزرے تھے جن پر جماعت اسلامی کی تاریخ کا یہ تاریک باب مشتمل ہے۔ لہٰذا 'محافظ خانۂ ذہن' کی فائلیں بھی ابھی 'بند' (Close) نہیں ہوئی تھیں اور ''نہاں خانۂ قلب'' کے داغ بھی تازہ تھے۔ مزید برآں اس وقت تک ان حوادث و واقعات کے ذمہ دار اور متأثرین سب بقید حیات تھے' چنانچہ جب اُن کی جانب سے کسی بات کی تردید یا تصحیح نہیں ہوئی تو گویا بالواسطہ توثیق و تصدیق ہو گئی ---- ویسے بھی ''نقض غزل'' کی شائع شدہ اقساط کا اکثر و بیشتر حصہ بعض ''دستاویزات'' پر مشتمل تھا جن کی تردید یا تکذیب کا امکان خارج از بحث ہوتا ہے!

البتہ ماچھی گوٹھ کے اجتماعِ ارکان کے بقیہ اور اصل حصے کی روداد اور اس کے بعد کے حوادث و واقعات کا معاملہ مختلف ہے۔ اس لیے کہ کُل دو (۲) دستاویزات کے سوا جن کا ذکر بعد میں آئے گا' اُن کا کوئی تحریری ریکارڈ نہ راقم الحروف کے پاس موجود ہے نہ اُس کے علم کی حد تک کسی اور کے پاس!۔ لہٰذا ان کے ضمن میں کُل انحصار یادداشت پر کرنا ہو گا جس میں کم از کم واقعات کی زمانی ترتیب میں تقدیم و تاخیر کی حد تک خطا کا امکان یقیناً موجود ہے!

اس امکان کو ''تا حد امکان'' کم کرنے کے لیے راقم نے اپنی شدید علالت کے باوجود ماہ جنوری ۹۰ء کے دوران متعدد ''بقیۃ السلف'' حضرات سے ملاقات کی۔ اور اس کے لیے بعض سفر بھی بطور خاص اختیار کیے۔ چنانچہ فیصل آباد جا کر مولانا عبدالغفار حسن اور حکیم عبد

الرحیم اشرف سے ملاقات کا شرف حاصل کیا' قصور جا کر جناب ارشاد احمد حقانی سے گفتگو کی۔ جناب مصطفیٰ صادق نے کرم فرمایا کہ جیسے ہی میری خواہش اُن کے علم میں آئی وہ خود تشریف لے آئے (اور واقعہ یہ ہے کہ سب سے زیادہ معلومات بی ان ہی سے حاصل ہوئیں)۔ اواخر جنوری میں کراچی کا ایک سفر انجمن خدام القرآن سندھ کے پروگرام کے سلسلے میں پہلے سے طے تھا' لیکن اگر 'نقض غزل' کے سلسلے میں شیخ سلطان احمد صاحب سے ملاقات کی شدید خواہش نہ ہوتی تو شاید میں اپنی علالت کی بنا پر اس سفر کو ملتوی کر دیتا۔ لیکن شدید تکلیف کے باوجود میں نے یہ سفر اختیار کیا اور شیخ صاحب موصوف کا کرم کہ انہوں نے نہایت خندہ پیشانی سے مفصل ملاقات اور سیر حاصل گفتگو کا موقع عنایت فرمایا۔ **فجزاهم الله عنی خیر الجزاء!**

ان ملاقاتوں کا یہ فائدہ تو یقیناً بسا غنیمت ہے کہ بعض ایسے بزرگوں اور سابق ہم سفروں سے تجدید ملاقات ہوگئی جن سے ملاقاتوں کا سلسلہ عرصہ سے منقطع تھا...... مزید برآں 'نقض غزل' کے شائع شدہ مواد کی بحیثیت مجموعی تصویب مزید اور تصدیق مکرر بھی ہوگئی...... صرف اس عمومی 'شکایت' کے ساتھ کہ حوادث و واقعات کے بیان میں اختصار بہت زیادہ ہے اور بعض 'تلخ تر' حقائق و واقعات بیان ہونے سے رہ گئے ہیں...... تاہم اجتماع ماچھی گوٹھ کے ضمن میں اس کے سوا کہ بعض یادیں تازہ ہوگئیں' اور انگریزی محاورے کے مطابق Notes ایک دوسرے سے Tally کر گئے' کوئی خاص اضافی مواد حاصل نہیں ہوسکا۔

☆ ☆ ☆

ادھر خود جماعت اسلامی نے تو اپنی تاریخ کے اس 'تاریک باب' کے اخفاء کا اتنا اہتمام کیا کہ جماعت کی ایک مستقل روایت کو ختم کر دیا۔ اور ''رودادوں'' کی اشاعت کا سلسلہ ہی بند کر دیا۔ اس لیے کہ اگر اس اجتماع کی روداد شائع کی جاتی تو لامحالہ اختلاف کرنے والے ارکان کی تقریریں بھی شائع کرنی پڑتیں۔ لہٰذا مناسب خیال کیا گیا کہ صرف مولانا مودودی کی تقریر شائع کر دی جائے' باقی رہی مفصل روداد تو اس سے خود بھی ''غض بصر'' کر لیا جائے' اور نہ صرف موجود الوقت لوگوں بلکہ آئندہ آنے والی نسلوں کو بھی بے خبر رکھا جائے۔ رہا

جماعت کا اپنا دفتری ریکارڈ تو اس کے ضمن میں بھی ع ''اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی!'' کہ اُس کا بھی بہت سا حصہ اچھرہ سے منصورہ منتقلی کے دوران ضائع ہو گیا ہے' اور اب وہاں بھی متعلقہ تفاصیل موجود نہیں ہیں۔ گویا معاملہ صرف یہی نہیں کہ ؎

وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں

اچھا کیا جو مجھ کو فراموش کر دیا!

بلکہ صورتِ واقعہ کچھ ایسی بن گئی ہے کہ ع ''جلا کے خاک کیا' خاک کو غبار کیا!'' یہ دوسری بات ہے کہ ع ''جو چُپ رہ گی زبان خنجر' لہو پکارے گا آستیں کا!'' کے مصداق اجتماع ماچھی گوٹھ اور اس کے بعد کے حوادث و واقعات کے ضمن میں دو دستاویزات محفوظ رہ گئیں جن کے بین السطور حالات و واقعات کی پوری تصویر موجود ہے...... ایک راقم کا استعفاء از رکنیت جماعت جو اجتماع ماچھی گوٹھ کے لگ بھگ دو ماہ بعد لکھا گیا تھا (اور اب اندازہ ہوتا ہے کہ اُس کا اس قدر تفصیل سے تحریر ہونا بھی اللہ تعالیٰ کی خصوصی مشیت کے تحت تھا' اس لیے کہ وہ بجائے خود 'نقضِ غزل' کا مکمل خاصہ ہے!)......اور دوسرا مولانا امین احسن اصلاحی کا ایک وضاحتی خط جو اجتماع ماچھی گوٹھ کے لگ بھگ ایک سال بعد اس وقت لکھا گیا جب مولانا نے رکنیت جماعت سے استعفاء دیا اور انہیں بے شمار خطوط موصول ہوئے جن میں اُن سے استعفے کے وجوہ واسباب دریافت کئے گئے تے! مولانا کی یہ مفصل تحریر بھی اُن کے مقام اور مرتبہ کے اعتبار سے 'نقضِ غزل' کی ایک خود مکتفی تصویر ہے' چنانچہ اُن دنوں کی سائیکلوسٹائل شدہ نقول کثیر تعداد میں ایک 'گشتی مراسلہ' کی صورت میں تقسیم ہوئی تھیں!

بنابریں...... 'نقضِ غزل' کی تکمیل کے سلسلے میں ہم اولاً ماچھی گوٹھ کے اجتماع ارکان کی بقیہ کارروائی کے اہم حصے 'یادداشت' کی بنا پر درج کر رہے ہیں اور اس ضمن میں جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس کے حرف حرف کی صداقت پر حلف لینے کو تیار ہیں سوائے صرف اس ایک بات کے کہ جیسے پہلے عرض کیا جا چکا ہے' واقعات کی زمانی ترتیب میں تقدیم و تاخیر کا امکان موجود ہے! ثانیاً متذکرہ بالا دونوں دستاویزات شائع کی جا رہی ہیں جن کے بین السطور میں وہ ''آئینۂ گفتار'' موجود ہے جس میں ہر جویائے حق علامہ اقبال کے ان الفاظ کے مصداق

کہ ع ''آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ!'' جماعت اسلامی کی تاریخ کے ۵۶ء اور ۵۷ء کے دو سالوں پر مشتمل بحرانی دور کے اصل حقائق اور واقعات کی ''دھندلی سی اک تصویر'' دیکھ سکتا ہے۔

اجتماعِ ارکان کی بقیہ رُوداد

مولانا مودودی کی قرارداداور تقریر

’قرارداداعتماد‘ پر بحث کے ملتوی ہونے کے بعد مولانا مودودی نے جماعت اسلامی کے تاریخ میں پہلی بار جماعت کی پالیسی کے ضمن میں اپنی سوچ اور رائے کو ایک مفصل قرار داد کی صورت میں پیش کیا۔اور اس کی وضاحت کے لیے ایک نہایت مفصل اور مدلل تقریر کی جو چھ گھنٹے سے زائد جاری رہی اور غالباً تین نشستوں میں مکمل ہوسکی۔

یہ قرارداد اور تقریر بعد میں ’’تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل‘‘ کے عنوان سے شائع ہوئی‘ اور اس کا جو نسخہ اس وقت راقم کے پیش نظر ہے وہ اس کے بارہویں ایڈیشن کا ہے جو اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ لاہور کے زیر اہتمام ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا تھا (یہ وضاحت اس لیے کر دی گئی کہ اجتماع کے بعد ترتیب وتسوید اور طباعت و اشاعت کے مختلف مراحل کے دوران اس میں کوئی لفظی ردّ و بدل ہوا ہوتو اس کی ذمہ داری سے ہم بری ہیں۔اس لیے کہ ہمارے پاس اس کا کوئی اور ریکارڈ محفوظ نہیں ہے)

یہ قرارداد بھی مولانا مودودی کی مرتب کردہ تھی اور اس کے لیے مفصل تقریر بھی مولانا لاہور ہی سے پوری طرح تیار کر کے لائے تھے۔لیکن جیسے کہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے‘ مجلس شوریٰ کے اجلاس کے دوران جو سلسلۂ گفت وشنید جاری رہا اور جو سعی مصالحت بروئے کار آئی اُس کے نتیجے میں اس میں مولانا امین احسن اصلاحی کے اختلافی نقطۂ نظر کو سمونے اور شامل کرنے یعنی Accomodate کرنے کی خاطر ان کے تجویز کردہ جملے کا اضافہ کر دیا گیا تھا......اور اس طرح اب ’قرارداد‘ مولانا مودودی کی ذاتی نہیں رہی بلکہ اسے مجلس شوریٰ کی ’’متفقہ قرارداد‘‘ کی حیثیت حاصل ہوگئی جسے مولانا نے گویا شوریٰ کے نمائندے (Spokesman) کی حیثیت سے پیش کیا۔لیکن جیسے کہ راقم کو پہلے ہی سے اندیشہ تھا‘ جس کا واضح اظہار بھی راقم نے اپنے اُس خط میں کر دیا تھا جو راقم نے جماعت اسلامی منٹگمری

(ساہیوال) کے دیگر پانچ ارکان کی ہم نوائی میں قائم مقام امیر جماعت اسلامی پاکستان کے نام تحریر کیا تھا' سابقہ 'اتفاق' کی طرح اس 'اتفاق' کا بھانڈا بھی چوراہے میں پھوٹ کر رہا۔ اس لیے کہ اس قسم کی مصنوعی مصالحتیں شاید اصلاحی وسماجی انجمنوں اور سیاسی جماعتوں مُں تو کسی درے میں قابل عمل ہوں' کسی انقلابی تحریک میں ہرگز ممکن العمل نہیں ہوسکتیں۔

چنانچہ مولانا مودودی مرحوم نے اپنی چھ گھنٹے سے زائد لمبی تقریر میں اپنے' اور اپنے ہم خیال ارکانِ شوریٰ کے ذہن کی نمائندگی تو بہ تمام وکمال ----- اور بہ حسن وخوبی کردی' لیکن اس سے بالواسطہ طور پر جماعت کی پالیسی کے بارے میں اختلافی ذہن رکھنے والے ارکانِ شوریٰ کے خیالات اور نظریات کی کامل نفی ہوگئی (مولانا مودودی کی یہ تقریر کامل طبع شدہ موجود ہے' لہٰذا اس کے ضمن میں مزید کچھ عرض کرنے کی چنداں حاجت نہیں ہے)

مولانا اصلاحی کا خطاب

اس کے فطری ردّ عمل کے طور پر مولانا امین احسن اصلاحی اٹھے اور انہوں نے اصولی طور پر قرارداد کی مکمل تصویب وتائید کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا کہ اس کے بعد ''مضمرات اور مقدرات'' مولانا مودودی کی تقریر میں بیان ہونے سے رہ گئے ہیں جنہیں بیان کیا جانا ضروری ہے۔ یہ ''مضمرات اور مقدرات'' ظاہر ہے کہ اصلاً اُن کے اس حملے کے منطقی نتائج تھے جس کا اضافہ اُن کے اصرار پر اِس قرارداد میں ہوا تھا' اور واقعہ یہ ہے کہ یہ مولانا اصلاحی کی ذہانت اور فطانت کا نہایت حیران کن مظہر تھا کہ انہوں نے ایک طویل قرارداد میں گنتی کے چند الفاظ کے اضافے سے اپنے پورے فکری اختلاف کو سمو دیا تھا۔ بہر حال اب جو مولانا اصلاحی نے اُن ''مضمرات اور مقدرات'' کو بیان کرنا شروع کیا تو مولانا مودودی کے موقف اور نظریئے کی کامل تردید ہوگئی اور گویا ایک 'دعویٰ' (Thesis) کے مقابلے میں ''جوابِ دعویٰ'' (Anti-Thesis) پوری آب وتاب اور کامل شان وشوکت کے ساتھ سامنے آ گیا۔

مولانا اصلاحی کی یہ تقریر جہاں دلائل وبراہین سے مسلح' اور شکوہِ الفاظ اور حسن بیان سے مرصع

اور مسجع تھی، وہاں جذبہ و جوش کا مظہر اتم اور حسن خطابت کا اعلیٰ مرقع بھی تھی-----افسوس کہ فکر صحیح اور فن خطابت کا یہ شاہکار امتزاج ریگستانِ بہاولپور کی خاموش فضاؤں میں تحلیل ہو کر رہ گیا۔ اور اب اُس کا مکمل ریکارڈ تو دُور رہا، اُس کے مضمون کا خلاصہ بھی صفحۂ ہستی سے ناپید ہو چکا ہے (اگرچہ ہمیں یقین ہے کہ قیامت کے دن مولانا کا یہ بیان جماعت کی قیادت کے خلاف بہت بڑے الزام اور حجت کے طور پر پیش ہوگا!)......کاش کہ جماعت نے اسے محفوظ رکھا ہوتا تو خواہ اُس وقت ان کا موقف ردّ کر دیا گیا تھا' بعد میں مزید غور و فکر اور نظر ثانی کا امکان تو باقی رہتا اور اگر بالفرض اس کی نوبت بھی نہ آتی تو آنے والی نسلوں کو تو معلوم ہوسکتا کہ تاریخ جماعت اسلامی کے اس اہم موڑ پر کس نے کیا کہا تھا اور کس کا موقف کیا تھا؟......اور یہ صورت تو نہ ہوتی کہ

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغبان

بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد؟

کے مصداق کسی کو کچھ معلوم نہیں-----لیکن ''اے بسا ارزو کہ خاک شدہ!''

جہاں تک یادداشت کام کرتی ہے' مولانا اصلاحی کی پوری تقریر ایک لفظ یعنی ''توازن'' کے گرد گھومتی تھی جو خود مولانا مودودی کی مرتب کردہ قرارداد کے اصل متن میں بھی شامل تھا۔ البتہ مولانا اصلاحی نے اُس میں جس جملے کا اضافہ کرایا تھا اس سے وہ زیادہ مؤکد بھی ہو گیا تھا اور اس نے گویا پورے لائحہ عمل کے لیے محافظ اور مہیمن کی صورت اختیار کر لی تھی۔

قرارداد اور اس کی ترمیمیں

مولانا مودودی نے اپنی قرارداد کی بناء اس لائحہ عمل پر قائم کی تھی جو انہوں نے ۱۹۵۱ء کے سالانہ اجتماع کے موقع پر پیش کیا تھا۔ اور جس پر اصولی اعتبار سے جماعت اُس وقت سے عمل پیرا تھی-----یہ لائحہ عمل چار اجزاء پر مشتمل تھا-----یعنی (۱) افکار کی تطہیر اور تعمیر نو۔ (۲) صالح افراد کی تلاش و تنظیم و تربیت۔ (۳) اجتماعی اصلاح کی سعی (یعنی

اصلاحِ معاشرہ) اور (۴) نظامِ حکومت کی اصلاح۔

جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲۵/نومبر تا ۱۰ دسمبر ۱۹۵۶ء میں جو قرارداد منظور کی تھی اس کی شق نمبر۲ ان الفاظ پر مشتمل تھی:

''۲ -----مجلس شوریٰ کی رائے میں جو لائحہ عمل ۱۹۵۱ء کے اجتمعِ عام منعقدہ کراچی میں پیش کیا گیا تھا اور جواب تک جماعت اسلامی کا لائحہ عمل ہے وہ اصولاً بالکل درست ہے اس کو برقرار رہنا چاہیے۔ لیکن مجلس شوریٰ یہ محسوس کرتی ہے کہ دستورِ اسلامی کی پیہم جدوجہد کی وجہ سے لائحہ عمل کے پہلے تین اجزاء کے لیے خاطر خواہ کام نہیں ہوسکا ہے اور اس کے باعث ہمارے بنیادی کام میں بہت بڑی کسر رہ گئی ہے۔ اس لیے مجلس کی متفقہ رائے یہ ہے کہ جماعت کی بنیادی دعوت اور لائحہ عمل کے پہلے تین اجزاء کی طرف اب پوری توجہ اور کوشش صَرف کرنے کی ضرورت ہے اور اس بِنا پر سردست کسی انتخابی مہم کے لیے کام کرنا قبل از وقت ہوگا۔ البتہ اسلامی اقدار کے قیام و بقا اور دستورِ اسلامی کے تحفظ' اصلاح اور نفاذ کے لیے ناگزیر اقدامات سے دریغ نہ ہونا چاہیے''۔

قرارداد ماچھی گوٹھ میں مولانا مودودی نے نہ صرف یہ کہ اس پورے قضیے کو بالکل گول کر دیا' بلکہ ایک قدم آگے بڑھا کر سارا زور ''قیادت کی تبدیلی'' پر مرکوز کر دیا......اور مخالف ذہن کی تسلی اور اطمینان کے لیے صرف اس اصولی اور مبہم بات پر اکتفا کی کہ:

''اس موقع پر ایک صالح قیادت کو بروئے کار لانے کے لیے صحیح طریق کار یہ ہے کہ اس لائحہ عمل کے چاروں اجزاء پر توازن کے ساتھ اس طرح کام کرتے ہوئے آگے بڑھا جائے کہ ہر جزو کا کام دوسرے جزو کے لیے موجب تقویت ہو!''۔

مولانا امین احسن اصلاحی نے اسی ''توازن'' پر مورچہ لگاتے ہوئے قرارداد میں اس مقام پر ان الفاظ کا اضافہ کرایا تھا کہ:

''اور جتنا کام پہلے تین اجزاء میں ہوتا جائے اسی نسبت سے ملک کے سیاسی نظام میں دینی نظام کے حامیوں کا نفوذ و اثر عملاً بڑھتا چلا جائے''۔

چنانچہ اب ارکانِ جماعت کے اجتماعِ عام میں جب مولانا اصلاحی نے اپنے اس جملے کے

’’مضمرات اور مقدرات‘‘ کو کھول کر بیان کیا تو ان کی پوری تقریر عملاً دسمبر ۵۶ء کی قرارداد شوریٰ کی مندرجہ بالا شق نمبر ۲ کی تشریح و تفسیر بن گئی(۱)

اور اس طرح جماعت کے سوچنے سمجھنے والے لوگوں یا اصحابِ حل و عقد کے مابین جماعت کی پالیسی اور طریق کار کے بارے میں جو متضاد خیالات اور نظریات ایک عرصے سے پروان چڑھ رہے تھے' اور جن کی سرے سے کوئی خبر یا اطلاع جماعت کے اراکین کی عظیم اکثریت کو نہیں تھی اچانک ایک بھیانک تضاد کی صورت میں اجتماع ارکان کے سامنے آ گئے۔ چنانچہ پورا مجمع ایسے ہو گیا جیسے اُسے سانپ سونگھ گیا ہو' اور جملہ اراکین جماعت پر ایک حالت منتظرہ طاری ہو گئی کہ

دیکھئے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبد نیلو فری رنگ بدلتا ہے کیا!

نعیم صدیقی صاحب کی جانب سے مولانا اصلاحی کا تعاقب

اس پر ’’جوابِ آں غزل‘‘ کے انداز میں ارکان مجلس شوریٰ میں مولانا مودودی کے موقف اور نقطۂ نظر کے سب سے بڑے حامی اور طریق کار اور پالیسی کے ضمن میں مولانا کے خیالات کے سب سے بڑے ترجمان جناب نعیم صدیقی اُٹھے اور انہوں نے ایک بھرپور تقریر میں ’’توازن‘‘ کے اس ’’ہیضے‘‘ کو ’’ذہنی عدمِ توازن‘‘ کا مظہر اور شاخسانہ قرار دیا اور گویا مولانا اصلاحی اور ان کے ہم خیال لوگوں کو خللِ دماغی کے عارضہ میں مبتلا ----- یعنی ذاتی ذہنی مریض قرار دے دیا ----- نفس مضمون سے قطع نظر' نعیم صدیقی صاحب کی تقریر بھی ایک جانب نہایت مرتب اور مربوط بھی تھی' اور دوسری جانب فصاحب و بلاغت کا

(۱): اس مرحلہ پر مولانا اصلاحی کا ایک یادگار جملہ تو نقل کئے بغیر آگے بڑھنے پر طبیعت ہرگز آمادہ نہیں ہے جو راقم کو حرف بحرف یاد ہے۔ مولانا نے انقلاب قیادت کی جدوجہد کے ضمن میں اس چار نکاتی لائحہ عمل کے چاروں اجزاء کے مابین ’توازن‘ برقرار رکھنے کی اہمیت کے سلسلے میں فرمایا کہ:
’’اگر اس کے بغیر آپ کبھی کسی الٹی سیدھی تدبیر سے قیادت کے منہ زور گھوڑے پر سوار ہونے میں کامیاب ہو گئے تو یہ ایسی دولتی رسید کرے گا کہ قیادت و سیادت کا سارا نشہ ہرن ہو جائے گا!‘‘

عمدہ نمونہ تھی۔ اور اگر چہ راقم الحروف کی یہ رائے اپنے زمانہ طالب علمی ہی کے دوران پختہ ہو چکی تھی کہ نعیم صاحب نے اپنے اندازِ تقریر میں ایک حد تک مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی دونوں کے اسلوب خطاب کی خوبیوں کو جمع کر لیا ہے' چنانچہ اُن کی تقریر میں مولانا مودودی کا سا ربط و تسلسل بھی ہوتا ہے اور مولانا اصلاحی کا سا خطیبانہ انداز بھی' تاہم اُن کی اس تقریر کے بارے میں یہ باور کرنا میرے لیے بھی مشکل تھا کہ وہ فی الفور یعنی ارتجالاً (Extempore) کی گئی تھی ----- اور اسے قارئین خواہ میرے سوءِ ظن پر محمول کر لیں' خواہ انگریزی محاورے (Too Good To Believe) کے مطابق اندازِ تحسین پر' بہر حال تقریر کا انداز تو اِسی کی غمازی کر رہا تھا کہ اسے پہلے ہی سے خوب اچھی طرح تیار کیا گیا تھا (واللہ اعلم !!)

اس کا نتیجہ وہی نکلا جو منطقی طور پر نکلنا چاہیے تھا ----- یعنی وہ بحران جس نے مولانا اصلاحی کی تقریر کے بعد ایک سکتہ بلکہ سکوت مرگ کی سی کیفیت اختیار کر لی تھی نعیم صاحب کی تقریر کے بعد ایک ہیجان کی صورت اختیار کر گیا۔ اور تھوڑی دیر کے لیے تو یوں محسوس ہوا کہ جیسے پورے مجمعے نے دو متحارب گروپوں کی صورت اختیار کر لی ہے۔

مولانا مودودی کی جانب سے دعوتِ مبارزت

اس ہیجانی اور طوفانی کیفیت میں مولانا مودودی دوبارہ سٹیج پر آئے اور انہوں نے اولاً اپنے مخصوص دھیمے اور پُرسکون انداز میں مولانا اصلاحی کے اعتراضات اور دلائل کا ردّ کیا اور تان اس پر توڑی کہ اگر اس قرار داد سے یہ مطالب بھی اخذ کئے جا رہے ہیں' یا ان ''مقدرات و مضمرات'' کو بھی مستنبط کیا جا رہا ہے تو میں اس کے سد باب کے لیے اس میں ابھی ترمیم کئے دیتا ہوں تا کہ آئندہ کے لیے کسی ابہام یا اشتباہ کا امکان ہی باقی نہ رہے ----- چنانچہ انہوں نے قرارداد میں مولانا اصلاحی کے اصرار پر اضافہ شدہ الفاظ کے فوراً بعد ان الفاظ کا اضافہ کر دیا کہ:

''مگر یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ توازن قائم نہ رہنے کو کسی وقت بھی اس لائحہ عمل کے کسی جزو کو ساقط یا معطل یا مؤخر کر دینے کے لیے دلیل نہ بنایا جا سکے گا!''۔

اسے عوامی اندازِ بیان میں یوں تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ اس طرح مولانا مودودی نے مولانا اصلاحی کے نہلے پر دہلا دے مارا‘ اور بھرے مجمعے میں مولانا اصلاحی کو دعوتِ مبارزت دیدی کہ اگر ہمت اور سکت ہے تو مقابلے میں آ جاؤ‘ اور اِس قرارداد سے اپنا اتفاق واپس لیتے ہوئے کوئی متبادل قرارداد یا قراردادِ عدم اعتماد لے کر سامنے آؤ تا کہ آٹے دال کا بھاؤ بھی معلوم ہو جائے‘ اور یہ بات بھی کھل جائے کہ کون کتنے پانی میں ہے! گویا (غالب کے مصرعے میں قدرِ قلیل تبدیلی کے ساتھ) ”آؤ یہ گوئے ہے‘ اور یہ میدان!“

مولانا مودودی کی جانب سے اس واضح چیلنج کے بعد کے چند لمحات نہ صرف اجتماعِ ماچھی گوٹھ بلکہ جماعت اسلامی کی پوری تاریخ کے لیے فیصلہ کن موڑ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ مولانا مودودی نے ایک بار پھر اپنے مزاج کی مستقل ساخت‘ یا گزشتہ چند مہینوں کے دوران میں ظاہر ہونے والے حالات و واقعات کی بنا پر پیدا شدہ ”تنگ آمد بجنگ آمد‘ کی فوری اور وقتی کیفیت کے تحت ایسا قدم اٹھا دیا تھا جس سے نہ صرف یہ کہ دستورِ جماعت کی روح بُری طرح مجروح ہو رہی تھی بلکہ معقولیت کے جملہ تقاضے بھی پامال ہو کر رہ گئے تھے۔ اور ایسی صورت پیدا ہو گئی تھی کہ اگر اُس وقت مولانا اصلاحی بھی اپنی راجپوتی آن اور شان کا مظاہرہ کرتے تو اغلباً جماعت کی مکمل تباہی ورنہ کم از کم اِس کا دو حصوں میں تقسیم ہو جانا لازمی و لابدی تھا۔

صورتِ حال کا تجزیہ

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اگر مولانا مودودی کا ذہن اِس قدر یکسو تھا تو انہیں اپنی قرارداد میں مولانا اصلاحی کیے اضافے کو ہرگز قبول نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس صورت میں اجتماع ماچھی گوٹھ کی کارروائی اُسی رخ پر چلتی جس کی نشان دہی ہم‘ چند اراکین جماعت اسلامی منٹگمری نے کی تھی‘ یعنی مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی اپنی اپنی قراردادیں لے کر ارکان کے سامنے آتے اور اپنے اپنے نقطۂ نظر کی کماحقہٗ وضاحت کرتے اور ارکانِ جماعت علیٰ وجہ البصیرت کسی ایک راہ کو اختیار کر لیتے۔ لیکن جب انہوں نے مولانا اصلاحی کی

ترمیم کو قبول کر لیا تو اب وہ قرارداد اُن کی ذاتی نہیں رہی تھی بلکہ نہ صرف اُن کی اور مولانا اصلاحی کی، بلکہ دستورِ جماعت کی رو سے امیر جماعت اور مجلس شوریٰ کی متفق علیہ قرارداد بن گئی تھی ----- اور مولانا اصلاحی کی تقریر کے بعد اگر انہیں یہ احساس ہوا تھا کہ مولانا اصلاحی کا اضافہ انہوں نے سہواً اور اس کے ''مضمرات اور مقدرات'' کے شعور وادراک کے بغیر قبول کر کے غلطی کی تھی تو ان کے لیے صاف اور سیدھا، اور نہ صرف معقولیت بلکہ شرافت اور مروّت پر مبنی راستہ یہ تھا کہ اجتماعِ ارکان کو تھوڑی دیر کے لیے ملتوی کر کے مرکزی مجلس شوریٰ کا اجلاس منعقد کرتے اور اس میں اپنی مجوزہ ترمیم پیش کرتے، پھر اگر مولانا اصلاحی اور اُن کے ہم خیال لوگ بھی اسے قبول کر لیتے تو فبہا ورنہ مولانا اصلاحی کے لیے پورا موقع موجود ہوتا کہ ٹھنڈے دل کے ساتھ از سرِ نو غور کر کے اپنا آئندہ کا لائحہ عمل طے کر لیں، پھر خواہ وہ خاموشی اختیار کرتے، جیسے کہ انہوں نے اجتماع ارکان میں کی، خواہ خم ٹھونک کر میدان میں آ جاتے اور وہ طرزِ عمل اختیار کرتے جو بعد میں خود انہوں نے اپنے گشتی مراسلے میں ان الفاظ میں بیان کیا کہ ''میں نے شوریٰ کو بتایا کہ اگر آپ لوگ اس قرارداد کو اجتماعِ عام میں لائیں گے تو میں دسمبر والی شوریٰ کی (متفق علیہ) قرارداد جماعت کے سامنے پیش کروں گا اور امیر جماعت اور ان کے اصحاب نے اس قرارداد کو دفن کرنے کے لیے جو مہمیں چلائی ہیں اور جو اقدامات کیے ہیں وہ سب اجتماعِ عام (ارکان) میں بیان کروں گا ----- میری تقریر کے وقت میرے ہاتھ میں قرآن ہوگا اور میں اپنے داہنے امیر جماعت کو بٹھاؤں گا اور بائیں قائم مقام امیر جماعت چودھری غلام محمد صاحب کو، اور یہ دونوں حضرات میری جس بات کو کہہ دیں گے کہ جھوٹ ہے میں بغیر کسی حجت کے اسے واپس لے لوں گا''۔ دونوں صورتوں میں ذمہ داری مولانا اصلاحی کی ہوتی اور مولانا مودودی پر کوئی حرف نہ آتا۔

لیکن اس صاف اور سیدھے راستے کو چھوڑ کر جو طرزِ عمل مولانا مودودی نے اختیار کیا، یعنی یہ کہ مجلس شوریٰ کو نظر انداز ہی نہیں، گویا اس کے وجود ہی کی نفی کرتے ہوئے پورے قضیے کو اچانک ایسے ارکان کے اجتماع عام میں پیش کر دیا جن کی عظیم اکثریت نہ صرف یہ کہ پالیسی اور طریق کار کے ضمن میں اختلافِ رائے سے اس روز سے قبل تک قطعاً ناواقف تھی،

بلکہ ان تلخ اور تکلیف دہ' بلکہ نا گفتہ بہ حالات و واقعات سے تو سرے سے بے خبر محض تھی جو دسمبر ۵۶ء اور جنوری ۵۷ء میں جماعت کے بعض حلقوں (بالخصوص لاہور' لائل پور اور راولپنڈی) میں رونما ہوئے تھے ...... تاکہ ایک ناواقف اکثریت سے محض اپنی ذات مقبولیت کے بل پر حسب منشا فیصلہ حاصل کیا جاسکے...... یہ طرزعمل مولانا مودودی نے اگر نادانستہ اور غیر شعوری طور پر اختیار کیا تب بھی اسے نہ صرف جماعت اسلامی بلکہ ملت اسلامیہ پاکستان کی بدقسمتی بلکہ شامت اعمال قرار دیا جائے گا' اور اگر خوب سوچ بچار کے بعد جان بوجھ کر مصلحتاً اختیار کیا تب تو اسے میکیاویلی سیاست کے شاہکار سے کم کوئی نام دیا ہی نہیں جا سکتا اور اس کی کوئی نظیر کم از کم ماضی قریب کی تاریخ میں تو سوائے قادیانیت کی تاریخ کے اس واقعے کے اور کہیں نہیں مل سکتی' کہ جب حکیم نورالدین کے انتقال کے بعد نئی خلافت کے تصفیے کے ضمن میں قادیانی گروہ ک اُس مرکزی مشاورتی ادارے نے' جو آغاز سے اس وقت تک بالکل جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ ہی کے مانند' آخری بااختیار ادارہ رہا تھا' مرزا بشیرالدین محمود احمد کی بجائے' اور اُس کی بھرپور کوشش کے علی الرغم' مولوی محمد علی لاہوری کے حق میں فیصلہ کر دیا تو مرزا محمود نے جیسے بھی بن پڑا معاملہ مجلس عامہ (جنرل باڈی) میں پیش کرا کے ایک ہیجانی اور جذباتی ماحول میں' ناواقف اور ناکندہ تراش لوگوں کی اکثریت سے اپنے حق میں فیصلہ حاصل کر لیا تھا۔

دوسری طرف جب مولانا اصلاحی نے مولانا مودودی کی اس 'مبارزت' کے جواب میں نہ کوئی احتجاج کیا' نہ شوریٰ کے اجلاس کا انعقاد کا مطالبہ کیا' نہ ترمیم شدہ قرارداد سے اپنا 'اتفاق' واپس لے کر کوئی متبادل قرارداد پیش کی' بلکہ نہ صرف یہ کہ خود کامل سکوت اختیار کیا' بلکہ جب بعض دوسرے ارکانِ شوریٰ (جیسے مولانا عبدالغفار حسن) نے بولنا چاہا تو اُن پر بھی اپنے اثر اور رسوخ کو استعمال کر کے انہیں چپ کرا دیا' تو اِس طرزعمل کو بھی کسی طرح نہ درست قرار دیا جا سکتا ہے' نہ اس دستور کی روح کے مطابق جس کی دہائی انہوں نے اُس وقت تک بھی بار ہا دی تھی۔ اور بعد میں تو اپنے تمام شکوؤں اور شکایتوں کو اُسی پر مبنی قرار دیا۔

مولانا اصلاحی کے اس طرزِ عمل کو کسی معتدل اور متوازن یا درمیانہ اور اوسط موقف پر

مبنی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بلکہ اُس کے بارے میں دو انتہائی آراء میں سے ایک کو اختیار کیے بغیر چارہ نہیں ہے----- یعنی یا تو اسے انتہائی بزدلی کا مظہر، اور اس خوف پر مبنی قرار دیا جا سکتا ہے کہ اس وقت اگر مولانا مودودی کو براہِ راست چیلنج کرنے کی روش اختیار کی تو اس میں بھی کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی کہ باضابطہ 'پٹائی' ہو جائے (اس لیے کہ صوبہ سرحد سے تعلق رکھنے والے ارکانِ جماعت کے تیور اُس وقت بلا شبہ اسی انداز کے تھے) بصورتِ دیگر بھی شکست فاش اور اس کے نتیجے میں رسوائی اور جگ ہنسائی قطعاً یقینی ہے----- یا پھر دوسری جانب مولانا کے طرزِ عمل کو جماعت کے ساتھ انتہائی خلوص و اخلاص، اور خود مولانا مودودی کے ساتھ کم از کم ناگزیر حد تک حسن ظن کے برقرار رہنے پر مبنی قرار دیا جا سکتا ہے-----
ان میں سے جہاں تک مقدم الذکر توجیہہ کا تعلق ہے وہ مولانا کے نسلی پس منظر (مولانا نسلاً راجپوت ہیں) اور خود ذاتی مزاج اور سب سے بڑھ کر ایک سال بعد کے طرزِ عمل کے پیش نظر قابل قبول نظر نہیں آتی۔ رہی مؤخر الذکر توجیہہ تو اس کا حصہ اول تو حسن ظن کی بنا پر قبول کیا جا سکتا ہے، لیکن دوسرا جزو اُس خط کے پیش نظر ہرگز کسی بھی درجے میں قابل قبول نہیں ہے جو تقریباً دو ماہ قبل ارکانِ جائزہ کمیٹی کے خلاف مولانا مودودی کے الزام نامے کے جواب میں مولانا اصلاحی نے تحریر کیا تھا! (اس خط میں 'اگر مگر' کے پردوں میں اگر کوئی بات مخفی رہ بھی گئی تھی تو ایک سال بعد رکنیت جماعت سے مستعفی ہونے کے بعد جو خط و کتابت مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے مابین ہوئی اس نے تو ع ''پر شب کی منتوں نے تو کھو دی رہی سہی!'' کے مصداق اگلے پچھلے سارے ہی پردے فاش کر دیئے)

ان دونوں انتہاؤں کے مابین صرف ایک ہی ممکن توجیہہ باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ مولانا مودودی کے اس اچانک حملے سے مولانا اصلاحی بالکل بھونچکے ہو کر رہ گئے ہوں اور ان کی قوتِ فیصلہ فوری طور پر مفلوج ہو گئی ہو----- اور بہتر یہی ہے کہ اصل حقیقت کو ''يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ'' پر ملتوی کر کے فی الوقت یہی گمان کیا جائے کہ مولانا اصلاحی کے طرزِ عمل کا اصل سبب یہی تھا، واللہ اعلم۔

☆ ☆ ☆

ماچھی گوٹھ کے اجتماعِ ارکان کا اصل اور فیصلہ کن حصہ تو وہی تھا جو بیان ہو گیا باقی تو محض قواعد وضوابط کی خانہ پُری اور صرف بھرتی کی کارروائی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ راقم کو بالکل یاد نہیں آ رہا کہ مولانا مودودی کی جانب سے اس ترمیم شدہ قرارداد کے دوبارہ پیش ہو جانے کے بعد اس کے حق میں یا اس سے اتفاق کے علی الرغم کسی قدر قیل وقال پر مشتمل کوئی اور تقریر ہوئی تھی یا نہیں۔ ایک گمان سا گمان ہوتا ہے کہ شاید جناب مصطفیٰ صادق کی تقریر بھی اسی مرحلے پر ہوئی ہو اس لیے کہ انہوں نے اصل قرارداد سے کامل اتفاق کرتے ہوئے اس سے ''عملی انحراف'' کی چند نہایت نمایاں مثالیں پیش کی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی تقریر کی اس ماحول میں بھی کافی پذیرائی ہوئی تھی' تاہم اپنی نوعیت کے اعتبار سے وہ بھی بعض دوسری تقاریر سے مشابہ تھی لہٰذا اس کا ذکر اُن ہی کے ساتھ مناسب ہوگا!

یہ بھی اب اچھی طرح یاد نہیں ہے کہ مولانا مودودی کی اس قرارداد پر رائے شماری کس مرحلے پر ہوئی' قیاس بھی یہی کہتا ہے اور گمان غالب بھی یہی ہے کہ رائے شماری اس قرارداد میں ترمیم کی تجویز پر مشتمل قراردادوں اور بالکل جداگانہ اور متبادل قراردادوں کے پیش ہونے کے بعد ہی ہوئی ہو گی۔ پھر چونکہ اس رائے شماری کے اعداد وشمار کا بھی کوئی دوسرا ریکارڈ موجود نہیں ہے' لہٰذا حسن ظن کے تقاضے پر مستزاد مجبوری بھی ہے' اور ماچھی گوٹھ کے حالات کے اعتبار سے قرین قیاس بھی' کہ ''تحریک اسلامی کے آئندہ لائحہ عمل'' نامی کتاب کے دیباچہ میں وارد شدہ اس بیان کو تسلیم کیا جائے کہ ''ارکان جماعت میں سے ۹۲۰ نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی پیش کردہ قرارداد کے حق میں اور صرف ۱۵ نے اس کے خلاف رائے دی۔ اس طرح یہ قرارداد جماعت کی ۹۸ فی صد سے بھی زیادہ اکثریت سے پاس کی گئی''۔ (صفحہ ۴)

آگے بڑھنے سے قبل اس قرارداد کا مکمل متن مع جملہ ترامیم بھی سامنے آ جائے تو بہتر ہے وھو ھٰذا:

''جماعت اسلامی پاکستان اس امر پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتی ہے کہ اب سے پندرہ سال قبل جس نصب العین کو سامنے رکھ کر' اور جن اصولوں کی پابندی کا عہد کر کے اس

نے سفر کا آغاز کیا تھا' آج تک وہ اسی منزل مقصود کی طرف انہیں اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ اس طویل اور کٹھن سفر کے دوران میں اگر اس سے اقامت دین کے مقصد کی کوئی خدمت بن آتی ہے تو وہ سراسر اللہ کا فضل ہے جس پر وہ اپنے رب کا شکر ادا کرتی ہے' اور اگر کچھ کوتاہیاں اور لغزشیں سرزد ہوئی ہیں تو وہ اس کے اپنے ہی قصور کا نتیجہ ہیں جن پر وہ اپنے مالک سے عفو و درگزر اور مزید ہدایت و توفیق کی دعا کرتی ہے۔

جماعت اسلامی اس بات پر مطمئن ہے کہ تحریک اسلامی کا جو لائحہ عمل نومبر ۱۹۵۱ء میں ارکان کے اجتماعِ عام منعقدہ کراچی میں امیر جماعت نے مجلس شوریٰ کے مشورے سے پیش کیا تھا وہ بالکل صحیح توازن کے ساتھ مقصد تحریک کے تمام نظری اور عملی تقاضوں کو پورا کرتا ہے' اور وہی آئندہ بھی اس تحریک کا لائحہ عمل رہنا چاہیے۔

اس لائحہ عمل کے پہلے تین اجزاء (یعنی تطہیر افکار و تعمیر افکار' صالح افراد کی تلاش و تنظیم و تربیت اور اجتماعی اصلاح کی سعی) تو جماعت اسلامی کی تشکیل کے پہلے ہی دن سے اس کے لائحہ عمل کے اجزاء لازم رہے ہیں' البتہ ان کو عمل میں لانے کی صورتیں حالات و ضروریات کے لحاظ سے اور جماعت کے وسائل و ذرائع کے مطابق بدلتی رہی ہیں۔ ان کے بارے میں جماعت اب یہ طے کرتی ہے کہ آئندہ کوئی دوسرا جماعتی فیصلہ ہونے تک ان تینوں اجزاء کو اُس پروگرام کے مطابق عملی جامہ پہنایا جائے جو اس قرارداد کے ساتھ بطور ضمیمہ شامل کیا جا رہا ہے۔ نیز جماعت کا یہ اجتماع عام مجلس شوریٰ' اور تمام حلقوں' اضلاع اور مقامات کی جماعتوں کو ہدایت کرتا ہے ہ وہ اس پروگرام پر اس حد تک زور دیں کہ لائحہ عمل کے چوتھے جزو کے ساتھ جماعت کے کام کا ٹھیک توازن قائم ہو جائے اور قائم رہے۔

اس لائحہ عمل کا چوتھا جزو نظامِ حکومت کی اصلاح سے متعلق ہے' درحقیقت وہ بھی ابتداء ہی سے جماعت اسلامی کے بنیادی مقاصد میں شامل تھا۔ جماعت نے ہمیشہ اس سوال کو زندگی کے عملی مسائل میں سب سے اہم اور فیصلہ کن سوال سمجھا ہے کہ معاملات زندگی کی زمام کار صالحین کے ہاتھ میں ہے یا فاسقین کے ہاتھ میں' اور حیاتِ دنیا میں امامت و رہنمائی کا مقام خدا کے مطیع فرمان بندوں کو حاصل ہے یا اس کی اطاعت سے آزاد رہنے والوں کو۔ جماعت کا نقطۂ نظر ابتداء سے یہ ہے کہ

اقامت دین کا مقصد اُس وقت تک پورا نہیں ہوسکتا جب تک اقتدار کی کنجیوں پر دین کا تسلط قائم نہ ہوجائے۔ اور جماعت ابتداء ہی سے یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھتی ہے کہ دین کا یہ تسلط یک لخت کبھی قائم نہیں ہوسکتا' بلکہ یہ ایک تدریجی عمل ہے جو غیر دینی نظام کے مقابلے میں دینی نظام چاہنے والوں کی پیہم کشمکش اور درجہ بدرجہ پیش قدمی سے ہی مکمل ہوا کرتا ہے۔ جماعت اسلامی نے اس مقصد کے لیے تقسیم ہند سے پہلے اگر عملاً کوئی اقدام نہیں کیا تھا تو اس کی وجہ مواقع کا فقدان اور ذرائع کی کمی بھی تھی اور یہ وجہ بھی تھی کہ اس وقت کے نظام میں اس مقصد کے لیے کام کرنے میں بعض شرعی موانع تھے۔ قیام پاکستان کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے مواقع اور ذرائع دونوں فراہم کردیئے اور شرعی موانع کو دُور کرنے کے امکانات بھی پیدا کردیئے تو جماعت نے اپنے لائحہ عمل میں اس چوتھے جزو کو بھی' جو اس کے نصب العین کا ایک لازمی تقاضا تھا' شامل کرلیا۔ اس میدان میں دس سال کی جدوجہد کے بعد اب غیر دینی نظام کی حامی طاقتوں کے مقابلے میں دینی نظام کے حامیوں کی پیش قدمی ایک اہم مرحلے تک پہنچ چکی ہے۔ ملک کے دستور میں دینی نظام کے بنیادی اصول منوائے جاچکے ہیں۔ اور ان منوائے ہوئے اصولوں کو ملک کے نظام میں عملاً نافذ کرانے کا انحصار اب قیادت کی تبدیلی پر ہے۔ اس موقع پر ایک صالح قیادت بروئے کار لانے کے لیے صحیح طریق کار یہ ہے کہ اس لائحہ عمل کے چاروں اجزاء پر توازن کے ساتھ اس طرح کام کرتے ہوئے آگے بڑھا جائے کہ ہر جزو کا کام دوسرے جزو کے لیے موجب تقویت ہو' اور جتنا کام پہلے تین اجزاء میں ہوتا جائے' اسی نسبت سے ملک کے سیاسی نظام میں دینی نظام کے حامیوں کا نفوذ واثر عملاً بڑھتا چلا جائے۔ مگر یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ توازن قائم نہ رہنے کو کسی وقت بھی اس لائحہ عمل کے کسی جزو کو ساقط یا معطل یا مؤخر کردینے کے لیے دلیل نہ بنایا جاسکے گا۔

علاوہ بریں چونکہ جماعت اسلامی اپنے دستور کی رو سے اپنے پیش نظر اصلاح و انقلاب کے لیے جمہوری و آئینی طریقوں پر کام کرنے کی پابند ہے' اور پاکستان میں اس اصلاح وانقلاب کے عملاً رونما ہونے کا ایک ہی آئینی راستہ ہے' اور وہ ہے انتخابات کا راستہ' اس لیے جماعت اسلامی ملک کے انتخابات سے بے تعلق تو بہر حال نہیں رہ سکتی' خواہ وہ ان میں بلاواسطہ حصہ لے یا بالواسطہ یا دونوں طرح۔ رہا یہ

امر کہ انتخابات میں کس وقت ان تینوں طریقوں میں کس طریقے سے حصہ لیا جائے' اس کو جماعت اپنی مجلس شوریٰ پر چھوڑتی ہے تاکہ وہ ہر انتخاب کے موقع پر حالات کا جائزہ لے کر اس کا فیصلہ کرے''۔

مؤلف کی متبادل قرارداد اور اس کا حشر

اگر یہ بات کسی درجے میں بھی درست ہے کہ

ایک ہنگامے پر موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی' نغمۂ شادی نہ سہی!

تو واقعہ یہ ہے کہ اجتماعِ ماچھی گوٹھ میں اصل رونق اس خاکسار کی قرارداد اور تقریر سے پیدا شدہ ''ہنگامے'' کے باعث ہوئی' اور

گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو!

کے مصداق اس اجتماع کو اصل رنگ راقم کے لہو ہی نے فراہم کیا۔ اس لیے کہ راقم اگرچہ تا حال فیض' کے ان دو اشعار کا ''مصداق کامل'' تو نہیں بن سکا کہ

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے سو گزری
تنہا پسِ زنداں' کبھی رسوا سرِ بازار
گرجے ہیں بہت شیخ سرِ گوشۂ منبر
کڑکے ہیں بہت اہل حکم برسرِ دربار!

تاہم اجتماع ماچھی گوٹھ کے دوران وہ ان کا نصف مصداق ضرور بن گیا۔ چنانچہ سرِ بازار رسوائی بھی پوری شدت سے ہوئی' اور ایک داعی اسلام اور قائد تحریک اسلامی کی سرِ عام مخالفت کا ہدف بھی بننا پڑا۔ بلکہ میں آج بھی سوچتا ہوں تو قسمت کی اس ستم ظریفی پر یران ہو کر رہ جاتا ہوں کہ اُس وقت حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ مجھے پچیس سال سے بھی کم عمر میں چار و ناچار ایک ایسے شخص کے مد مقابل کی حیثیت سے کھڑا ہونا پڑا' جسے میں اُس وقت تو اپنا مرشد و ہادی سمجھتا تھا' آج بھی کم از کم محسن ضرور سمجھتا ہوں۔ اور جو علم و فضل' اور

شہرت و وجاہت سے قطع نظر عمر میں بھی میرے والد کے برابر تھا (مولانا مودودی مرحوم اور میرے والد شیخ مختار احمد مرحوم‘ دونوں کا سن پیدائش ۱۹۰۳ ہے) ----- تاہم اس شدید احساس کے باوجود کہ ع ’’یہ آج تری دنیا میں ہمیں تقدیر کہاں لے آئی ہے؟‘‘ راقم اُس وقت بھی مطمئن تھا اور اب بھی مطمئن ہے کہ یہ صورت اس کے لیے نہ پسندیدہ تھی نہ اختیاری‘ بلکہ حالات کے اس جبر پر مبنی تھی کہ مولانا امین احسن اصلاحی اور دوسرے معزز اراکین مجلس شوریٰ تو جن مصلحتوں یا اندیشوں کی بنا پر ’دبک‘ گئے تھے وہ ان ہی کو معلوم تھیں‘ میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ ’’اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ‘‘ پر عمل کرتے ہوئے جماعت اور اس کی قیادت کا حق نصح ادا کرنے کی امکان بھر کوشش کروں۔

چنانچہ راقم نے مولانا مودودی کی قرارداد کے مقابلے میں ایک متبادل قرارداد پیش کی جس کا متن درج ذیل ہے:

> ’’جماعت اسلامی پاکستان کا یہ اجتماعِ ارکان بہت سوچ و بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اگرچہ جماعت نے پچھلے پندرہ سالوں میں اپنے نصب العین سے اصولاً انحراف نہیں کیا ہے لیکن ۴۷ء میں پاکستان میں نظام اسلامی کے قیام کے لیے جو طریق کار جماعت نے اختیار کیا تھا اور جس پر جماعت تا امروز عمل پیرا ہے وہ مجموعی طور پر اس طریق کار سے بالکل مختلف ہے کہ جس پر جماعت کی اساس رکھی گئی تھی۔ یہ طریق کار اپنے سابقہ طرزِ عمل سے مختلف بلکہ متضاد ہونے کے علاوہ پاکستان کے عوام اور اس کے برسر اقتدار طبقے کے بارے میں کچھ ایسی خوش فہمیوں اور خود جماعت کی طاقت و وسائل و ذرائع کے بارے میں ایسے اندازوں پر مبنی تھا جو بعد میں کلیۃً درست ثابت نہ ہو سکے۔ اس طریق کار کے تحت ساڑھے نو سالہ جدوجہد کا منفی طور پر یہ نتیجہ تو ضرور برآمد ہوا ہے کہ کوئی اور نظام بھی اس ملک میں اپنی جڑیں گہری نہیں جما سکا لیکن مثبت طور پر نظامِ اسلامی کے قیام کے لیے جو کچھ کیا جا سکا ہے وہ اس طویل اور انتھک جدوجہد کے مقابلے میں بے حد کم ہے کہ جو ان نو سالوں میں جماعت کو کرنی پڑی ہے۔ اس جدوجہد کا ماحصل دستور میں شامل شدہ چند کمزور اور متزلزل اسلامی دفعات اور صرف مسئلہ ٔ دستور پر اس ملک کے سوچنے سمجھنے والے

لوگوں کی اسلامی نقطۂ نظر سے علمی راہنمائی کے سوا کچھ نہیں۔اس عرصے میں نہ تو عوام کی اسلامی نقطۂ نظر سے ٹھوس فکری و ذہنی تربیت کی جا سکی ہے نہ اخلاقی و عملی، اور اس معاملے کا دردناک ترین پہلو یہ کہ اس طریق پر جدوجہد کے دوران جماعت کو نہ صرف اپنے کارکنوں کے سرمایۂ دین و اخلاق اور متاعِ خلوص وللّٰہیت کے ایک حصے کا ضیاع برداشت کرنا پڑا ہے بلکہ اسے خود اپنی بین الاقوامی، اصولی، اسلامی جماعت ہونے کی حیثیت سے ہاتھ دھو کر ایک اسلام پسند قومی سیاسی جماعت کی حیثیت اختیار کر لینی پڑی ہے۔

موجودہ طریق کار کے غلط ہونے کے علاوہ جماعت کا یہ اجتماع ارکان یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ اس کے مطابق جدوجہد کو آئندہ جاری رکھنے کی صورت میں جماعت کو جو خطرات پیش آ سکتے ہیں وہ ان تمام نتائج و خدشات کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں جو اس طریق کار کو چھوڑ کر سابق طریق کو اختیار کرنے میں پیش آ سکتے ہیں۔

بنابریں جماعت کا یہ اجتماع محسوس کرتا ہے کہ موجودہ طریق کار کو اسی لمحہ ترک کر کے اسی طریق کار کو اصولاً دوبارہ اختیار کرنے ہی پر جماعت کی اخروی و دنیوی فوز و فلاح کا دار و مدار ہے کہ جس پر جماعت کی اساس رکھی گئی تھی۔ چنانچہ یہ اجتماع فیصلہ کرتا ہے کہ ماضی کے بارے میں اس نقطۂ نظر اور مستقبل کے بارے میں اس فیصلے کو اصولاً تسلیم کرنے کے بعد اس کے مطابق آئندہ کا لائحہ عمل تجویز کرنے کے لیے جماعت کے اربابِ حلق وعقد جمع ہو کر سوچ بچار کریں اور ایک تفصیلی لائحہ عمل مرتب کر کے اس اجتماع کے سامنے پیش کریں''۔

اسرار احمد عفی عنہ رکن منٹگمری

ظاہر ہے کہ یہ قرار داد میرے اس مفصل بیان کے حاصل بحث اور لب لباب کی حیثیت رکھتی تھی، جو میں نے ''جائزہ کمیٹی کی خدمت میں (۱)'' پیش کیا تھا۔اور جس نے نہ

---

(۱) یہ بیان اب ''تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ'' نامی کتاب کی صورت میں مطبوعہ موجود ہے جو بڑے سائز کے ۲۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ راقم کے پاس اس کا اصل مسودہ تا حال محفوظ ہے اور ان سطور کی تحریر کے وقت ایک ضرورت سے اسے نکال کر دیکھا تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ اس کا عنوان اُس وقت میں نے ''جائزہ کمیٹی کی خدمت میں!'' ہی تحریر کیا تھا۔

صرف ارکانِ جائزہ کمیٹی بلکہ بہت سے دوسرے اراکین مجلس شوریٰ کو اس نتیجے تک پہنچانے میں اہم رول ادا کیا تھا جس کے دباؤ کے تحت نومبر دسمبر ۵۶ء کی قرار داد شوریٰ میں ہزار احتیاطوں اور اندیشہ ہائے دور دراز' کے باوجود حسب ذیل الفاظ بطور شق نمبر ا شامل ہو گئے تھے:

''جماعت نے تقسیم ملک سے پہلے اور بعد اب تک جو کام کیا ہے اس کے متعلق مجلس شوریٰ اس بات پر مطمئن ہے کہ جماعت اپنے اصول' مسلک اور بنیادی پالیسی سے منحرف نہیں ہوئی ہے' البتہ تدابیر کے صحیح اور غلط ہونے کے بارے میں دو آراء ہو سکتی ہیں اور صحیح قرار دینے کی صورت میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ مفید نتائج کے ساتھ بعض مضر نتائج بھی برآمد ہوئے ہیں۔ جنہیں رفع کرنے کی ہم سب کو کوشش کرنی چاہیے''۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنے اُس خط میں' جو اجتماعِ ماچھی گوٹھ کے لیے روانہ ہونے سے قبل منٹگمری ہی سے قائم مقام امیر جماعت چودھری غلام محمد (مرحوم) کے نام پانچ دیگر ارکانِ جماعت کی معیت میں ارسال کیا تھا صراحت کے ساتھ لکھ دیا تھا کہ: ''ہمیں اس بات کا پورا موقع دیا جائے کہ ہم اجتماع ارکان میں اپنے نقطۂ نظر کو وضاحت سے رکھ دیں -----مزید تشریح مناسب ہے کہ ہمیں کم از کم اتنا وقت درکار ہوگا کہ ہم اپنے اُس متفقہ بیان [1] کو جو ہم نے جائزہ کمیٹی کے

سامنے پیش کیا تھا پڑھ کر اجتماع ارکان میں سنا دیں اور آئندہ کے بارے میں ایک قرار داد مرتب کر کے اُسے وضاحت کے ساتھ پیش کر سکیں' ----- اور اس کے ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کر دی تھی کہ: ''اگر یہ قابل قبول نہ ہو تو ہمیں اجتماع سے قبل ہی مطلع کر دیا جائے۔ ہم اس کے لیے پورے انشراحِ صدر کے ساتھ تیار ہیں کہ خاموشی کے ساتھ جماعت سے علیحدہ ہو جائیں۔ اور نہ اپنی منزل کھوٹی کریں اور نہ جماعت کی راہ میں رکاوٹ

(ا): واضح رہے کہ جماعت اسلامی منٹگمری کے ان ارکان نے جائزہ کمیٹی سے ملاقات پر بھی یہی کہا تھا کہ ہمارے نظریات تقریباً وہی ہیں جو ڈاکٹر اسرار احمد کے ہیں' اور پھر جب راقم اپنا بیان ضبط تحریر میں لے آیا تب بھی انہوں نے اس سے اپنے کامل اتفاق کا اظہار کر دیا تھا!

بن کر کھڑے ہوں!''۔ اور جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے' اس تحریر کے جواب میں ہمیں بذریعہ تار مطلع کیا گیا تھا کہ اجتماع ارکان میں سب کو اظہارِ خیال کا پورا موقع دیا جائے گا۔

لیکن جب ماچھی گوٹھ پہنچنا ہوا تو فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ اجتماع کو جس طور سے Conduct کرنے کا فیصلہ ہو گیا ہے اس میں ہمارے مطالبے کا بہ تمام وکمال پورا ہونا تو قطعاً ناممکن ہے' صرف یہ کوشش کی جا سکتی ہے کہ اپنے نقطۂ نظر کو ایک مختصر تقریر میں واضح کیا جائے' اور اس کے لیے اگرچہ میرے پاس اپنے بیان کی صورت میں وسیع مواد اور مفصل دلائل و شواہد موجود تھے لیکن یہ بہرحال لازم تھا کہ اس طویل بیان میں سے موقع کی مناسبت سے اہم تر مواد کا انتخاب کیا جاتا اور اسے از سرِنو مرتب کر کے تقریر تیار کی جاتی۔ اور اس کے لیے ظاہر ہے کہ یہ لازم تھا کہ یہ معلوم ہوتا کہ مجھے تقریر کے لیے کتنا وقت دیا جا سکے گا ----- لہٰذا میں دوران اجتماع قائم مقام امیر جماعت سے اس سلسلے میں مسلسل استفسار کرتا رہا جس کا یہی مستقل جواب ملتا رہا کہ ''ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا''۔

بنابریں میں اپنی تقریر قطعاً تیار نہ کر سکا' اور جب ؏ ''مری باری کیوں دیر اتنی کری'' کے مصداق اجتماع کے تیسرے دن کے تقریباً خاتمے کے لگ بھگ 'متبادل قرار دادوں' کی باری آئی۔ اور میرا نام پکارا گیا تو میں تقریباً خالی الذہن کیفیت کے ساتھ اُٹھا اور اس نہایت ہی مختصر تمہید کے بعد اپنا بیان پڑھنا شروع کر دیا کہ:

> ''میں اگرچہ اس وقت شدید مشکل سے دوچار ہوں' اور مجھے مختلف نوع کی بے شمار داخلی اور خارجی رکاوٹوں کا سامنا ہے' تاہم جماعت کی پالیسی اور طریق کار کے ضمن میں اختلافی ذہن رکھنے والے اکابرین کے مقابلے میں ایک نہایت اہم سہولت بھی مجھے حاصل ہے ----- اور وہ یہ کہ جہاں اس بات کا قوی امکان اور شدید اندیشہ ہے کہ اگر اکابرین جماعت میں سے کوئی شخص امیر جماعت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی قرارداد کے بالمقابل متبادل قرارداد لے کر کھڑا ہو تو یہ گمان کیا جائے کہ وہ خود منصب امارتِ جماعت کا طالب اور خواہاں ہے' وہاں بحمد اللہ' میری نوعمری' کم مائیگی اور بے بضاعتی کے پیش نظر' میرے بارے میں ایسے کسی گمان کا کوئی امکان موجود نہیں ----- اور اپنی پرسوں کی افتتاحی تقریر میں امیر جماعت

نے یہ بات دوٹوک انداز میں کہہ کر کہ: ''پالیسی اور طریق کار پر بحث و تمحیص کے بعد جس شخص کی بات ارکانِ جماعت مان لیں' پھر اُسی کو جماعت کی رہنمائی کرنی چاہیے!'' اکابرین کے قدموں میں جو بھاری بیڑیاں ڈال دی ہیں' الحمدللہ کہ مشہور فارسی مقولے ''عصمت بی بی است از بے چادری!'' کے مصداق میں اُن سے آزاد ہوں!!''

ان تمہیدی الفاظ کے بعد جب میں نے اپنا بیان پڑھنا شروع کیا تو چند ہی منٹ کے بعد اجتماع میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا[۱]۔

میرے بیان کے آغاز میں چونکہ میرا کچھ ذاتی تعارف بھی شامل ہے تو ابھی میں اسی کو پڑھ رہا تھا کہ ایک ترکستانی قاری صاحب جنہوں نے انقلاب روس کے بعد ہجرت کی تھی اور پہلے افغانستان اور پھر ہندوستان تشریف لائے تھے' اور اُن دنوں اجمل باغ' رحیم آباد' میں قراءت کے استاد کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہے تھے' اُٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے فرمایا: ''میری عمر مقرر کی عمر سے بہت زیادہ ہے' اور میں نے بہت سے ملکوں کا سفر کیا ہے' اگر میں اپنی داستانِ حیات بیان کرنے لگوں تو وہ مہینوں جاری رہے گی' لہٰذا اس سلسلے کو بند کیا جائے!''[۲] ------اس کے تھوڑے سے وقفے کے بعد پروفیسر عبدالغفور احمد بڑے غصے میں اُٹھے اور انہوں نے نہایت جلالی شان میں چیخ کر کہا: ''ہمارے پاس اس بکواس کو سننے کے لیے کوئی وقت نہیں ہے!'' یہ گویا ایک اشارہ تھا جس پر پنڈال میں

---

(۱) اس طوفان کا آغاز تو میرے سٹیج پر آتے ہی ہو گیا تھا۔ چنانچہ سٹیج کے پیچھے ایک میز پر جماعت کے شعبۂ نشر و اشاعت کے جو کارکن بیٹھے ہوئے تھے اُن میں سے مصباح الاسلام فاروقی مرحوم نے فرمایا: ''اچھا ہوا کہ گورمانی کے ایجنٹ بھی سامنے آ گئے!'' (لیکن ظاہر ہے کہ یہ بات اس وقت میرے علم میں نہیں آئی تھی بلکہ بعد میں بھائی اللہ بخش سیال صاحب کے ذریعے معلوم ہوئی جو پنڈال کے اُس حصے میں بطور کارکن مامور تھے۔ انہوں نے نہایت درشتی سے فاروقی صاحب کا محاسبہ بھی کیا جس پر مرحوم نے معذرت کر لی! (اللہ ان کی خطا سے درگزر فرمائے اور ان کی مغفرت کرے!)

(۲) قاری صاحب موصوف کا نام تو مجھے یاد نہیں' لیکن اُن کی صورت ابھی تک نگاہوں کے سامنے موجود ہے' وہ بہت نیک اور مخلص انسان تھے' اور اُن کی جانب سے میرے دل میں ہرگز کوئی شکایت یا کدورت نہیں ہے۔ ان کا انتقال اجتماع کے بعد جلد ہی ہو گیا تھا۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ وَ ارْحَمْہُ!

ہنگامہ پوری شدت کے ساتھ برپا ہو گیا۔ اور بہت سے ارکان نے اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو کر بلند آواز میں میرے خلاف گل افشانی شروع کر دی۔ اور ایک زوردار مطالبہ سامنے آ گیا کہ ڈاکٹر اسرار کو قطعاً وقت نہ دیا جائے!

دوسری طرف بعض نے اسی شد و مد کے ساتھ میری حمایت اور مجھے غیر محدود وقت دینے کے حق میں آواز اٹھائی' ان میں سے تین حضرات کی باتیں مجھے لفظ بہ لفظ یاد ہیں: (۱) مولانا سید وصی مظہر ندوی نے تو صرف اس پر اکتفا کی کہ ''میں اپنے حصے کا وقت بھی ڈاکٹر اسرار کو دیتا ہوں''۔ (۲) سردار محمد اجمل خان لغاری مرحوم نے فرمایا: ''ڈاکٹر اسرار جیسے لوگ تحریکوں کو روز روز نہیں ملا کرتے' انہیں پورا وقت دیا جائے اور اگر اس وجہ سے اجتماع کی کارروائی میں ایک دن کا اضافہ ناگزیر ہو تو اُس کا کُل خرچہ میں اپنی ذاتی جیب سے ادا کروں گا''۔

(۳) سب سے زیادہ تیکھی بات راؤ خورشید علی خاں مرحوم نے کہی کہ: ''یہاں استبداد (راؤ صاحب نے Repression کا لفظ استعمال کیا تھا) کی بدترین مثال قائم کی جا رہی ہے' ڈاکٹر اسرار اپوزیشن کا لیڈر رہے [۱] اسے بھی اتنا ہی وقت ملنا چاہیے جتنا لیڈر آف دی ہاؤس (یعنی مولانا مودودی مرحوم) نے لیا ہے (گویا چھ گھنٹے!)'' ----- اس پر خود مولانا مودودی سٹیج پر تشریف لائے اور انہوں نے پہلے تو اس پر شدید احتجاج کیا کہ یہاں وہ اصطلاح استعمال کی جا رہی ہیں جن کا جماعت اسلامی کے ساتھ سرے سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے' چنانچہ انہوں نے فرمایا: ''یہاں نہ کوئی حزب اقتدار ہے' نہ حزب اختلاف!'' ----- اور اس کے بعد کسی قدر غیظ اور غضب کے عالم میں میری وہ نوٹ بک مجھ سے لے کر جس میں میرا بیان درج تھا (اور وہی اصل مسودہ تھا) اسے ہاتھ بلند کر کے ہوا میں لہرایا اور فرمایا کہ ''اس قدر ضخیم کتاب کو اِس اجتماعِ عام میں کیسے پڑھا جا

---

(۱) راؤ صاحب کے اس ایک جملے سے پورا اندازہ ہوتا ہے کہ اکابر کے خاموش ہونے اور دبک جانے نے کس طرح ''كَبَّرَنِیْ مَوْتُ الْكُبَرَاءِ'' کے مصداق راقم کو کسی مشکل ہی نہیں نہایت مضحکہ خیز پوزیشن میں ڈال دیا تھا!

سکتا ہے؟''

اس پر میدانِ کارزار پھر گرم ہو گیا اور دونوں جانب سے تیز و تند جملوں کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔ اور پورا نصف گھنٹہ اس ہنگامے کی نذر ہو گیا۔ جس کے دوران میں سٹیج پر مائک کے سامنے چپ چاپ کھڑا دونوں قسم کی باتیں سنتا رہا' اگرچہ ظاہر ہے کہ اُن میں طنز' تمسخر اور استہزاء ہی نہیں' نفرت' حقارت اور طیش پر مبنی جملوں کا پلڑا بہت بھاری تھا! تاہم راقم کے لیے تو یہ اندازِ مخالفت' اور یہ طرزِ حمایت دونوں ہی ؎

عجب دو گونہ عذاب است جانِ مجنوں را
عذاب فرقتِ لیلیٰ و صحبتِ لیلیٰ

بالآخر میں نے مہرِ سکوت کو توڑا اور عرض کیا'' مجھے آپ حضرات کی دِقت کا بخوبی اندازہ ہے' لیکن تھوڑی دیر کے لیے آپ حضرات میری مشکل پر بھی غور فرمائیے ----- میری مشکل یہ ہے کہ اگر میں اس وقت آپ لوگوں کے سامنے اپنا اختلافِ رائے بیان نہیں کرتا اور جماعت سے علیحدہ ہو کر بات کرتا ہوں تو آپ کا یہ الزام مجھ پر واقع ہو گا کہ: تم نے جماعت کے اندر بات کیوں نہ کی؟ ورنہ مجھے نہ تقریر کا ڈھنگ آتا ہے' نہ ہی اس کا شوق ہے! اب اگر آپ لوگ مجھے وقت نہیں دے سکتے تو غور فرمالیجئے کہ پھر میری حجت آپ پر قائم ہو جائے گی کہ آپ نے مجھے جماعت کے اندر رہتے ہوئے اظہارِ اختلاف کا موقع نہ دیا!''(۱)۔

---

(۱) میں نے اپنی اس وقت کی جس داخلی کیفیت کی ترجمانی ان الفاظ سے کی تھی اجتماع ماچھی گوٹھ کے کچھ ہی عرصہ بعد فیضؔ احمد فیضؔ کی ایک نظم میں مجھے اُس کی نہایت بھرپور اور حد درجہ فصیح و بلیغ ترجمانی نظر آئی۔ جناب فیضؔ کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

دُشنام' نالۂ' ہاؤ' ہوُ' فریادٗ کچھ تو ہو!
چیخے ہے درد ! اے دل برباد کچھ تو ہو!

مرنے چلے تو سطوتِ قاتل کا خوف کیا؟
اتنا تو ہو کہ باندھنے پائے نہ دست و پا!
مقتل میں کچھ تو رنگ جمے جشن رقص کا!

◀◀

بہر حال میں تو اپنے مندرجہ بالا الفاظ کہہ کر سٹیج سے اتر آیا' لیکن اب مولانا مودودی مرحوم سمیت سٹیج کے آس پاس بیٹھے ہوئے اکابرین کھسر پھسر اور صلاح ومشورہ شروع ہوا' جس کے نتیجے میں اعلان کیا گیا کہ مجھے تین گھنٹے دیئے جائیں گے۔ اگر چہ اُن میں وہ نصف گھنٹہ بھی محسوب ہوگا جو پہلے ہی صَرف ہو چکا ہے۔

اس پر میں نے اپنا بیان دوبارہ پڑھنا شروع کر دیا۔لیکن اس حال میں کہ ایک جانب مسلسل ہوٹنگ ہوتی رہی اور دل آزار اور اشتعال انگیز فقرے چست کئے جاتے رہے' دوسری جانب میں خالی الذہن تو پہلے ہی سے تھا' اب نصف گھنٹے کے شدید ہنگامے (Pandemonium) اور مسلسل ہوٹنگ سے میرے اعصاب بھی متاثر ہو چکے تھے ----- اور تیسری جانب وقت کی پابندی کے باعث مجھے اپنے بیان کے بعض حصے چھوڑنے پڑ رہے تھے جس سے عبارت کا ربط اور تسلسل ٹوٹ رہا تھا' اور بالآخر وقت معینہ میں پورا بیان ختم بھی نہ ہوسکا اور مجھے بات ادھوری ہی چھوڑ کر سٹیج سے اتر آنا پڑا ----- بنا بریں مجھے اپنے اور اپنی قرارداد کے اس حشر پر تو ہرگز تعجب نہیں ہوا کہ اس کے حق میں صرف چار ووٹ آئے' البتہ اس پر ضرور تعجب ہوا کہ بڑے ہی باہمت تھے وہ لوگ جنہوں نے مجھے ووٹ دیئے!!

تاہم اس سرگزشت میں ایک اہم لمحۂ فکریہ ہے مولانا امین احسن اصلاحی اور ان کے ہم خیال دوسرے اکابرین اور اراکین مجلس شوریٰ کے لیے کہ اگر مجھ ایسے نوعمر' حقیر اور بے بضاعت شخص کو اس اجتماع میں اتنا وقت مل سکتا تھا' اور وہ بھی مولانا مودودی ایسی عظیم شخصیت کی مخالفت کے علی الرغم' تو اگر وہ بھی کمر ہمت کس لیتے تو ؎

اٹھ باندھ کمر' کیا ڈرتا ہے
پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے!

◄◄

آلودہ خوں سے پنجۂ صیاد کچھ تو ہو!
خوں ر گواہ دامن جلاد کچھ تو ہو!
جب خوں بہا طلب کریں بنیاد کچھ تو ہو!

کے مصداق نصرتِ خداوندی ضرور دستگیری کرتی اور کیا عجب کہ جماعت کا رخ تبدیل ہو جاتا۔ تاہم یہ صرف ایک دکھے ہوئے دل کی صدا ہے' ورنہ ع ''مجھے ہے حکم اذاں' لا الٰہ الاّ اللہ!!'' کے مصداق ہمیں تو اسی کا حکم ہے کہ اس پر ایمان پختہ رکھیں کہ ''مَا شَاءَ اللّٰهُ کَانَ وَ مَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ'' ------اور ''اِنَّ كَلِمَةَ لَوْ تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ''...... واللہ اعلم!!

دیگر قراردادیں اور تقاریر

میری متبادل قرارداد کے علاوہ مولانا مودودی کی قرارداد میں جو ترامیم تجویز کی گئیں' یا دیگر متبادل قراردادیں پیش کی گئیں ان کی راقم کے ذہن میں بھی صرف ایک دھندلی سی یاد باقی ہے' اور خود متعلقہ حضرات کو بھی زیادہ تفاصیل یاد نہیں' لہٰذا اُن کا صرف اجمالی تذکرہ کافی ہے۔

ا۔ جناب ارشاد احمد حقانی نے ایک متبادل قرارداد پیش کی تھی اور اس پر تقریر بھی کی تھی' لیکن اب اِن دونوں کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے' تاہم انہیں ووٹ مجھ سے زیادہ ملے تھے۔ یعنی اغلباً ۱۸۔

اس سے بھی اہم تر معاملہ اُن کا اس وقت سامنے آیا جب آئندہ جماعت میں پالیسی اور طریق کار کے ضمن میں اختلافی ذہن رکھنے والے لوگوں کے لیے 'گنجائش' پیدا کرنے کا مسئلہ زیر بحث تھا' اور اس سلسلے میں بھی ایک قرارداد پر غور ہو رہا تھا جس میں تجویز کیا گیا تھا کہ ''جماعت کی پالیسی سے اختلاف رکھنے والے لوگ بھی اگر جماعت کے مقصد اور نصب العین سے پورا اتفاق رکھتے ہوں تو جماعت میں شامل رہ سکتے ہیں' تاہم وہ اپنا اختلافِ رائے سوائے آل پاکستان اجتماعِ ارکان کے نہ پبلک میں بیان کر سکیں گے نہ خود ارکانِ جماعت کے مقامی' ضلعی' حتیٰ کہ حلقہ وار اجتماعات میں! اور یہ پابندی قلم پر بھی ہو گی اور زبان پر بھی' یہاں تک کہ خالص نجی گفتگوؤں میں بھی اپنے اختلافی خیالات کا اظہار ممنوع ہو گا'' (واضح رہے کہ یہ سب یادداشت کی بنا پر تحریر کیا جا رہا ہے اور اس میں لفظی غلطی کا

امکان موجود ہے' تاہم حاصل کلام یقیناً یہی تھا!)---تو اس پر حقانی صاحب نے کہا کہ ''ایسے اہم مسئلے کو اس طرح رَوا رَوی میں طے کرنا غلط ہے' ہمیں اس قرارداد کی نقول مہیا کی جائیں اور اس پر غور و خوض کا موقع بھی دیا جائے اور بحث و تمحیص کا بھی!'' اور جب انہیں قیم جماعت میاں طفیل محمد صاحب نے جواب دیا کہ آپ کا یہ مطالبہ منظور کرنا ممکن نہیں تو اس پر انہوں نے اجلاس سے احتجاجاً واک آؤٹ کیا جس پر مولانا مودودی یہ کہتے ہوئے سنے گئے: ''یا اللہ یہ میں جماعت میں کیسی باتیں دیکھ رہا ہوں!''-----حقانی صاحب کے اس احتجاجی واک آؤٹ میں مولوی محی الدین سلفی مرحوم نے بھی ساتھ دیا اور وہ بھی تھوڑی دیر کے لیے پنڈال سے باہر چلے گئے!----بہر نوع وہ قرارداد بھی پاس ہو گئی' اور اس طرح پالیسی اور طریق کار کے ضمن میں اختلافی ذہن رکھنے والوں پر متذکرہ بالا جملہ قدغنیں اور پابندیاں عائد ہو گئیں۔

۲۔ جناب مصطفیٰ صادق صاحب نے سرکاری قرارداد سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا کہ ''ہم کارکنوں کی اصل مشکل یہ ہے کہ ہمارے سامنے جو پالیسی مقالات' مضامین' تقاریر' اور مرکزی شوریٰ کے فیصلوں کی صورت میں آئی ہے' ہم اسے حرزِ جان بنا لیتے ہیں اور اس پر خود بھی دھواں دھار تقریریں اور گرما گرم بحثیں کر دیتے ہیں-----لیکن پھر اچانک ہمارے سامنے عمل بالکل مختلف بلکہ متضاد صورت میں آتا ہے'' (روایت بالمعنیٰ)-----اس ضمن میں انہوں نے جماعت کی انتخابی پالیسی کا بطورِ خاص ذکر کیا اور پھر وہ واقعات گنوائے جن سے ظاہر ہوا کہ عملاً! اس پالیسی کی دھجیاں مرکز اور حلقہ جات کے اہم ترین اور ذمہ دار ترین لوگوں نے خود اپنے ہاتھوں بکھیری ہیں۔ مثلاً (ا) خود مولانا مودودی نے انہیں حکم دیا کہ مولانا محی الدین لکھوی کو ان کے گاؤں سے لے کر آئیں اور ان کا ووٹ میاں عبدالباری مرحوم کے حق میں ڈلوائیں۔ جبکہ میاں صاحب موصوف مروّجہ نظام انتخابات کے تحت ہی الیکشن میں حصہ لے رہے تھے اور بطور خود امیدوار تھے' اور امیدواری کو ہم نے حرامِ مطلق قرار دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے اس حکم کی تعمیل ''زیرِ احتجاج'' (یعنی Under Protest) کی کہ یا تو آپ اپنا موقف علی الاعلان بدلیں اور اگر

کوئی غلط رائے سہواً قائم ہوگئی تھی تو اس سے علانیہ رجوع کریں' ورنہ اس پر سختی سے عمل کریں۔ (۲) اسی طرح بہاولپور کے الیکشن میں جماعت نے ووٹروں کو خوب کھانے بھی کھلائے اور ان کے لیے ٹرانسپورٹ بھی فراہم کی۔ اور پھر حسابات بالکل جعلی اور جھوٹے پیش کر دیئے! اس پر بعض حضرات نے تو دبے الفاظ میں تردید کی کوشش کی لیکن (جناب مصطفیٰ صادق کے بیان کے مطابق) ملتان کے سید نصیر الدین مرحوم اور صادق آباد کے بھائی (وہ میرے بہنوئی ہیں) اللہ بخش سیال صاحب نے سٹیج پر آ کر بیان دیا کہ ''یہ الزام غلط ہے' حسابات ہم نے پیش کئے تھے' اور وہ بالکل صحیح اور مطابق واقعہ تھے'' ----- تب سردار محمد اجمل خان لغاری مرحوم خود کھڑے ہوئے اور انہوں نے فرمایا کہ: ''اس الیکشن میں جماعت کے پنچائتی نظام کے تحت نمائندہ میں تھا اور میں اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر کہتا ہوں کہ سید نصیر الدین اور اللہ بخش سیال کے بیان سے بڑا جھوٹ ہو ہی نہیں سکتا!''

اس ناگوار بحث کو تو اگرچہ مولانا مودودی مرحوم نے خالص پارلیمنٹری لطائف کے انداز میں یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ ''سردار صاحب' تب تو اصل مجرم آپ ہیں' اور اس سارے معاملے کی جواب دہی آپ کو کرنی چاہیے!'' لیکن مصطفیٰ صادق صاحب کی اس پوری گفتگو کا گہرا اثر ارکانِ جماعت کی بہت بڑی تعداد نے قبول کیا ----- چنانچہ انہیں اہل اختلاف میں سب سے زیادہ ووٹ حاصل ہوئے ----- یعنی ان کی یادداشت کے مطابق ۱۳۸ تا ۱۴۸۔ جن میں ایک ووٹ (بقول خود ان کے) شیخ سلطان احمد صاحب (کراچی) کا بھی تھا جو پورے اجتماع کے دوران قطعاً خاموش تماشائی بنے رہے تھے بلکہ کراچی سے روانہ ہی یہ کہہ کر ہوئے تھے کہ: ''میں تو ایک ڈرامہ دیکھنے جا رہا ہوں!''۔

۳۔ سب سے زیادہ مضحکہ خیر معاملہ حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کا ہوا کہ انہوں نے ایک باقاعدہ متبادل قرارداد پیش کی ----- اور اس کے حق میں ایک مفصل اور مدلل تقریر بھی کی' لیکن تقریر کے اختتام پر' رائے شماری کی ذلت سے بچنے کی خاطر' اپنی قرارداد واپس لے کر سٹیج سے اتر آئے! **فیا للعجب!!**

ملتوی شدہ قراردادِ اعتماد

اور امارتِ جماعت سے استعفے کی واپس کے لیے مولانا مودودی کی شرائط

پالیسی کی بحث اس طرح اختتام پذیر ہو جانے کے بعد مولانا مودودی پر اظہارِ اعتماد کی وہ قرارداد دوبارہ پیش ہوئی جس سے اجتماع کی کارروائی کا آغاز ہوا تھا لیکن جس پر گفتگو کو مولانا مودودی نے میرے نکتۂ اعتراض سے اتفاق کرتے ہوئے ملتوی کر دیا تھا۔ اور اجتماع کی جو روداد اوپر درج ہو چکی ہے اس کے پیشِ نظر ظاہر ہے کہ اب اس قراردادِ اعتماد کا بھاری اکثریت سے منظور ہونا ہر اعتبار سے فطری بھی تھا اور منطقی بھی! بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اب اُس کا رسمی (Formal) طور پر پیش ہونا بھی نرا تکلف تھا!

تاہم پالیسی کے ضمن میں اُن سے اختلاف رکھنے والے جملہ اکابر و اصاغر پر ''فتح مبین'' حاصل کر لینے کے باوجود مولانا مودودی نے امارت جماعت سے اپنا استعفاء واپس لینے اور دوبارہ امارت کی ذمہ داری سنبھالنے میں پس و پیش سے کام لیا۔ اس سلسلے میں اُن کا موقف یہ تھا کہ:

> ''جماعت کی امارت کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے معاملے میں میری راہ میں کچھ مشکلات اور موانع حائل ہیں۔ جب تک وہ دور نہ ہوں میں امارت کی ذمہ داری نہیں سنبھال سکتا۔ مزید برآں وہ موانع و مشکلات ایسی ہیں کہ انہیں ارکان جماعت کے اجتماع عام میں بیان کرنا بھی میرے نزدیک قرین مصلحت نہیں ہے لہٰذا میں تجویز کرتا ہوں کہ جماعت کے جملہ تنظیمی حلقوں سے فی حلقہ دو دو افراد منتخب کر لیے جائیں جن کے سامنے میں اپنی مشکلات بیان کر دوں ----- پھر اگر وہ میری راہ کے ان موانع کو دور کرنے کی کوئی راہ نکالنے میں کامیاب ہو جائیں تو میں اپنا استعفاء واپس لے لوں گا اور امارتِ جماعت کی ذمہ داری دوبارہ سنبھال لوں گا''۔
> (روایت بالمعنیٰ)

اب ظاہر ہے کہ اس وقت تک ارکانِ جماعت کی ایک عظیم اکثریت ''کشتگانِ خنجر تسلیم'' کی

صورت اختیار کر ہی چکی تھی لہٰذا مولانا کی یہ تجویز فی الفور منظور ہوگئی۔ اور جھٹ پٹ ارکانِ جماعت کی ایک نہایت محدود تعداد (جو کسی طرح بھی بیس سے زائد نہیں ہو سکتی) پر مشتمل وہ ''مجلس نمائندگان'' وجود میں آ گئی جسے بعد میں مولانا اصلاحی نے ''خلوتیانِ راز کی محفل'' سے تعبیر کیا۔

اس مجلس میں یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کسی بھی اختلاف کرنے والے شخص کا منتخب ہونا خارج از امکان تھا' لہٰذا اس میں ہما شما کا تو ذکر ہی کیا' مولانا اصلاحی سمیت اختلافی ذہن رکھنے والا کوئی رکن شوریٰ بھی منتخب نہیں ہوا۔

خلوتیانِ راز کے اس دیوانِ خاص میں ع ''بلبل چہ گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد؟ کے مصداق مولانا نے کیا فرمایا' نمائندگان میں سے کس نے کیا کہا' اور کیا فیصلے ہوئے اس کی اس مجلس کے شرکاء کے سوا کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ چنانچہ وہاں ناز و نیاز کے کون کون سے مراحل طے ہوئے' اور بالآخر کیا قول وقرار ہوئے یہ سب باتیں سربستہ راز رہیں اور مولانا امین احسن اصلاحی ایسی اہم شخصیت کے علم میں بھی یہ باتیں کئی ماہ بعد اس وقت آئیں جب کوٹ شیر سنگھ کے اجتماع شوریٰ میں یہ پٹاری کھلی اور اس میں سے بقول مولانا اصلاحی وہ ''بلی'' برآمد ہوگئی جسے انہوں نے لگ بھگ دس سال قبل' کئی سال کی مسلسل کوششوں سے بزعم خویش ہلاک کر دیا تھا!

بہر حال یہ ہے وہ ''مجلس نمائندگان''' کا اجلاس جس میں مولانا مودودی نے اپنی وہ تقریر جواب پہلی بار ہفت روزہ ''آئین'' کے ماہانہ ایڈیشن بابت ربیع الاول ۱۴۱۰ھ میں شائع ہوئی ہے (اور جسے ہم بھی ''میثاق'' بابت دسمبر ۱۹۸۹ء میں من وعن نقل کر چکے ہیں) یا تو پوری کی پوری کی' یا اُس کا خلاصہ پیش کر دیا۔ اور قرائن یہی کہتے ہیں کہ مجلس نمائندگان نے مولانا مودودی کے نقطۂ نظر کو من وعن قبول کرتے ہوئے ایسے پختہ قول وقرار اور مؤثق وعدہ و وعید کر لیے جن کے نتیجے میں جماعت اسلامی کا وہ نیا دستور عالم وجود میں آیا جس کے بارے میں مولانا اصلاحی نے اپنے گشتی مراسلے میں یہ الفاظ تحریر کیے کہ: ''اس نئے دستور کو کوئی سمجھتا ہو یا نہ سمجھتا ہو مگر میں سمجھتا ہوں۔ اس کا خلاصہ دو لفظوں میں یہ ہے کہ سارے

اختیارات مجلس عاملہ کو حاصل ہیں اور مجلس عاملہ امیر جماعت کی جیب میں ہے!'' -----
بہر حال اس مسئلے کے بارے میں راقم کو اس وقت کچھ عرض نہیں کرنا' اس پر اپنا محاکمہ ہم علیحدہ تحریر کریں گے۔

البتہ ایک واقعے کا تذکرہ مناسب ہے اور وہ یہ کہ غالباً اسی بحث کے دوران جائزہ کمیٹی کے ارکان کے خلاف مولانا مودودی کا الزام نامہ یا فردِ قراردادِ جرم بھی زیرِ بحث آئی۔ اور اب اگرچہ یہ بالکل یاد نہیں آتا کہ یہ بحث کب' کس کی جانب سے' اور کس انداز میں شروع ہوئی۔ تاہم یہ اچھی طرح یاد ہے کہ اس پر بھی ایوان میں پھر اک بار خوب گرمی سردی پیدا ہوئی' اور یہ منظر بھی راقم کی نگاہوں کے سامنے پوری وضاحت کے ساتھ موجود ہے کہ اس بحث کی گرما گرمی میں ایک موقع پر مولانا مودودی اس درجہ غضبناک ہو گئے تھے کہ وہ روسٹرم جس کا مولانا نے سہارا لیا ہوا تھا بُری طرح آگے پیچھے جھول رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایک مرحلے پر سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کو اندیشہ ہوا کہیں مولانا روسٹرم سمیت سٹیج سے نیچے نہ گر جائیں۔ چنانچہ بعض لوگوں نے فوری طور پر اُٹھ کر روسٹرم کو سہارا دیا۔ اگرچہ خود مولانا نے اس پر کسی قدر کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے فرمایا: ''اچھا تو آپ لوگ ڈر رہے تھے کہ میں گر جاؤں گا!''

بہرحال اصل مسئلے کے ضمن میں مولانا نے فرمایا کہ: ''میں اُن تمام حضرات کو جن کی رائے یہ ہے کہ میں نے ارکانِ جائزہ کمیٹی کے خلاف جو اقدام کیا وہ دستورِ جماعت اسلامی کی حدود سے تجاوز کے مترادف ہے' چیلنج کرتا ہوں کہ وہ ملک میں وہ دستوری قوانین کے جس ماہر کو چاہیں اُس کے سامنے یہ مسئلہ پیش کر کے فیصلہ حاصل کر لیں۔ اُس ماہر قانون کی پوری فیس میں اپنی ذاتی جیب سے ادا کر دوں گا'' ----مولانا کے اس چیلنج کا بھی غالباً کوئی فوری جواب نہ ارکانِ جائزہ کمیٹی میں سے کسی کی جانب سے آیا' نہ ہی مولانا اصلاحی یا کسی دوسرے رکن جماعت یا رکن شوریٰ کی جانب سے! واللہ اعلم!!

☆ ☆ ☆

یہاں ماچھی گوٹھ کے اجتماعِ ارکان جماعت اسلامی کی روداد' جتنی اور جیسی کچھ

یادداشتوں کی مدد سے مرتب کی جا سکی، ختم ہوتی ہے ----- البتہ صرف دو باتیں مزید تذکرہ کے لائق ہیں، اگرچہ اُن کی اہمیت عمومی نہیں، راقم الحروف کے لیے ذاتی ہے۔

ایک یہ کہ جب راقم اپنا بیان ختم کر کے سٹیج سے نیچے اُترا، اور از خود یا مولانا مودودی کے طلب فرمانے پر اُن کے پاس گیا، تو مولانا نے فرمایا: ''آپ کو معلوم ہے کہ مجھے آپ سے کتنی محبت ہے؟''۔ جس کا جواب میں نے یہ دیا کہ: ''مولانا مجھے اس کا پورا اندازہ ہے، اور میں نے اپنی دانست میں اسی کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے''۔ اس پر یہ قطعاً یاد نہیں کہ مولانا مرحوم کا ردّ عمل کیا تھا!

دوسرے یہ کہ جب اجتماع کے خاتمے کے بالکل قریب ارکان کے حلقہ وار اجلاس ہو رہے تھے تو میں نے محسوس کیا کہ امیر حلقہ اکاڑہ چودھری عبدالرحمٰن مرحوم مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں جن میں حد درجہ محبت اور شفقت بھی شامل اور کسی قدر خوف اور اندیشہ بھی! اس پر جب میں نے اُن سے عرض کیا کہ: ''چودھری صاحب آپ پریشان نہ ہوں، میں جماعت سے علیحدہ نہیں ہوں گا'' تو وہ منظر بھی میری نگاہوں کے سامنے پوری وضاحت کے ساتھ موجود ہے کہ ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی، چنانچہ ان کا چہرہ بھی گلنار ہو گیا، اور وہ فوراً اُٹھ کر سٹیج کے پاس گئے اور وہاں بات طے کر کے آئے اور مجھے حکم دیا کہ یہی بات سٹیج سے بھی کہہ دو۔ چنانچہ میں سٹیج پر گیا اور میں نے وہاں یہ الفاظ کہے کہ:

> ''اگرچہ پالیسی کے بارے میں میری رائے اب بھی وہی ہے جو میں نے اپنے بیان میں ظاہر کی، اور ادب کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ اس ضمن میں مجھے امیر جماعت کی طویل تقریر میں قطعاً کوئی روشنی نہیں ملی۔ تاہم میں جماعت میں شامل رہوں گا، اس لیے کہ میں جماعت کے بغیر اپنے وجود کا تصور تک نہیں کر سکتا!''

چنانچہ اس پر پورے پنڈال میں خوشی کی ویسی ہی لہر دوڑ گئی جیسی مجھے چودھری عبدالرحمٰن خاں مرحوم کے چہرے پر نظر آئی تھی!

۳۔ اس کے ساتھ ہی ایک تیسرا واقعہ بھی جو دفعۃً یاد آ گیا ہے بیان کر دینا مناسب ہے۔ اور وہ یہ کہ دورانِ اجتماع ایک مرحلے پر جماعت اسلامی منٹگمری کے دو ارکان نے جو میرے

پوری طرح ہم خیال تھے مجھ پر دباؤ ڈالا اور شدید اصرار کیا کہ ہمیں فوری طور پر یہیں با جماعت رکنیت سے استعفاء دے دینا چاہیے تو میں انہیں اجتماع گاہ سے باہر ریلوے لائن پر لے گیا اور وہاں چہل قدمی کرتے ہوئے انہیں سمجھایا کہ: ''اس اجتماع میں' میں شدید ذہنی و قلبی اذیت سے دوچار رہا ہوں' اس کیفیت میں کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانا میرے نزدیک اصولی طور پر غلط ہے----- میں یہاں سے واپس جا کر پُر سکون ماحول میں ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ پورے معاملے پر از سرِ نو غور کروں گا' اور رمضان المبارک قریب ہے' اس میں جتنے دن بھی میسر آ سکے اُن میں اعتکاف کروں گا اور اُسی میں اپنے مستقبل کے بارے میں آخری فیصلہ کروں گا!'' (یہ دو ارکانِ جماعت جن کا تعلق اصلاً تو پاک پتن سے تھا لیکن کچھ حالات کی نامساعدت کے باعث وہ ایک عرصے سے منٹگمری میں اقامت پذیر تھے سید شیر محمد شاہ' اور نور محمد قریشی صاحب تھے!)

اجتماع ماچھی گوٹھ کے بعد

ماچھی گوٹھ سے واپسی کے بعد کے دو ماہ راقم الحروف پر شدید ذہنی کشمکش اور روحانی کرب کے عالم میں گزرے۔ اوران کے دوران راقم ایک سہ گونہ عقدۂ لاینحل (Three Dimensional Dilemma) کتھیوں کو سلجھانے میں سرگرداں رہا۔ چنانچہ:

(۱) ایک جانب جماعت اسلامی کے قیام کا مقصد اور اُس کا نصب العین، اُس کا پیش کردہ تصورِ دین، اور اس کا ایک عرصے کے بعد از سرِ نو واضح کردہ تصور فرائض دینی ایسے اہم اور اساسی امور تھے جن کی حقانیت مجھ پر دن بدن واضح سے واضح تر ہوتی چلی گئی تھی۔ تا آنکہ اُس وقت تک بحمداللہ میری رسائی قرآن حکیم کے علم وحکمت کے اُن گوشوں تک براہ راست ہو چکی تی جن سے یہ امور ماخوذ اور مستنبط تھے! لہٰذا اپنی دینی ذمہ داریوں سے گریز اور فرائض دینی کی ادائیگی سے فرار کی جملہ راہیں راقم کے لیے مسدود ہو چکی تھیں۔ گویا راقم کا حال فیضؔ کے اس شعر کے مطابق تھا کہ ؎

جز دار اگر کوئی مفر ہو تو بتاؤ
ناچار گنہگار سوئے دار چلے ہیں!

(۲) دوسری طرف جماعت اسلامی کی پوری قیادت سے شدید مایوسی کی کیفیت تھی جو اجتماع ماچھی گوٹھ کے باعث شدید تر ہی نہیں وسیع ت بھی ہوگئی تھی۔ اس لیے کہ اب یہ کیفیت صرف مولانا مودودی اور اُن کے ہم نوا لوگوں کے بارے ہی میں نہیں تھی، مولانا اصلاحی اور اُن کے ہم خیال حضرات کے بارے میں بھی تھی ----- بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ماچھی گوٹھ کے اجماع کے بعد اس ضمن میں مؤخر الذکر کا پلڑا بھاری ہو چکا تھا۔

اس سلسلے میں اپنے شدتِ احساس کے اظہار کے لیے اُس واقعے کے بیان میں کوئی حرج نہیں ہے کہ ماچھی گوٹھ کے اجتماع سے فراغت کے فوراً بعد صادق آباد میں سردار محمد اجمل خان لغاری سے ملاقات ہوئی تو گفتگو کے دوران میری مایوسی اور دل شکستگی ان الفاظ کا

جامہ پہن کر زبان پر آ گئی کہ: ''میں اس وقت جماعت اسلامی کا ابلیس ہوں!'' اس پر اُس شدید قلبی لگاؤ کی بنا پر جو سردار صاحب مرحوم کو مجھ سے تھا ان کی زبان سے فوراً یہ الفاظ نکلے ''معاذ اللہ!! خدا کے لیے ایسے الفاظ زبان سے نہ نکالیں!'' تب میں نے وضاحت کی کہ ''ابلیس کے لفظی معنی انتہائی مایوس شخص کے ہیں' اور اس وقت میرا حال واقعتاً یہ ہے کہ میں جماعت کی پوری قیادت سے انتہائی درجہ میں مایوس ہو چکا ہوں' اس لیے کہ مولانا مودودی اور ان کے ہم نوا حضرات سے تو میں ماچھی گوٹھ آنے سے قبل ہی مایوس ہو چکا تھا' ماچھی گوٹھ میں مولانا اصلاحی اور اُن کے ہم خیال لوگوں کے طرزِ عمل کو دیکھ کر اُن سب سے بھی قطعاً مایوس ہو گیا ہوں' تو بتایئے کہ اب میرے لیے امید کی روشنی کہاں باقی رہ گئی؟''

(۳) تیسری جانب یہ اندیشہ شدت کے ساتھ لاحق تھا کہ جماعت زندگی کے سہارے کے بغیر موجودہ حالات میں انسان کا عزیمت کی راہ پر گامزن رہنا تو درکنار کسی مقام پر کھڑے رہنا بھی ناممکن کی حد تک مشکل ہے۔ اس لیے کہ انسان اگر مسلسل آگے نہ بڑھ رہا ہو تو ع ''سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں'' کے مطابق ایک مقام پر کھڑے رہنا بھی ممکن نہیں ہوتا بلکہ گوناگوں ''عذرات'' کی بنا پر فوراً ریورس گیئر (Recerse Gear) لگ جاتا ہے اور انسان ''رخصت'' کی ڈھلوان راہ پر پھسلتا چلا جاتا ہے!----اِدھر ''من آنم کہ من دانم'' کے مصداق اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کی ''بضاعت مزجات'' (سورہ یوسف: ۸۸) اور اِس سے بھی بڑھ کر اپنی کم عمری بھی لامحالہ پیشِ نظر تھی لہٰذا اس کا کوئی امکان نظر نہ آتا تھا کہ خود اپنے بل پر کسی نئی جماعت یا تنظیم کے قیام کی کوشش کی جائے!!

اس سلسلے میں بھی ایک لطیفہ (یا کثیفہ؟) ریکارڈ پر آ جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اجتماع ماچھی گوٹھ سے متصلاً قبل کا ذکر ہے کہ ایک روز شاہ عالم مارکیٹ لاہور کے ایک ہوٹل میں حکیم عبدالرحیم اشرف اور ان کے ہم خیال وہم نوا' اور کاروباری شریک چودھری عبدالحمید (مرحوم) سے ملاقات ہوئی تو اثنائے گفتگو میں حکیم صاحب کی زبان سے مولانا مودودی کی شان میں ایک استہزائیہ جملہ نکل گیا۔ اس پر میں اُن پر برس پڑا اور میں نے نہایت درشتی اور گستاخی کے ساتھ کہا: ''حکیم صاحب! آپ لوگوں کا معاملہ تو یہ ہے کہ جماعت میں شامل

ہونے سے پہلے بھی مولوی تھے' اور نماز روزہ اور شعائرِ دینی کے پابند' آپ نے جماعت میں شامل ہو کر گویا اپنے مذہبی لباس پر تحریک اور تنظیم کی شیروانی مزید پہن لی تھی' اور اب اگر آپ اس شیروانی کو اتار بھی دیں گے تو کوئی بڑی بات نہیں ہوگی' اس لیے کہ اندر سے مکمل مولوی پھر برآمد ہو جائے گا' جبکہ ہمارا معاملہ اس کے برعکس بہت نازک ہے۔ ہمارا دین و مذہب سے کل تعلق اس کے حرکی تصور کے حوالے سے ہے اور شدید خطرہ ہے کہ اگر تحریکی وابستگی برقرار نہ رہ تو کہیں نماز روزہ سے بھی نہ جاتے رہیں' اور چہروں سے داڑھیاں تک غائب نہ ہو جائیں!'' (اس پر حکیم صاحب موصوف نے جو جواب دیا وہ اگرچہ اس وقت کی گفتگو سے تو متعلق نہیں ہے' تاہم مناسب ہے کہ ریکارڈ پر لے آیا جائے' انہوں نے فرمایا: ''ڈاکٹر صاحب! آپ اِس وقت صدمہ کی جس کیفیت سے دوچار ہیں' ہم اُس سے گزر چکے ہیں' اور اب ہم پر اُس شخص کی سی کیفیت طاری ہے جو اپنی مایوسی اور دل شکستگی کے کرب کو خوش گپیوں کے ذریعے کم کرنے کی کوشش کرتا ہے!'')

قصہ مختصر' اواخر فروری ۱۹۵۷ء سے اواخر اپریل تک کے دو ماہ راقم پر۔

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

کے مصداق اسی ''پس چہ باید کرد'' اور

"To Be Or Not To Be Is The Question"

کی ادھیڑ بُن میں گزرے----- تا آنکہ ماہ رمضان مبارک کا آخری عشرہ آن پہنچا تو میں اس کے نصف آخر میں (زندگی میں پہلی بار) اعتکاف کے لیے منٹگمری کے محلّہ اسلام آباد کی جامع مسجد میں داخل ہو گیا جس کے امام اور خطیب مولوی شمس الدین صاحب تھے جو مقامی جماعت کی امارت سے میری معزولی[۱] کے بعد سے اس منصب پر فائز تھے۔

---

(۱) یہ معاملہ بھی دلچسپ اور لائق ذکر ہے۔ اواخر اکتوبر یا اوائل نومبر ۱۹۵۶ء تک' جب میری حاضری یا ''پیشی'' بمقام اوکاڑہ جائزہ کمیٹی کے سامنے ہوئی' میں مقامی جماعت ساہیوال کا امیر تھا۔ لیکن جیسے ہی میرے اختلافی خیالات کی بھنک مرکز میں پہنچی' میری معزولی کا حکم صادر ہو گیا۔ میں نے احتجاجاً امیر جماعت کی خدمت میں عریضہ ارسال کیا کہ اگرچہ پالیسی کے بارے میں میری رائے مختلف ہے ◄◄

اعتکاف کی حالت میں کامل یکسوئی کے ساتھ غور وفکر کے باوجود پورے تین دن اسی تذبذب کے عالم میں گزرے-----لیکن چوتھے روز علی الصبح مولوی شمس الدین صاحب ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' کا تازہ پرچہ لے کر آئے تو گویا مجھے اشارۂ غیبی حاصل ہو گیا۔ اس لیے کہ اس کے ''اشارات'' میں مولانا مودودی نے ''ضعف ارادہ بسیط'' اور ''ضعف ارادہ مرکب'' کے حوالے سے جماعت کی پالیسی اور طریق کار کے بارے میں اختلافِ رائے کے حامل لوگوں کی کردارکشی کی بھرپور کوشش کی تھی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ اگرچہ ماچھی گوٹھ میں اختلاف رکھنے والے لوگوں پر جن حدود و قیوذ اور پابندیوں اور قدغنوں کا فیصلہ ہوا ہے

اس نے انہیں پہلے ہی

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کر مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے!

کا مصداق کامل بنا دیا ہے، لیکن غالباً مولانا مودودی اس پر بھی مطمئن نہیں ہیں بلکہ عملاً اپنے اُسی فیصلے پر کاربند ہیں جس کا ذکر انہوں نے ماچھی گوٹھ کے لیے روانہ ہوتے وقت لاہور ریلوے اسٹیشن پر چودھری غلام محمد مرحوم سے کیا تھا۔ یعنی: ''میں ان لوگوں سے تنگ آ چکا

◄◄ تاہم میں نے جماعت کے لیے سرگرمی کے ساتھ کام کرنے میں ہرگز کوئی کمی نہیں کی ہے، تو کیا صرف اختلافِ رائے بھی کوئی جرم ہے؟ مزید براں جماعت کے دستور کی رو سے امیر حلقہ تو مرکز کا نامزد کردہ ہوتا ہے لہٰذا اُس کی معزولی کا اختیار بھی مرکز کو ہے، لیکن مقامی جماعت کے امیر کو تو ارکان جماعت منتخب کرتے ہیں، لہٰذا اسے معزول کرنے کا اختیار بھی ان ہی کو ہونا چاہیے، مزید یہ کہ: ''مجھے اس اعتبار سے تو بہرحال خوشی ہوئی ہے کہ ایک ذمہ داری سر سے اتر گئی اور ایک بوجھ سے کندھا ہلکا ہو گیا لیکن اس اعتبار سے دکھ ہوا ہے کہ اگر ان چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی دستور کی روح اور معروف طریق کار کی پیروی نہ کی جائے تو پھر آخر کہاں کی جائے گی'' (تحریر ۲۰ر نومبر ۱۹۵۶ء) -----لیکن وہاں جب مولانا عبد الجبار غازی، مولانا عبد الغفار حسن، حکیم عبد الرحیم اشرف اور شیخ سلطان احمد ایسے اہم حضرات تک کے معاملے میں نہ دستور کی پرواہ تھی نہ عرفِ عام کی پیروی تو---''تا بہ دیگراں چہ رسد؟''-----کے مصداق میں کس کھیت کی مولی تھا!!

ہوں اور اب مزید اُن کے ساتھ نہیں چل سکتا' اب اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ انہیں ذلیل کر کے جماعت سے نکال دیا جائے!'' اس پر ذہن اور قلب نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ قبل اس کے کہ نوبت وہاں تک پہنچے کیوں نہ خود ہی پیش قدمی کر کے مولانا کی اس تشویش کو فوری طور پر رفع کر دیا جائے ----- چنانچہ میں نے قلم اٹھایا اور ۲۹ر رمضان المبارک ۱۳۷۶ھ کو بحالت صوم و اعتکاف' بصد حسرت و یاس' اور نہایت بوجھل دل کے ساتھ جماعت کی رکنیت سے استعفاء تحریر کر دیا۔ گمان غالب یہ ہے کہ یہ ماہ اپریل کی ۲۶ تاریخ تھی (جو اتفاقاً میری تاریخ پیدائش بھی ہے!) مقامی جماعت کے احباب' بالخصوص مولوی شمس الدین صاحب نے تو میرے استعفے کو آگے بھیجنے (یعنی Forward کرنے) میں تقریباً دو ہفتے لیے۔ اور اس کے دوران میں مجھے استعفاء واپس لینے پر آمادہ کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی' جس میں بعض ہم عمروں کی منت سماجت بھی شامل تھی اور بعض بزرگوں کی محبت آمیز فہمائش بھی۔ بالآخر مایوس ہو کر مولوی شمس الدین صاحب نے مجھے ۱۰ مئی ۵۷ء کو خط لکھا:

> ''نہایت افسوس کے ساتھ آج ارکانِ جماعت نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ آپ کا استعفاء منظوری کے لیے جناب امیر جماعت کے پاس بھیج دیا جائے----- آپ نے شفاخانہ میں روزانہ دو گھنٹے بلا معاوضہ کام کرنے کی جو پیشکش کی ہے' اسے ہم شکریئے کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ باقاعدگی کے ساتھ وقت دیتے رہیں گے۔ خاکسار شمس الدین' امیر جماعت اسلامی منٹگمری''۔

اِسی طرح دفتر حلقہ نے بھی اپنے حصے کی کارروائی کے لیے لگ بھگ ایک ہفتہ لے لیا' اس لیے کہ وہاں سے میرے استعفے کے ساتھ جو خط (یعنی Coering Letter) مرکزی دفتر پہنچا اس پر تاریخ تحریر ۱۸ مئی درج تھی (اگرچہ مجھے اب یہ قطعاً یاد نہیں ہے کہ اس دوران میں حلقے کے ذمہ دار حضرات کی جانب سے میرے ساتھ کوئی سلسلہ جنبانی قائم کیا گیا تھا یا نہیں) لیکن مرکز میں تو گویا میرے استعفے کا شدت سے انتظار ہو رہا تھا کہ جیسے ہی امیر حلقہ کا خط پہنچا غالباً اُسی لمحے منظوری کا خط بھی ارسال کر دیا گیا جس پر ۱۹ مئی ۵۷ء کی تاریخ درج

تھی اور عبارت حسب ذیل تھی:

''محترمی ومکرمی چودھری عبدالرحمٰن صاحب' امیر جماعت اسلامی' حلقہ اوکاڑہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بحوالہ آپ کا خط نمبر ۴۲۲ مورخہ ۱۸ مئی ۵۷ء ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا جماعت کی رکنیت سے استعفاء جناب امیر جماعت اسلامی پاکستان مولونا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے منظور فرما لیا ہے' اور ان کا نام ارکانِ جماعت کی فہرست سے خارج کر دیا گیا ہے۔

خیر اندیش: صدر حسن صدیقی' ناظم شعبۂ تنظیم جماعت اسلامی' پاکستان

نقول بنام (۱) جناب شمس الدین صاحب' امیر جماعت اسلامی' منٹگمری شہر

(۲) ڈاکٹر اسرار احمد صاحب' معرفت دفتر جماعت اسلامی' منٹگمری شہر۔''

اور اس طرح راقم الحروف کی زندگی کا وہ دس سالہ دور اختتام کو پہنچ گیا جس کی حسین یاد ابھی تک نہاں خانۂ قلب میں محفوظ ہے[1] ----- لیکن یہ واضح رہے کہ میں نے صرف جماعت اسلامی سے تنظیمی تعلق منقطع کیا تھا' تحریک اسلامی سے ہرگز نہیں ---- اس کے ساتھ تو میرا ذہنی اور عملی دونوں طرح کا تعلق بحمد اللہ دن بدن مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ پہلے کسی موقع پر اپنی اس کیفیت کے اظہار کے لیے کہ جماعت سے تنظیمی تعلق

---

(۱) صحیح تر الفاظ میں میرا جماعت اسلامی سے تعلق ساڑھے نو برس رہا۔ اس لیے کہ میں نے اوائل نومبر ۴۷ء میں واردِ لاہور ہوتے ہی جماعت اسلامی لاہور کے کرشن نگر کے حلقہ ہمدرداں سے تنظیمی تعلق استوار کر لیا تھا۔ اور چونکہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ایف ایس سی کی تعلیم کے دوران میں کرشن نگر ہی میں اپنے ایک عزیز کے مکان پر مقیم رہا' لہٰذا میری تنظیمی وابستگی بھی اسی حلقہ جماعت کے ساتھ رہی۔ میڈیکل کالج کے پانچ سال میں نے اسلامی جمعیت طلبہ کے ساتھ گزارے، اور جس دن فائنل ایم بی بی ایس کا نتیجہ نکلا اسی دن رکنیت جماعت کی درخواست تحریر کر دی۔ مولانا اصلاحی مولانا مناظر احسن گیلانی کے بارے میں اپنے استاذ و امام مولانا حمید الدین فراہیؒ کا ایک جملہ نقل کیا کرتے ہیں کہ: ''ہمارے مناظر احسن کے سارے ہی مناظر احسن ہیں!'' اسی طرح جماعت کے ساتھ میری اس ساڑھے نو سالہ وابستگی کے دوران کی ساری ہی یادیں حسین اور دلکش ہیں' سوائے ۵۳-۵۲ء کے سیشن کے درمیانی چھ ماہ جن کے دوران میرا جمعیت کی کراچی کی قیادت سے مزاجی اور نظریاتی دونوں طرح کا تصادم رہا۔ یا یہ ۵۷-۵۶ء کے آخری چھ ماہ جن کے دوران کی بعض یادیں کرب ناک ہی نہیں سوہانِ روح ہیں!

کے انقطاع کے باوجود، تحریک اسلامی کے ساتھ وابستگی کی شدت میں اضافہ ہوتا چلا گیا راقم نے علامہ اقبال کے اس شعر کا حوالہ دیا تھا کہ

تخم جس کا تو ہماری کشت جاں میں بو گئی
شرکت غم سے وہ الفت اور محکم ہو گئی!

آج اس کیفیت کی تعبیر کے لیے تو ایک دوسرا شعر بھی ذہن میں آ رہا ہے۔ یعنی

ہوئے ہیں وہ جس دن سے ناراض شعرؔی
ترقی پہ ہے اضطرابِ محبت

لیکن مناسب یہ ہے کہ اپنی اس سرگزشت کے اختتام پر فیض احمد فیضؔ کے وہ اشعار درج کر دوں جو اُس زمانے میں طویل عرصے تک میرے قلب و ذہن کی دنیا پر چھائے رہے تھے' اور جنہوں نے بلاشبہ مجھے اپنے عزم کے برقرار رکھنے میں بہت مدد دی تھی:

یہ فصل امیدوں کی ہمدم
اس بار بھی غارت جائے گی
سب محنت صبحوں شاموں کی
اب کے بھی اکارت جائے گی!

دھرتی کے کونوں کھدروں میں' پھر اپنے لہو کی کھاد بھرو!
پھر مٹی سینچو اشکوں سے' پھر اگلی رت کی فکر کرو!

پھر اگلی رت کی فکر کرو' جب پھر اک بار اجڑنا ہے
اک فصل پکی تو بھر پایا' تب تک تو یہی کچھ کرنا ہے!

مولانا اصلاحی اور دیگر اکابر کی علیحدگی

اجتماع ماچھی گوٹھ کے بعد لگ بھگ ایک سال کے عرصے کے دوران جن ارکانِ جماعت نے رکنیت سے استعفاء دیا' اُن میں سے جو کُل پاکستان سطح پر معروف تھے' ان کی فہرست میں اوپر سے پہلے نمبر مولانا امین احسن اصلاحی تھے۔ اور نیچے والوں میں آخری نام اس خاکسار کا تھا! یہی وجہ ہے کہ جہاں بعض دوسرے حضرات کی طرح میرے استعفے کا تو گویا بے چینی سے 'انتظار' کیا جا رہا تھا (ع ''ماسراپا انتظار' اُو منتظر!!)۔ وہاں مولانا اصلاحی کو استعفے سے باز رکھنے اور رکنیت جماعت برقرار رکھنے پر آمادہ کرنے کے لیے سرتوڑ کوششیں ہوئیں (۱)۔ چنانچہ ایک جانب ایک جانب ''مصالحت کنندگان'' نے ایک عرصے تک سلسلۂ جنبانی جاری رکھا' تو دوسری جانب انہیں یہ پیشکش کی گئی کہ آپ جماعت کی عام تنظیمی اور عوامی سرگرمیوں سے منقطع ہو کر خالص علمی وفکری اور تحقیقی و تصنیفی کام میں لگ جائیں۔ چنانچہ جماعت کے مرکزی دفتر کے قریب ایک کوٹھی کرایہ پر لی گئی' اسے نہایت شاندار انداز میں مرصع و مفرش (Furnish) کیا گیا اور اُن کے ظاہری اعزاز و اکرام اور خاطر مدارت (Pampering) کا خصوصی اہتمام ہوا۔ اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان باتوں کا ایک حد تک خاطر خواہ اثر بھی مولانا کی طبیعت نے قبول کیا۔ چنانچہ سکھر کے جناب نجیب صدیقی صاحب کی روایت ہے کہ اجتماع ماچھی گوٹھ کے کچھ عرصے بعد مولانا اصلاحی سکھر تشریف لے گئے اور وہاں انہوں نے اُن ارکانِ جماعت کو جو اجتماعِ ماچھی گوٹھ سے پہلے غیر مطمئن اور اب بالکل مایوس تھے جماعت کی رکنیت سے مستعفی ہونے سے باز رکھنے کی بھرپور کوشش کی' اور ہر ممکن طریقے پر ترغیب دی کہ وہ جماعت کے اندر رہتے ہوئے اصلاحِ حال کی کوشش کریں۔ اگرچہ اُن کے اعتراضات کا اُن کے پاس کوئی معقول جواب موجود نہ تھا!

(۱) یہی وجہ ہے کہ مستعفی ہونے میں ترتیب بالکل برعکس رہی' چنانچہ ان میں سب سے پہلا نمبر میرا تھا اور سب سے آخری مولانا اصلاحی کا!

ویسے بھی مولانا اصلاحی نے اس پورے عرصے کے دوران اس موقف سے اتفاق کا کم ازکم 'اظہار' نہیں کیا تھا کہ جماعت اپنے سابقہ طریق کار سے کلی طور پر منحرف ہو چکی ہے' بلکہ اُن کا علانیہ موقف صرف یہ تھا کہ ہم ''عدم توازن'' کا شکار ہو گئے ہیں' باقی مولانا مودودی کے ساتھ اُن کی اصل 'جنگ' دستورِ جماعت اور اس کے ضمن میں جمہوریت اور شورائیت کی اہمیت کے مسئلے پر تھی! اور اس کے سلسلے میں جو کچھ ماچھی گوٹھ میں ''خلوتیانِ راز'' کی محفل میں طے پا چکا تھا اُس سے وہ بالکل بے خبر تھے[1]۔

ع ''کب کھلا تجھ پر یہ راز' انکار سے پہلے کہ بعد؟'' کے مصداق مولانا اصلاحی پر یہ راز اس وقت بم کے دھماکے کے مانند کھلا' جب ۱۹۵۷ء کے اواخر میں کوٹ شیر سنگھ (ضلع لاہور) میں مجلس شوریٰ (جو اب جماعت کے لیے ایک نئے دستور کی تدوین کے اختیار کی حامل ''مجلس دستور ساز'' کی حیثیت بھی اختیار کر چکی تھی) کا اجلاس منعقد ہوا۔ اور اس میں مولانا مودودی نے تنظیم اور تحریک کے فرق اور تحریک اسلامی کے قائد و امیر کے حقوق و اختیارات کے ضمن میں اپنا وہ فلسفہ شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا جو ہفت روزہ ''آئین'' کے حوالے سے ''میثاق'' دسمبر ۸۹ء میں شائع شدہ تحریر میں وارد ہوا ہے۔ تب مولانا اصلاحی کو محسوس ہوا کہ جمہوریت اور شورائیت کا کم از کم وہ تصور جس کے وہ شدت سے قائل تھے ع ''آں قدح بشکست و آں ساقی نماند'' کے مانند نسیاً منسیاً ہوا چاہتا ہے' اور اب جو فضا جمعت میں پیدا ہو چکی ہے اس میں اس کے حق میں آواز اُٹھانا بھی ممکن نہیں رہا۔ چنانچہ وہ خاموشی کے ساتھ اجلاس سے اٹھے اور لاہور واپس آ گئے۔ اس کے بعد بھی بعض مخلصین نے ''مصالحت'' کے لیے کسی قدر تگ و دَو کی' جو بری طرح ناکام ہو گئی۔ اور بالآخر ایک جانب ۱۳ جنوری ۱۹۵۸ء کو مولانا نے قطعی اور حتمی انداز میں جماعت کی رکنیت سے مختصر خط کے ذریعے استعفاء دے دیا۔ اور دوسری جانب چند دنوں بعد جب وجوہِ استعفاء کے استفسار

حاشیہ (۱): گویا اس کیفیت کے بالکل برعکس کہ

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں آید راز　　　ورنہ در محفل رنداں خبرے نیست کہ نیست!

اور یہ غالباً مولانا کی تصوف سے دشمنی ہی کا مظہر تھا!!

کے لیے آنے والے اشخاص اور خطوط کا تانتا بندھ گیا تو کسی قدر تفصیلی تحریر لکھ دی جس نے بعد میں ایک ''گشتی مراسلے'' کی صورت اختیار کر لی جس کا تذکرہ اس سے قبل ہو چکا ہے ----- اور اگرچہ ۱۳ جنوری ۵۸ء کے بعد مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے مابین جن تیز و تند' اور تلخ و ناخوشگوار خطوط کا تبادلہ[1] ہوا وہ اِس

حاشیہ (۱): یہ خط و کتابت ہفت روزہ ''ندا'' کے ۷ اور ۱۴ مارچ ۱۹۸۸ء کے دو شماروں میں شائع ہو چکی ہے۔

داستان کا الم ناک ترین' اور عبرت ناک ترین باب ہے۔ تاہم ان سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہم اس ''نقضِ غزل'' کے ضمیمے کے طور پر خود اپنے استعفے کے ساتھ مولانا اصلاحی کا بھی صرف استعفے کا خط اور مذکورہ گشتی مراسلہ شائع کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس طرح ''نقضِ غزل'' کے دو خلاصے قارئین کے سامنے آ جائیں گے یعنی پہلا جماعت کی ایک چوٹی کی شخصیت کے تجربہ و تجزیہ پر مشتمل' اور دوسرا ایک عام کارکن کے مشاہدات اور آراء پر مبنی جو نہ ارکانِ شوریٰ میں سے تھا' نہ اربابِ حل و عقد میں' لہٰذا رازہائے درونِ پردہ سے ناواقف تھا۔

راقم الحروف اور مولانا اصلاحی کے استعفوں کے درمیانی نو ماہ کے دوران جو نمایاں اور معروف لوگ جماعت سے علیحدہ ہوئے اُن کا معاملہ دوسرے اعتبارات سے بھی راقم اور مولانا کے بین بین رہا۔ چنانچہ ان میں سے بعض حضرات کے استعفوں کا تو شدت سے انتظار ہو رہا تھا' یہاں تک کہ بعض (جیسے مثلاً مولانا عبدالغفار حسن) کے ساتھ تو یہ معاملہ بھی پیش آیا کہ اِدھر انہوں نے استعفاء مرکز ارسال کیا' اُدھر مرکز سے اظہارِ وجوہ کا طلبی نامہ روانہ ہو گیا کہ 'وجوہات بیان کیجیے کہ کیوں نہ آپ کو جماعت سے خارج کر دیا جائے' اور دونوں کا ڈاک میں کراس ہوا' جبکہ بعض دوسرے حضرات (جیسے مثلاً سردار محمد اجمل خان لغاری مرحوم) کو جماعت میں روکے رکھنے کی شدید اور پیہم کوششیں ہوئی[1]۔

---

(۱) اور یہ اس لیے کہ سردار صاحب مرحوم و مغفور سابق ریاست بہاولپور میں مولانا مودودی کی دعوت پر لبیک کہنے والے پہلے شخص تھے' اور نہ صرف یہ کہ اس علاقے میں جماعت کی دعوت کے فروغ کا سہرا سب سے بڑھ کر انہی کے سر ہے' بلکہ علاقے کے ایک بڑے جاگیردار خاندان سے متعلق ہونے کے ناطے اس علاقے کے جملہ وابستگان بلاواسطہ یا بالواسطہ کسی نہ کسی درجہ میں اُن کے حسنِ سلوک کے ممنون ◄◄

مزید برآں اِن میں سے ہر ایک کے پاس ع ''جو میں بت کدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری!'' کے مصداق ایک دل خراش داستان ہے جس کو سن کر انسان دم بخود رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دنوں جن ''بقیہ السلف'' حضرات سے ملاقات ہوئی (بقیہ ہالسلف' اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ ''کشتۂ شمشیر'' تو وہ تھے) انہوں نے جب اپنے زخم دکھانے شروع کیئے تو راقم کو اپنی داستان ہیچ نظر آنے لگی۔ چنانچہ یہ عام تأثر سامنے آیا کہ ''تم نے نقض غزل'' کے ضمن میں بڑی لمبی لمبی چھلانگیں لگائی ہیں' جس کے نتیجے میں بہت سے تلخ تر حقائق و واقعات بیان ہونے سے رہ گئے ہیں'' تاہم اس پر تقریباً اجماع نظر آیا کہ کسی ایک شخص کے لیے اِن تمام سرگذشتوں کا بیان کرنا ناممکن ہے' اس کی تو صرف ایک ہی صورت ممکن ہے اور وہ یہ کہ ہر شخص اپنا اپنا ماجرا خود تحریر کرے (چنانچہ بعض حضرات نے اس کا ارادہ بھی ظاہر کیا)۔

اس سلسلے میں محترم شیخ سلطان احمد صاحب کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ ''آئین'' کے مضمون نگار نے ان کے بارے میں تحریر کیا ہے:

> ''مولانا سلطان احمد صاحب (سابق قائم مقام امیر جماعت اسلامی پاکستان) کے بارے میں ایک مرتبہ میری چودھری غلام محمد مرحوم سے گفتگو ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ مولانا سلطان احمد صاحب کو جماعت کی پالیسی سے کوئی ایسا اختلاف نہ تھا جو دور نہ ہوسکتا ہو۔ لیکن بعض دیگر حضرات کی طرح وہ اس وقت کی صورتِ حال سے دل گرفتہ ہو گئے تھے اور ان کا ذہنی سکون بری طرح متأثر ہو گیا تھا۔ (۱)''

◄◄ احسان رہے تھے' یادش بخیر اسی نوع کی ایک شخصیت صوبہ سرحد میں خان سردار علی خاں مرحوم کی تھی۔ ان کا یہ قول بھی ریکارڈ پر آ جائے تو مناسب ہے جو انہوں نے مولانا اصلاحی سے مخاطب ہو کر کہا تھا: ''مولانا ہمیں آپ سے کلی اتفاق ہے اور ہم آپ کی ایک ایک بات کو درست سمجھتے ہیں لیکن ہم سید ابوالاعلیٰ مودودی کا ساتھ اس لیے نہیں چھوڑ سکتے کہ ہم ''خوانین سرحد'' پر گزشتہ صدی کے بھی ایک سید (سید احمد شہیدؒ) سے بے وفائی کا الزام تاحال قائم ہے!''

(۱) گویا وہی نعیم صدیقی صاحب کا ماچھی گوٹھ کی تقریر والا حربہ' جو انہوں نے مولانا اصلاحی کے خلاف استعمال کیا تھا!

جبکہ واقعہ یہ ہے کہ راقم نے اپنی حالیہ ملاقاتوں میں متذکرہ بالا تاثر بھی سب سے زیادہ شدید ان ہی میں پایا۔ اوراس انتہائی رائے میں بھی سب سے بڑھ کر جازم اُن ہی کو پایا کہ مولانا مودودی کے جماعت کی امارت سے استعفے کے بعد سے لے کر اجتماعِ ماچھی گوٹھ کے اختتام تک کے تمام واقعات ایک سوچے سمجھے منصوبے اور پوری مہارت کے ساتھ ''پلاٹ'' کئے گئے ''ڈرامے'' کے مظہر ہیں!

’نقضِ غزل‘ کا حاصل

مولانا مودودی مرحوم کے اس ’’نقضِ غزل‘‘(۱) کے نتیجے میں جماعت اسلامی کے جن ارکان نے جماعت سے علیحدگی اختیار کی اُن کی کل تعداد تو غالباً ایک سو سے زائد نہ تھی، لیکن مجموعی تعداد سے اہم تر بات یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں جماعت اسلامی کی قیادت کی صف دوم تقریباً بالکل ’صاف‘ ہوگی --- اس پہلو سے جو شدید نقصان جماعت اور تحریک کو پہنچا اس کا کسی قدر اندازہ حسب ذیل تجزیئے سے ہوسکتا ہے:

(ا): وہ چاروں حضرات جماعت کی رکنیت سے مستعفی ہو گئے جن پر گزشتہ دس سال کے عرصے میں وقتاً فوقتاً مولانا مودودی کی نظر بندی کے دوران امارتِ جماعت کی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالا گیا تھا، اور اس طرح گویا جماعت میں ان کی حیثیت اور مرتبہ و مقام مسلّم تھا، یعنی مولانا عبدالجبار غازی، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا عبدالغفار حسن، اور شیخ سلطان احمد۔ واضح رہے کہ ان ہی میں سے تین حضرات جائزہ کمیٹی کے رکن بھی تھے۔

(۲): جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کی اکثریت یا باضابطہ علیحدہ ہوگئی یا ’’مفلوج‘‘ ہوکر رہ گئی، اس لیے کہ اُن بیس ارکان میں سے جو عرصہ؛ دراز سے تقریباً مستقل طور پر شوریٰ میں شامل چلے آرہے تھے اور اس طرح گویا جماعت میں انہیں ’’ارباب حل وعقد‘‘ کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی، آٹھ تو جماعت سے باضابطہ علیحدہ ہو گئے، یعنی متذکرہ بالا چار حضرات کے علاوہ حکیم عبدالرحیم اشرف (کنو ینر جائزہ کمیٹی)۔ چودھری عبدالحمید (فیصل آباد)۔ جناب سعید ملک (لاہور) اور سردار محمد اجمل خان لغاری (رحیم آباد' ریاست بہاولپور)۔ اور بقیہ بارہ میں سے بھی کم از کم نصف ایسے تھے جنہوں نے رکنیت جماعت سے مستعفی ہونے کا انتہائی قدم تو فوری طور پر نہیں اٹھایا لیکن ان کے خیالات و نظریات وہی تے جو مستعفی ہونے والے حضرات کے تھے، لہٰذا وہ جماعت میں عضو معطل ہو کر رہ گئے ----- چنانچہ اُن میں سے بعض کو تو یہ صدمہ گھن کی طرح کھا گیا۔ اور وہ جلد ہی انتقال کر

حاشیہ(۱): بحوالہ سورۃ النحل آیت ۹۲

گئے جیسے محمد باقر خاں (ملتان) اور دوسرے کچھ عرصہ کے بعد مختلف وقفوں کے ساتھ جماعت کو چھوڑ گئے جیسے مولانا عبدالحق جامعی (خان پور) ڈاکٹر محمد نذیر اسلم (رحیم یار خاں) اور سید وصی مظہر ندوی (حیدر آباد' سندھ) وغیرہم۔ اور بعض جماعت کے ساتھ چلتے تو زندگی کے آخری لمحے تک رہے' لیکن ان میں وہ پچھلا سا جوش و خروش باقی نہ رہا جیسے خان سردار علی خاں (سرحد)۔

(۳): مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا عبدالغفار حسن کے علاوہ جماعت کے ارکان میں سے صرف ایک ہی عالم دین اور تھے جو تصنیف و تالیف کی بنا پر معروف تھے' یعنی مولانا افتخار احمد بلخی (مرحوم)۔ وہ بھی جماعت سے علیحدہ ہو گئے۔

(۴): اسی طرح روزنامہ صحافت کے میدان میں بھی صرف دو ہی ارکان جماعت نمایاں ہوئے تھے' یعنی جناب سعید ملک' اور ارشاد احمد حقانی' یہ دونوں بھی جماعت کو چھوڑ گئے۔

جماعت اسلامی کی قیادت کی دوسری صف کی اس پوری ٹیم کے دفعتاً میدان سے ہٹ جانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ جماعت میں فوری طور پر شدید قحط الرجال پیدا ہو گیا [۱] جس کے اثرات تاحال محسوس ہو رہے ہیں' کہ

نہ اٹھا پھر کوئی رومیؔ عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گِل ایراں' وہی تبریز ہے ساقی

کے مصداق جماعت میں پھر نہ کوئی صاحب فکر اور صاحب تصنیف عالم ابھر کر سامنے آ سکا'

---

(۱) اس ضمن میں بھی یہ لطیفہ یا کثیفہ ریکارڈ ہو جائے تو اچھا ہے کہ سانحہ ماچھی گوٹھ کے کچھ عرصے بعد مولانا مودودی مرحوم دورے پر کراچی تشریف لے گئے تو وہاں اجتماعِ ارکان میں جماعت سے ایسے اہم لوگوں کی علیحدگی پر اکثر ارکانِ جماعت نے شدید تشویش کا اظہار کیا۔ اس پر مولانا مودودی نے اعداد و شمار کے حوالے سے جواب دیا کہ جتنے لوگ جماعت سے علیحدہ ہوئے ہیں انہی دنوں میں ان سے زائد جماعت میں شامل ہو گئے ہیں' تو ایک خاتون نے مولانا کی خدمت میں ایک رقعہ ارسال کیا جس پر درج تھا: ''مولانا آپ نے ہیرے پھینک کر جھولی میں کنکریاں بھر لی ہیں!'' اور یہ خاتون شیخ سلطان احمد صاحب کی اہلیہ محترمہ تھیں! جو شیخ صاحب موصوف کے مستعفی ہو جانے کے بعد بھی کافی عرصہ تک جماعت کی رکن رہیں!

نہ کوئی نیا ادیب یا صحافی منظر عام پر آ سکا (اس میدان میں آ کر کچھ نوجوان سامنے آئے بھی' تو انہوں نے اپنا ''جداگانہ تشخص'' برقرار رکھنے کو ترجیح دی' اور جماعت میں شمولیت کو اپنے مقام سے فروتر گردانا!) ----- نہ ہی کوئی صاحب فکر داعی سامنے آ سکا جو اپنے زورِ خطابت سے ''روح کو تڑپا دے اور قلب کو گرما دے!''

اور اس سے بھی بڑھ کر روح فرسا اور حسرت ناک نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ جماعت کے دَورِ اول کے ان ''باقیات الصالحات'' کے جماعت سے علیحدہ ہونے کے بعد جماعت کو تیزی سے اپنے سابق موقف سے کامل انحراف' سابقہ پالیسیوں میں بنیادی تبدیلیوں' اور عوام الناس کے حافظے کے کمزور ہونے کے مشہور اصول پر اعتماد کرتے ہوئے پے در پے قلابازیاں کھانے اور ع ''چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک تیز رو کے ساتھ!'' کے مصداق آئے دن بلا جھجک اپنی وفاداریوں اور سیاسی ''قبلوں'' کے تبدیل کرنے سے روکنے والی کوئی مؤثر قوت موجود نہ رہی' یہی سبب ہے اس کا کہ: ''یَوۡمَ تُبَدَّلَ الۡاَرۡضُ غَیۡرَ الۡاَرۡضِ وَالسَّمٰوٰتُ'' کے مصداق جماعت کی زمین بھی تبدیل ہوگئی اور آسمان بھی بدل گیا۔ تا آنکہ آج صورت یہ ہے ع ''کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی!''

(۵): متذکرہ بالا حضرات تو وہ ہیں جو اُس وقت کُل پاکستان سطح پر معروف تھے (اور اُن کی یہ فہرست بھی ظاہر ہے کہ کسی طرح مکمل نہیں ہوسکتی۔ اس لیے کہ اس کی بنیاد صرف حافظہ اور یادداشت پر ہے) ان کے علاوہ ایسے حضرات کی فہرست بہت طویل ہے جو اپنے اپنے علاقوں اور حلقوں میں مختلف اعتبارات سے معروف اور ممتاز تھے' جیسے مثلاً کراچی میں جناب ظفر الاحسن' اور شیخ جمیل الرحمٰن جماعت کے ساتھ طویل تعلق کے علاوہ اصابت رائے کے اعتبار سے معروف تھے' تو ڈاکٹر مسعودالدین حسن عثمانی مرحوم سرگرم اور فعال ترین کارکنوں کی فہرست میں بلندترین مقام پر فائز ہونے کے علاوہ انفاق مال اور خدمت خلق کے اعتبار سے بہت مشہور تھے۔ اسی طرح فیصل آباد کے میاں فضل احمد مرحوم جماعت سے طویل تعلق اور اصابت رائے کے اعتبار سے ممتاز تھے تو چودھری قدرت علی حلقہ کے قیم ہونے کی بنا پر معروف تھے' اسی طرح لاہور میں چودھری قدرت علی کے چھوٹے بھائی جناب

مصطفیٰ صادق بھی چونکہ طویل عرصہ تک حلقہ لاہور کے قیم رہے تھے لہٰذا تنظیمی و انتظامی صلاحیتوں کی بنیاد پر تو نمایاں تھے ہی' اب صحافت کے میدان میں بھی قدم رکھ چکے تھے' اور ان کے علاوہ مولوی محی الدین سلفی مرحوم' مولوی برکت علی' خلیفہ نذیر احمد اور میاں محمد اسلم نہایت فعال کارکنوں میں شامل تھے۔اسی طرح ساہیوال سے جو ارکان جماعت سے علیحدہ ہوئے ان میں میرے بڑے بھائی اظہار احمد اس اعتبار سے نمایاں تھے کہ ان کا تحریک سے تعلق قبل از تقسیم ہند سے تھا اور وہ اس زمانے میں اپنی گزیٹڈ افسری کی قربانی دے چکے تھے جب یہ بہت بڑا عہدہ شمار ہوتا تھا' تو سید شیر محمد شاہ' نور محمد قریشی اور حافظ خادم احمد وغیرہم نہایت سنجیدہ لیکن فعال کارکنوں میں شامل تھے۔----- وَقِس علٰی ذٰلِك!!

اس ''نقضِ غزل'' کا شکار ہونے والے جتنے ارکانِ جماعت سے میں ذاتی طور پر واقف ہوں ان میں نوجوان اور وجیہہ' ذہین اور فطین' فعال اور سرگرم' محنتی اور ایثار پیشہ' اور سنجیدہ و متین لیکن خوش گفتار و خوش مزاج کارکنوں کا سب سے حسین گل دستہ سکھر شہر سے تعلق رکھتا تھا۔اُن میں محترم نجیب صدیقی صاحب کے علاوہ جن کے نام یاد آ سکے وہ ہیں: میاں محمد لطیف مرحوم' شیخ سرتاج الدین سولیجہ مرحوم' شیخ محمد عمر' خورشید عاقل صدیقی' جناب عزیز حمیدی اور جناب عبد السمیع۔ ان سب حضرات کے چہرے اب بھی میری نگاہوں کے سامنے ہیں اور یہ پورا گل دستہ میرے لیے تا حال ؎

پھر رہا ہے میری آنکھوں میں وہی جانِ بہار
جس کا رنگ کوئی پھول گلستاں میں نہیں

کی حیثیت رکھتا ہے۔

اور یہ تو صرف اُن ارکانِ جماعت کے نام ہیں جن سے میں متعارف تھا' اور ان میں سے بھی صرف وہ جو فی الفور یاد آ سکے (ویسے جیسے جیسے یادداشت کا محافظ خانہ کھلا ہے کچھ اور نام بھی یاد آ رہے ہیں' جیسے کراچی کے جناب سالم جان اور احتشام الدین' فیصل آباد کے چودھری غلام حسین رندھاوا اور حافظ علم الدین' منڈی ڈھاباں سنگھ کے مولانا محمد حنیف امرتسری' شیخوپورہ کے ڈاکٹر نذیر محمد اور گگو منڈی کے مولوی عبدالرحیم وغیرہم۔لیکن ظاہر

ہے کہ اس فہرست کو لمبا کرنے سے کچھ حاصل نہیں، اصل قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک خلوص و اخلاص کا مجسمہ اور وفا کا پتلا تھا)۔ جماعت سے علیحدگی کے عمل کے دوران یہ سب نہایت شدید صدمہ سے دوچار رہے، اس کے بعد بھی ان سب پر ایک عرصے تک سکتہ سا طاری رہا، اور بالآخر سب کے سب حسرت و یاس کی تصویر بن کر رہ گئے۔

ان حوادث کے باعث رنج و غم اور صدمہ کی شدت کے اندازے کے لیے چند مثالیں کفایت کریں گی:

(۱): مولانا عبدالجبار غازیؒ نے نومبر دسمبر ۵۶ء کی جائزہ کمیٹی کی رپورٹ والے اجلاسِ شوریٰ کے دوران رو رو کر مولانا مودودی کو جماعت کے ابتدائی ایام کی کیفیات یاد دلائیں اور گڑگڑا کر کہا کہ ''مولانا! خدا کے لیے باہمی اعتماد کی وہی فضا دوبارہ پیدا کرنے کی کوشش کیجیے!'' لیکن جب انہیں مولانا کی جانب سے سرد مہری کا احساس ہوا تو اس صدمہ کے باعث ان پر دل کا دورہ پڑا اور وہ صاحب فراش ہو گئے۔ اور اس کے چند ہی روز بعد وہ خاموشی کے ساتھ ماچھی گوٹھ کے اجتماع سے بہت پہلے ہی رکنیت سے مستعفی ہو کر راولپنڈی چلے گئے۔

(۲): گگو منڈی کے مولوی عبدالرحیم ایک نوجوان اہل حدیث عالم دین تھے۔ اور ان کی بہت طویل اور گھنی داڑھی تھی۔ ایک بار وہ جماعت اسلامی ساہیوال کے شفا خانے میں مجھ سے ملاقات کے لیے آئے تو اس وقت کے حالات پر اس طرح دھاڑیں مار مار کر روئے کہ چپ کرانا محال ہو گیا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ

(۳): میرے اور مولانا عبدالغفار حسن کے ایک مشترک عزیز عتیق احمد صاحب ایم اے، ایل ایل بی علیگ (مرحوم) ماچھی گوٹھ جاتے ہوئے اختلاف کے تذکرے اور چرچے سے اتنے شدید متاثر ہوئے کہ فوری طور پر دماغی توازن کھو بیٹھے، چنانچہ انہیں راستے ہی میں رحیم یار خاں کے اسٹیشن پر اتار لینا پڑا، اور ان کی تیمارداری کی مصروفی کے باعث مولانا عبدالغفار حسن بھی اجتماعِ ماچھی گوٹھ میں صرف جزوی طور پر شریک ہو سکے! یہ چند مثالیں ''نمونہ مشتے از خروارے'' کے مصداق ہیں...... ع ''قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا!!''۔

اور یہ تو ''نقضِ غزل'' کے نقصانات کا صرف ایک رخ ہے!

اس بھیانک تصویر کا دوسرا اور افسوس ناک تر رُخ یہ ہے کہ صرف ان چند علماء کرام کو چھوڑ کر جو جماعت میں شامل ہونے سے پہلے بھی مذہبی زندگی ہی بسر کرتے تھے' اور جو جماعت سے علیحدگی کے بعد بھی خدمت دین کے ضمن میں مختلف النوع مشاغل جیسے تصنیف وتالیف' تعلیم وتدریس' تبلیغ واصلاح' یا خطابت وامامت میں مصروف ہو گئے' جماعت سے مستعفی ہونے والے لوگوں کی عظیم اکثریت رفتہ رفتہ ماحول میں جذب ہوتی چلی گئی۔ ان میں سے بعض تو اس حد تک بھی پہنچ گئے کہ نماز روزے سے بھی گئے اور داڑھیاں بھی غائب ہو گئیں' اکثر وبیشتر نے روایتی طور پر دین کے شعائر کی تھوڑی بہت پابندی تو جاری رکھی لیکن اپنی توانائیوں اور صلاحیتوں کو بگٹٹ حصولِ دنیا کے رُخ پر ڈال دیا! اور اس کے ضمن میں مجبوری کے عذر کے تحت زمانے کے جملہ مروّجہ طور طریقے اختیار کر لیے!! اور اس طرح گویا ان کی اخلاقی اور روحانی موت واقع ہو گئی ------ راقم کو جب کبھی ایسے لوگوں کا خیال آتا ہے تو کبھی تو یہ مصرعہ ذہن میں گونجنے لگتا ہے کہ ع ''میں کس کے ہاتھ یہ اپنا لہو تلاش کروں؟''۔ اور کبھی یہ شعر ذہن میں اٹک کر رہ جاتا ہے ؂

ممکن ہو گر تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تُو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے؟

بعض حضرات ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو حصولِ دولت کی دوڑ' اور معیارِ زندگی کو بلند سے بلند تر کرنے کے جنون سے تو بچا لیا لیکن خواہ اس سبب سے کہ عمر کی ایک خاص حد سے گزر جانے کے باعث کسی نئے تجربے یا از سرِ نو عزمِ سفر کی ہمت نہ رہی' خواہ اس وجہ سے کہ کوئی نیا قافلہ تشکیل نہ پا سکا' یا ع ''پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں'' کے مصداق کسی نئے ''پر دل نہ ٹھکا' بہر حال جب اقامت دین کے رُخ پر کوئی عملی پیش قدمی نہ ہو سکی تو اُن کی صلاحیتیں ٹھٹھر کر رہ گئیں اور وہ ع ''میں ہوں اپنی شکست کی آواز!'' کے مصداق کامل ------ اور ؂

تری رہبری کا یہ فیض ہے' قدم اہل شوق کے رک گئے

نہ کوئی جوازِ سفر ملا، نہ کوئی دلیل قیام ہے!!

کی مجسم تصویر بن کر رہ گئے!

اور اس داستان کا الم ناک ترین باب یہ ہے کہ بعض اکابر علماء جو جماعت میں تھے تو شعلہ جوالہ اور مجسم حرکت وعمل تھے رفتہ رفتہ ؎

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
ہو گئے خاک انتہا یہ ہے!

کی تصویر بن گئے۔ اور جیسے جیسے وقت گزرا ان کے دینی فکر اور مذہبی تصورات میں سے تحریکی عنصر ختم ہوتا چلا گیا تا آنکہ آج حال یہ ہے کہ جن کے نزدیک کبھی دعوتِ دین اور اقامت دین کی جدوجہد فرضِ عین کا درجہ رکھتی تھی آج مختلف حیلوں بہانوں سے اُس کا استخفاف کر کے صرف علمی وتعلیمی کاموں کو کافی وشافی قرار دے رہے ہیں، اور جن کے نزدیک کبھی التزامِ جماعت لازم اور لابدّ منہ ہوا کرتا تھا آج جماعت سازی کو ''فتنہ'' قرار دے رہے ہیں اور اس طرح ع ''بہ بیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا'' اور ع ''کہ ہم نے انقلاب چرخِ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں'' سے بھی بڑھ کر اِس شعر کے مصداق کامل بن گئے ہیں کہ ؎

خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!

الغرض اکابر واصاغر اور عالموں اور عامیوں سمیت جماعت سے علیحدہ ہونے والے لوگوں کی اکثریت دین کے کم از کم تحریکی تصور سے، نظری نہیں تو عملی طور پر دست بردار ہو گئی۔ اور اب ان میں سے بیشتر کا حال اس شعر کے مطابق ہے کہ ؎

بجھی عشق کی آگ اندھیرے ہے
مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے

اور صرف معدودے چند لوگوں کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ع ''ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک!'' یا کم از کم ع ''آگ بجھی ہوئی نہ جان، آگ دبی ہوئی سمجھ!'' کے مصداق ہیں!۔

گویا بحیثیت مجموعی جماعت سے علیحدہ ہونے والے لوگوں پر یہ شعر صدفی صد راست آتا ہے کہ ؎

سب کہاں؟ کچھ لالہ و گُل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں!

اور اس طرح ''نقض غزل'' کے اس حادثہ فاجعہ نے دودھاری تلوار کا کام کیا کہ ایک جانب دعوتِ دین اور تحریک اسلامی کو شدید نقصان پہنچایا تو دوسری طرف ایک معتد بہ تعداد میں مخلص اور متحرک خادمانِ دین کو کم از کم تحریکی اعتبار سے موت کے گھاٹ اتار دیا ع ''ڈھونڈ اب اُن کو چراغِ رُخِ زیبا لے کر''۔

مؤلف کا

استعفاء

از رکنیت جماعت

(اپریل ۱۹۵۷ء)

☆

اور

درخواست رکنیت

(نومبر ۱۹۵۴ء)

☆

”یہی انجام کا مارا ہوا دل
ہلاک عشرت آغاز بھی ہے!“

مولف کا جماعت اسلامی کی رکنیت سے

استعفاء

(اپریل ۱۹۵۷ء)

ذیل ی سطور ۲۹ رمضان المبارک کو مسجد میں اعتکاف کی حالت میں لکھ رہا ہوں اور ان کے ذریعے اُس فیصلے کا اظہار مقصود ہے جس پر میں حالت اعتکاف میں مسلسل تین روز کے سوچ و بچار کے بعد پہنچا ہوں' یعنی یہ کہ میں جماعت اسلامی کی رکنیت سے مستعفی ہو جاؤں۔

---

۱۵ نومبر ۵۴ء کو جب میں نے جماعت کی رکنیت کے لیے درخواست تحریر کی تو جماعت کے بارے میں میرا نقطۂ نظر یہ تھا:

''میں یہ محسوس کرتا ہوں اور آج سے نہیں بلکہ آج سے چار سال قبل سے محسوس کر رہا ہوں کہ اقامت دین میرا فرض ہے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ میں اس دُور میں پیدا ہوا جبکہ خالصتاً اقامت دین کے کام کے لیے جماعت اسلامی قائم ہو چکی ہے اور میں آسانی کے ساتھ اس میں شریک ہو کر اپنے فرض سے عہدہ برآہ ہونے کے لیے سعی کر سکتا ہوں۔ اس لحاظ سے میں جماعت اسلامی کے وجود کو اپنے لیے ایک نعمت متصور کرتا ہوں۔ اس لیے کہ اگر یہ نہ ہوتی تو خود کام کرنا بہر حال بس میں نہ ہوتا اور اللہ تعالیٰ کے ہاں باز پُرس کڑی ہو جاتی......'' اور

''...... میں یہ سمجھتا ہوں کہ پوری دنیا میں خالص تحریک اسلامی محض جماعت اسلامی ہے (پاکستان کی بھی اور ہندوستان کی بھی) البتہ دینی مقاصد کے لیے اور اچھے کام کرنے والے اور ادارے بھی ہیں اور جماعتیں بھی ہیں۔ پاکستان میں بھی اور باقی

دنیا میں بھی۔ ان اداروں یا جماعتوں نے مجھے اس حدتک تو متاثر کیا ہے لیکن جماعت اسلامی کے سوا کسی اور ادارے یا جماعت کے مقصد اور طریق کار کو میں خالصتاً اسلامی اور ٹھیٹھ دینی نہیں سمجھتا!......''

بدقسمتی سے جماعت کے بارے میں میرا یہ نقطۂ نظر زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ فروری ۵۵ء میں میری درخواست رکنیت منظور ہوئی اور اس کے چند ہی ماہ بعد سے جماعت کے بارے میں میرے شکوک وشبہات بڑھنے شروع ہو گئے تا آنکہ اجتماع سالانہ تک میں جماعت اسلامی پاکستان کے بارے میں کم از کم اپنے فہم کی حد تک ایک جچی تلی رائے قائم کر چکا تھا۔ اس اجتماع کے موقع پر جماعت کے اندر بے اطمینانی اور پالیسی کے بارے میں اختلاف کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کر دی گئی اور میں مطمئن ہو گیا کہ ایک پُرسکون ماحول اور افہام وتفہیم کے انداز میں کمیٹی کے سامنے اپنی بات رکھ سکوں گا۔ اجتماع سے واپسی کے بعد میں جائزہ کمیٹی کی آمد کے انتظار میں رہا۔ بالآخر ۳۰ ستمبر ۵۶ء کو بمقام اوکاڑہ ترمیم شدہ جائزہ کمیٹی سے گفتگو کا شرف حاصل ہوا اور اواخر اکتوبر تک میں نے اپنے خیالات کو ایک مفصل بیان کی شکل میں قلم بند کر کے مولانا عبدالرحیم اشرف صاحب کنوینر جائزہ کمیٹی کی خدمت میں پیش کر دیا۔

اپنے اس بیان میں، میں نے قبل از تقسیم ہند کی جماعت اسلامی اور بعد از تقسیم کی جماعت اسلامی پاکستان کا تفصیل کے ساتھ موازنہ اور مقابلہ کیا اور اپنی ناقص قوتِ تحریر کی حد تک پوری طرح محنت اور کوشش کر کے اپنی یہ رائے واضح کی کہ پالیسی اور طریق کار کے اعتبار سے تقسیم سے ماقبل اور اس کے مابعد کی جماعت میں واضح تفاوت واختلاف بلکہ تضاد پایا جاتا ہے۔ اور جبکہ قبل از تقسیم کی جماعت ایک خالص اور ٹھیٹھ اسلامی تحریک کا نقشہ پیش کرتی ہے وہاں بعد از تقسیم کی جماعت ایک اسی قومی، سیاسی جماعت بن گئی ہے جس میں دین کا داعیہ چاہے کم یا زیادہ موجود ہو خالص اسلامی تحریک کی خصوصیات موجود نہیں ہیں۔ پھر اپنی محدود بصیرت کے مطابق میں نے اس بنیادی غلطی کی نشاندہی بھی کی کہ جس کے

باعث اس تحریک کی نوعیت میں اس قدر عظیم الشان فرق آ گیا تھا۔ آخر میں، میں نے لکھا تھا:

"میں نے نہ یہ کہا ہے اور نہ میں ایسا سمجھتا ہوں کہ ۴۷ء میں جب طریق کار تبدیل کیا گیا تو دانستہ طور پر ان لازمی نتائج کو جاننے کے باوجود اور اس تبدیلی کا ادراک کرنے کے باوجود کیا گیا جو اس طرح اس پوری تحریک کی بنیادی نوعیت میں برپا ہو رہی تھی۔ لیکن یہ بہر حال میں سمجھتا ہوں اور اسی کو وضاحت کے ساتھ میں نے اس قدر طویل تحریر میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ طریق کار کی اس تبدیلی نے جماعت کو سطحی طور پر متاثر نہیں کیا بلکہ اس کو جڑوں سے لے کر شاخوں تک اور سرے سے لے کر پیر تک بدل کر رکھ دیا ہے......

میری رائے میں اصل تحریک اسلامی ۴۷ء میں حقیقتاً اور اصولاً ختم ہو گئی تھی۔ اس کے بعد جماعت اسلامی کی قومی جدو جہد کے ساتھ ساتھ اس اصل تحریک اسلامی کے کچھ اثرات ایک عرصہ تک برسر کار رہے ہیں لیکن اب وہ بھی دم توڑ چکے ہیں اور اب اس تحریک میں سے کچھ باقی ہے تو وہ ان چند پاک نفوس کے سوا اور کچھ نہیں ہے جنہیں اس اصل تحریک اسلامی کی دعوت نے کھینچا تھا اور جو ابھی تک جماعت اسلامی کی قومی تحریک کا دامن اسی اصل تحریک اسلامی کے مغالطے میں تھامے چلے آ رہے ہیں!"

اس میں صرف اس بات کا اضافہ اور کر لیجئے کہ اس قدر شدید رائے رکھنے کے باوجود اس وقت تک میں مایوس نہیں تھا بلکہ ایک طرف مجھے قوی امید تھی کہ:

"...... مجھے اب مستقبل کے بارے میں کوئی امید ہے تو وہ بھی ان پاک نفوس کے خلوص سے ہے کہ اگر آج بھی ان پر واضح ہو جائے کہ فلاں جگہ سے ہم غلط موڑ مڑ آئے ہیں اور اب غلط راستے پر چل رہے ہیں تو وہ آگے ہی بڑھنے کی دُھن میں غلط راستے ہی پر چلتے رہنے کو گوارا کرنے کی بجائے واپس مڑ کر صحیح راستہ اختیار کرنے میں پس و پیش سے کام نہ لیں گے چاہے اس طرح انہیں ایک طویل مسافت کو دوبارہ قطع کر کے سفر کو تقریباً از سر نو ہی شروع کرنا پڑے......"

اور دوسری طرف اپنے ہی برسر غلط ہونے کے امکان کے پیش نظر میں نے یہ گزارش بھی کی تھی:۔

''......پھر اللہ گواہ ہے کہ اس بات کے کہنے میں کوئی بری نیت محرک نہیں بنی ہے۔
اس غرض سے یہ گزارشات پیش کر رہا ہوں کہ اس طریقے سے اللہ تعالیٰ ہماری غلطی کو (اگر وہ ہے!) واضح کر دے تو فبہا' ورنہ کم از کم مجھ پر تو اپنی غلطی واضح ہو جائے گی اور میں زیادہ اطمینانِ قلب کے ساتھ تحریک اسلامی کے ساتھ وابستہ ہو کر عملاً کام کرسکوں گا!'

یہی وجہ ہے کہ اس بیان کے تحریر کرنے تک مجھ پر نہ بددلی چھائی اور نہ ہی قویٰ میں جمود پیدا ہوا بلکہ میں حسب سابق تندہی کے ساتھ جماعت کا کام کرتا رہا۔ اپنے بیان میں' میں نے لکھا تھا کہ اب تک:

''جماعت اور اس کے کام کے لیے سرگرمی اور محویت میں میرے اندر کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے......!''

جائزہ کمیٹی کی رپورٹ پیش ہونے سے لے کر اجتماع ماچھی گوٹھ تک جماعت اسلامی پاکستان کے حلقوں میں جن ناخوشگوار اور کریہہ واقعات کا چکر چلا ہے ان کو محض یاد کرنے ہی سے انسان کو سخت ذہنی اذیت اور روحانی کرب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس پندرہ روزہ شوریٰ کے دوران جس میں رپورٹ پر غور ہوا شوریٰ کے فعال عناصر کا دو متقابل اور متحارب گروہوں میں تقسیم ہو جانا' بہت ردّ و قدح کے بعد اور بالآخر ''خوفِ انتشار'' کی بنا پر بالاکراہ کسر و انکسار کے ذریعے ایک لایعنی اور مہمل قرارداد کا پاس ہونا، پھر اس کی مختلف توجیہیں اور جماعت کے مختلف حلقوں کی طرف سے مختلف ردّعمل' اس کے نتیجے کے طور پر سازشوں کی برملا تہمتیں' اکابرین جماعت کا ایک دوسرے کے بارے میں انتہائی گری ہوئی رایوں کا اظہار' سعید ملک کا سنسنی خیز استعفاء اور اس کا اسی انداز میں قیم جماعت کی طرف سے تعاقب' امیر جماعت کا جائزہ کمیٹی کے چاروں ارکان پر نجویٰ' گروہ بندی اور ''غیر شعوری سازش'' کا الزام' مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کا استعفاء از رکنیت جماعت' امیر جماعت کا جذباتی انداز میں استعفاء از امارتِ جماعت' ایسے الفاظ کے ساتھ کہ جس سے کچھ لوگوں نے سمجھا کہ اب مولانا تا دمِ حیات کبھی

امارت کا منصب دوبارہ قبول نہ کریں گے جبکہ کچھ دوسرے لوگوں نے سمجھا کہ یہ محض ایک اظہار اعتماد (Vote Of Confidence) کا مطالبہ ہے اور پھر جماعت کے اندر ایک مہم کے انداز میں امیر جماعت پر قرار دیا جائے اعتماد' دو ارا کین مرکزی شوریٰ کی رکنیت جماعت کا تعطل' مولانا عبدالجبار غازی صاحب کا استعفاء از رکنیت' مولانا عبد الغفار حسن صاحب کا استعفاء از مناصب جماعت' سلطان احمد صاحب کا استعفاء از رکنیت شوریٰ، اور اختلاف کرنے والے لوگوں کا یہ حال کہ انتہائی سخت باتیں کہہ رہے ہیں' گھناؤنے سے گھناؤنے الزامات لگائے جا رہے ہیں' صرف یہی نہیں بلکہ نیتوں پر شدید حملے ہو رہے ہیں اور حال ہی کے نہیں ماضی کے واقعات سے استشہاد ہو رہا ہے۔ لیکن جب کہا جاتا کہ شرافت کے ساتھ اس گند سے نکلیے اور جو کام ان سے بن پڑتا ہے انہیں کرنے دیجئے اور جو کام آپ کر سکتے ہوں آپ باہر جا کر کیجئے تو اس بات سے باصرار انکار ---- یہ سارے معاملات میرے لیے اس اعتبار سے تو غیر متوقع نہ تے کہ میری تو رائے ہی یہ تھی اب جماعت ایک قومی سیاسی جماعت بن گئی ہے اور یہ اس کے ناگزیر ثمرات ہیں لیکن اس لحاظ سے کمر توڑ دینے والے تھے کہ جماعت میں اخلاقی تنزل اور گراوٹ کے بارے میں ابھی اتنی پست رائے میں نے بھی قائم نہیں کی تھی! اس عرصہ میں' میں اولاً تو جماعت کی رکنیت سے زبانی استعفاء مقامی امیر جماعت کے سامنے پیش کر دیا۔ لیکن جب مقامی اراکین و امیر اور حلقہ کے ذمہ دار حضرات نے سمجھایا کہ اجتماع ماچھی گوٹھ تک صبر کر لو تو میں نے بھی اس بات کو معقول اکر اپنا استعفاء واپس لے لیا۔

اجتماع سے کچھ دن قبل اطلاعات ملنی شروع ہوئیں کہ لاہور میں مطلع صاف ہو رہا ہے' اور ایک بار پھر سمجھوتے کی کوشش ہو رہی ہے تاکہ اجتماع ارکان سے قبل ہی شوریٰ کی طرف سے ایک متفقہ قرارداد منظور ہو جائے اور ارکان کے سامنے اکابرین جماعت کا اختلاف رائے پیش نہ ہو۔ اس پر میں نے دیگر پانچ ارکانِ جماعت اسلامی منٹگمری کی شرکت میں

ایک مفصل خط قائم مقام امیر جماعت کے توسط سے جماعت کی شوریٰ کو لکھا (وہ جماعت کے ریکارڈ میں محفوظ ہوگا اسے دیکھ لیا جائے!) جس میں شوریٰ سے یہ گزارش کی گئی تھی کہ بار بار ایسی کمزور مصالحت کی کوششیں نقصان دہ ثابت ہوں گی جس کی بنیاد کسی مثبت اور واقعی اساس کی بجائے جماعت کے اندر انتشار کے خوف کی منفی اساس پر ہو۔ اکابرین جماعت میں جو دو نقطہ ہائے نظر پالیسی اور طریق کار کے بارے میں پائے جاتے ہیں انہیں صاف صاف اراکن میں آجانا چاہیے اور پھر ارکان کو شعوری طور پر یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ وہ کدھر جانا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد دوسرے گروہ کے لیے صحیح یہ ہوگا کہ اگر وہ ارکان کے رجحان کے ساتھ RECONDCILE کرسکیں تو فبہا' ورنہ جماعت کے اندر مزید فساد کرنے اور کش مکش برپا کرنے کی نسبت خود ان کے لیے بھی اور جماعت کے حق میں بھی بہتر یہی ہے کہ وہ جماعت سے نکل جائیں۔ خط کے آخر میں خط لکھنے والوں نے اپنے بارے میں دو صورتیں تجویز کی تھیں:

> ''اولاً یہ کہ کم از کم ہمیں اس بات کا پورا موقع دیا جائے کہ ہم اجتماع ارکان میں اپنے نقطۂ نظر کو وضاحت سے رکھ دیں اس کام کے لیے جتنا وقت ہمیں درکار ہو ہمیں دیا جائے اور ہم پر کوئی روک ٹوک نہ کی جائے کہ یہ کہا جاسکتا ہے اور یہ نہیں' تاکہ ہم پورے طور پر مطمئن ہو جائیں کہ ہم نے اپنی بات کہہ دی ہے۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ ہم ''منافقت'' کے ساتھ چلنے کو اپنے اوپر بھی ظلم سمجھتے ہیں' اس لیے کہ اس طرح آخرت میں اجر تو دُور رہا عذاب کا خطرہ نظر آتا ہے' اور جماعت پر بھی ظلم سمجھتے ہیں کہ ہم اس کے مجموعی ذہن سے علیحدہ ایک ذہن رکھتے ہیں اور پھر بھی ساتھ چلیں اور عملاً اس کا حاصل یہ ہو کہ نہ خود چلیں اور نہ دوسروں کو چلنے دیں۔
>
> اور اگر یہ بھی قابل قبول نہ ہو تو ہمیں اجتماع سے قبل ہی مطلع کر دیا جائے۔ ہم اس کے لیے پورے انشراحِ صدر کے ساتھ تیار ہیں کہ خاموشی کے ساتھ جماعت سے علیحدہ ہو جائیں اور نہ اپنی منزل کھوٹی کریں اور نہ جماعت کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑے ہوں۔ ہماری اس طرح کی علیحدگی ان شاء اللہ جماعت کے لیے نقصان کا موجب نہ ہوگی بلکہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس طرح ہم شاید جماعت کی

کوئی نہ کوئی خدمت ہی سرانجام دے سکیں گے"۔

ماچھی گوٹھ حاضر ہوا تو جس چیز کا خدشہ تھا وہی ہوا۔کلھیا میں گُڑ پھوڑا جا چکا تھا۔ایک متفقہ قرارداد شوریٰ کی طرف سے اجتماعِ ارکان میں پیش ہونی تھی۔اجتماع کا سارا پروگرام ایک سوچی سمجھی سکیم کے ساتھ اس طرح بنایا جا چکا تھا کہ اول تو کوئی اختلافی آواز اٹھائی ہی نہ جا سکے اور اٹھے بھی تو پوری طرح محبوس ہو کر۔میں یہاں منتظمین اجتماع کی نیتوں پر حملہ نہیں کرنا چاہتا انہوں نے جو کچھ کیا انتہائی خلوص کے ساتھ "اھوَنُ البلیّتین" کے مشہور و معروف فلسفہ کے تحت ایک بہت بڑے شَر یعنی جماعت کے انتشار سے بچنے کے لیے کیا۔ لیکن یہ بھی بہر حال اپنی جگہ ایک واقعہ ہے کہ اجتماع کو جس طرح CONDUCT کیا گیا اس میں کسی اختلافی آواز کا اُٹھنا خصوصاً ایسی حالت میں کہ "اکابرین" میں سے کوئی میدان میں رہا ہی نہیں تھا، چند بے وقعت "اصاغرین" باقی تھے، ممکن نہ تھا! مولانا مودودی کے لیے درآں حالیکہ وہ اُس وقت امیر نہیں تھے غیر محدود وقت کی کھلی چھٹی اور اختلاف کرنے والوں کے لیے سختی سے جھگڑا کر کر کے محدود وقت دینا اور پھر اس پر سختی سے عمل کرانا۔اور باوجود اس کے کہ یہ ایک غیر معمولی اور ہنگامی اجتماع تھا ابتداء سے اس کا پروگرام معمولی اجتماعات کی طرح بنا کر بہت سا وقت قیم جماعت کی رپورٹ پر صَرف کر دینا خواہ خلوص کے ساتھ ہی ہوا ہو، بہر حال اختلاف کرنے والوں کے ساتھ انصاف نہ تھا۔

"تَحۡسَبُهُمۡ جَمِيۡعًا وَ قُلُوۡبُهُمۡ شَتّٰى" کا جو منظر اس اجتماع میں پیش کیا اس میں جماعت کے لیے بڑی عبرت ہے۔بالکل مختلف الخیال اور متضاد آراء کے حامل لوگوں کو جوڑ کر ساتھ لے کر چلنے کی کوشش یہی نتائج برپا کر سکتی ہے۔قرارداد شوریٰ کی متفق علیہ تھی اور مبینہ طور پر مولانا مودودی صاحب کو شوریٰ ہی نے SPOKESMAN بنا کر اس قرارداد کی تشریح پر مامور کیا تھا لیکن مولانا کی چھ گھنٹے سے زائد تقریر کے بعد بھی مولانا امین احسن اصلاحی نے محسوس کیا کہ اس قرارداد کے کچھ "مضمرات اور مقدرات" بیان ہونے سے رہ گئے ہیں اور پر ان کو بیان کرنے جو کھڑے ہوئے تو ایک ایسی تقریر کر ڈالی کہ مولانا مودودی

صاحب کی پوری تقریر کی تردید ہوگئی اور مجبوراً نعیم صدیقی صاحب کو اصلاحی صاحب کی تقریر کے اثرات دھونے کے لیے تقریر کرنی پڑی اور یہاں تک کہنا پڑا کہ اصلاحی صاحب امراضِ دماغی میں مبتلا ہیں۔ متعدد معزز اراکین شوریٰ کا یہ حال رہا کہ ''مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِكَ'' نہ اِدھر ہوتے ہیں نہ اُدھر' ابھی قرارداد سے اتفاق ہے تو ابھی اتفاق ختم ہو گیا ہے اور اختلاف پیدا ہو گیا ہے' تا آنکہ ایک صاحب اپنا اتفاق واپس لے کر ایک متبادل قرارداد لاتے ہیں اور اس کے حق میں ایک طویل' مدلل اور مفصل تقریر کرتے ہیں' لیکن آخر میں اچانک خود اپنی ہی پیش کردہ قرارداد واپس لے کر سٹیج سے اُتر آتے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ!

میرے لیے اس میں بھی کوئی عجیب بات نہ تھی' اس لیے کہ میں پہلے ہی اپنے خط میں لکھ چکا تھا:

''اس طرح 'حب علیؓ' کی بجائے 'بغض معاویہؓ' پر جو اتحاد قائم ہو' ظاہر ہے کہ اس کی بنیاد بے حد کمزور ہوگی......''

ذاتی طور پر میں اس اجتماع میں ایک بڑے مخمصہ میں پھنس گیا تھا۔ مولانا مودودی صاحب نے پالیسی کی جو تشریح بیان کی اس سے میرا اضطراب کم ہونے کی بجائے کچھ مزید ہی ہو گیا تھا۔ اب میرے سامنے دو راستے تھے ایک یہ کہ اپنی بات بیان کرنے کی کوشش کروں' اس صورت میں اپنی بے بضاعتی اور عدم قدرتِ کلام مانع آتے تھے۔ میں سوچتا تھا کہ اس نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنے گا! لہٰذا بولنے کا حشر معلوم۔ دوسرے یہ کہ خاموش رہوں۔ اس شکل میں بھی دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ جماعت کے اندر رہوں۔ لیکن اس صورت میں اگر اب نہیں بولتا تو آئندہ کسی موقع پر بولنا غلط ہوگا۔ ہر شخص یہ معقول بات کہہ سکے گا کہ جہاں بولنے کا موقع تھا وہاں بولے نہیں' اب کیوں فساد مچاتے ہو' دوسری یہ کہ جماعت کو خاموشی سے چھوڑ جاؤں۔ اس صورت میں بھی جماعت کا یہ الزام اور یہ حجت مجھ پر قائم ہو جاتی تھی کہ بغیر اختلاف کا اظہار کیے نکل جانا صحیح نہیں ہے! چنانچہ میں نے طے کیا کہ جو ہو سو ہو بہر حال اپنی بات ارکان کے سامنے رکھنے کی کوشش کروں گا!

اس خیال سے کہ اگر پہلے سے معلوم ہو جائے کہ مجھے کتنا وقت مل سکے گا تو اسی کے

مطابق اپنی تقریر تیار کر سکوں، میں نے متعدد بار چودھری غلام محمد صاحب [1] سے جو اجتماع CONDUCT کر رہے تھے پوچھا کہ مجھے آپ کس قدر وقت دے سکیں گے۔ جواب ہر بار یہی ملا کہ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا، چنانچہ میں اپنی کوئی تقریر تیار نہ کر سکا۔ جو قرارداد میں نے مرتب کر کے دی اس کے لیے

ایک طویل تقریر ہونی چاہیے تھی لیکن کچھ معلوم نہیں تھا کہ وقت بھی مل سکے گا یا نہیں حتیٰ کہ عین وقت پر بھی تکرار ہی ہو کر رہی۔ آدھ گھنٹے کے بحث مباحثے کے بعد مجھے غالباً ڈھائی گھنٹے دیئے گئے لیکن اب میں تھا اور میرا بیان تقریر کوئی تیار نہ تھی! دوسری طرف اس آدھ گھنٹے کے بحث مباحثے نے مجھے پہلے ہی بدحواس کر دیا تھا۔ میں نے اپنا بیان پڑھنا شروع کیا تو پے در پے INTERRUPTIONS کی گئیں، درشت حتیٰ کہ ناشائستہ کلمات تک کہے گئے اور میں صبر کے گھونٹ پی پی کر اپنا بیان پڑھتا رہا۔ وقت معینہ کے اندر بیان ختم بھی نہ ہو پایا اور مجھے لاچار بیان کو ادھورا ہی چھوڑ دینا پڑا۔

میرے لیے اپنا یہ انجام تو قطعاً غیر متوقع نہ تھا، لیکن جماعت کے اراکین کی ایک بہت بڑی تعداد نے اس اجتماع کے موقع پر اور خصوصاً میری تقریر کے دوران جس اخلاق کا مظاہرہ کیا اس پر ضرور دُکھ ہوا۔ اکابرین جماعت اس پر بھی ہر چیز کے بہتر پہلو ہی پر نظر رکھنے کے اصول کے تحت یہ کہہ کر مطمئن ہو جائیں کہ یہ سب کچھ دراصل اس لیے ہوا کہ اراکین جماعت کو اپنا مسلک کس قدر عزیز ہے کہ وہ کسی دوسری بات کو سن نہیں سکتے (جیسا کہ فی الواقع مولانا مودودی نے کہا بھی!) تو وہ ایسا کرنے کا اختیار رکھتے ہیں لیکن اگر عبرت حاصل کرنی ہو تو محض اس اجتماع کے موقع پر ارکان نے جس ''اخلاق، ضبط اور نظم'' کا ثبوت دیا ہے وہی جماعت کے تیزی سے روبہ انحطاط ہونے کی سب سے بڑی اور سب سے روشن دلیل ہے۔

یہ سب کچھ اپنی جگہ ----- لیکن اس اجتماع کا ایک پہلو میرے لیے بہت تسکین اور تسلی کا موجب بھی ہوا اور وہ یہ کہ مولانا مودودی نے اس اجتماع میں ایک بہت پختہ اور

(۱) اللہ تعالیٰ ان کی خطاؤں سے درگزر فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

مضبوط موقف (FIRMSTAND) اختیار کیا اور پوری جرأت کے ساتھ اپنی بات کہی اور کھلم کھلا اپنے آئندہ کے عزائم کا اظہار کیا۔ اس طرح اس مرتبہ قرارداد اور اس کے مفہوم میں وہ گنجلک پن اور ابہام باقی نہ رہا جو دسمبر ۵۶ء کی شوریٰ کی قرارداد میں پایا جاتا ہے۔ مولانا نے جس مضبوطی اور ہمت کے ساتھ اپنی بات صاف صاف رکھ دی اس کے لیے میں ذاتی طور پر ان کا مشکور ہوں' اس لیے کہ اس طرح میرے لیے معاملہ زیادہ صاف ہو گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس اجتماع سے قبل جماعت کو ایک خالص قومی و سیاسی جماعت کا رول ادا کرنے کے لیے ابھی بہت سی منزلیں طے کرنی تھیں جنہیں وہ بصورتِ دیگر آہستہ آہستہ کچھ شرماتی کچھ کتراتی طے کرتی لیکن اس اجتماع میں اس نے ایک ہی زقند میں ان سب کو عبور کر لیا ہے۔

اسے میری کور چشمی اور نافہمی پر مبنی قرار دیا جائے تو بھی مجھے اعتراض نہیں ہے لیکن واقعہ بہرحال یہی ہے کہ مجھے مولانا مودودی کی طویل تقریروں میں کوئی ایسی وزنی دلیل نہ ملی جس کی بنا پر میں اپنے موقف کو تبدیل کر سکتا۔ یہاں مجھے یہ کہنے میں بھی باک نہیں ہے کہ اس کے برعکس میں نے یہ محسوس کیا کہ خود مولانا موصوف بھی اپنے موقف پر پورے طور سے مطمئن نہیں ہیں بلکہ اس غلط احساس کی بنا پر کہ ''اب واپس لوٹ کر جانے کا امکان نہیں ہے لہٰذا آگے ہی بڑھنا چاہیے'' اپنے موقف کے لیے دلائل لا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اجتماع میں صاف صاف اعلان کیا کہ ''مولانا کی تقریر اور اس میں بیان شدہ دلائل سے میرا قطعاً اطمینان نہیں ہوا' البتہ میں جماعت کا رکن رہوں گا!''

جماعت کی رکنیت جاری رکھنے کا فیصلہ میں نے مندرجہ ذیل تین وجوہ سے کیا تھا:

ا۔ یہ کہ میں اس ''گرم گرم'' ماحول میں کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا جس میں' میں خاص طور پر ایک بہت سخت MENTAL TORTURE کی سی کیفیت میں گرفتار رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ایک مرتبہ پھر ٹھنڈے ماحول میں از سر نو اپنے موقف کا بھی جائزہ لوں اور مولانا مودودی کے دلائل کا بھی مطالعہ کروں، شاید مجھے کوئی روشنی مل

جائے!

۲۔ یہ کہ میں ذرا ''اپنے شیطان'' کا بھی جائزہ لے لینا چاہتا تھا جیسا کہ خود مولانا مودودی نے فرمایا تھا (اور صحیح فرمایا تھا) کہ ہر شخص کو اپنے شیطان سے باخبر رہنا چاہیے۔

۳۔ تیسرے یہ کہ ایک مجبوری بھی میرے سامنے تھی کہ جماعت کو چھوڑ کر کوئی اور ''جائے پناہ'' بھی اپنے دین اور ایمان کو بچانے کی نظر نہ آتی تھی اس وجہ سے میں چاہتا تھا کہ حتی الامکان اس جائے پناہ کو ہاتھ سے نہ کھوؤں!

اجتماع ماچھی گوٹھ کے بعد سے آج تک

میں مسلسل ان مسائل پر غور کرتا رہا ہوں۔ میں نے ہر معاملہ میں دونوں پہلوؤں کو نگاہ میں رکھنے کی کوشش کی ہے۔ خود اپنے آپ سے بے حد بدظن ہو کر بھی معاملات پر غور کیا ہے۔ کتنی ہی بار میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ مجھے جماعت سے مستعفی ہو جانا چاہیے لیکن میں پھر رُک جاتا رہا۔ بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ رمضان کے آخری عشرہ میں سے جتنے دن بھی مجھے مل سکے ان میں اعتکاف کروں گا اور یکسوئی کے ساتھ اور اللہ سے رہنمائی کی دعا کرتے ہوئے کوئی فیصلہ کروں گا۔

- جہاں تک میرے اصولی موقف کا تعلق ہے جتنا بھی میں نے سوچا اسی قدر اسے صحیح پایا اور جتنا غور کیا اسی قدر اس کی صحت پر میرا یقین بڑھتا چلا گیا۔ میں نے اجتماع سے قبل ''ترجمان'' کے ''اشارات'' اور ایک خاص مضمون ''دو خطوط اور ان کا جواب'' بھی دیکھے مولانا کی تقریروں کے NOTES بھی دوبارہ دیکھے۔ چودھری محمد اکبر صاحب نے جو دلائل میرے سامنے رکھے ان پر بھی غور کیا۔ مجھے ان میں کہیں روشنی نہ ملی اور جو رائے میں نے اپنے مفصل بیان میں تحریر کی ہے' میں اس میں کوئی تبدیلی نہ کر سکا۔

- جہاں تک ''اپنے شیطان'' کا تعلق ہے' واقعہ یہ ہے کہ مجھے پہلے بھی اس کا احساس تھا لیکن ماچھی گوٹھ میں مولانا مودودی کے اس طرف توجہ دلانے اور پھر ایک نجی ملاقات

میں جناب نعیم صدیقی صاحب کے بی اس طرف متوجہ کرنے پر میں نے اس معاملہ میں اپنی حد تک پوری باریکی سے جائزہ لیا اور خدا گواہ ہے کہ اپنے آپ سے بدظن ہو کر سوچ بچار کیا۔

۱۔ میں نے سوچا کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہ خیالات میرے دل میں کسی اور نے ڈال دیئے ہوں اور میں کسی اور کا آلہ کار بن گیا ہوں۔ تو مجھے اطمینان ہوا کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یہ سب کچھ میری ذاتی سوچ بچار کا نتیجہ تھا۔ اپنے بیان کے تحریر کرنے تک اس معاملہ میں میری گفتگو نہ کبھی سعید ملک صاحب سے ہوئی اور نہ ہی کسی اور ایسے نمایاں شخص سے جو اختلافی ذہن رکھتا ہو۔ صرف لغاری(۱) صاحب سے گفتگو ہوئی، وہ بھی اس وقت جبکہ میں اپنی آراء بنا چکا تھا۔ ان سے مل کرے مجھے اپنی بات پر انشراح صدر تو ضرور ہوا لیکن کسی نئی بات کا اضافہ نہیں ہوا۔ رہا مقامی طور پر تو یہاں یہ تو ضرور ہوا ہوگا کہ میں نے دوسروں کو تھوڑا بہت متاثر کیا ہو لیکن کسی اور سے ایسا کوئی تاثر لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۲۔ پھر میں نے سوچا کہ میں کہیں کسی آزمائش سے جی چرا کر تو نہیں بھاگ رہا ہوں، تو اس سلسلے میں بھی مجھے اطمینان ہی ہوا کہ اول تو اس وقت جبکہ میں استعفاء دے رہا ہوں ایسی کوئی بڑی آزمائش درپیش ہی نہیں ہے۔ پھر جو چھوٹے موٹے امتحانات اس راہ میں پیش آئے ہیں ان کے مواقع پر اللہ کا فضل ہی شامل حال رہا ہے اور کبھی بددلی نزدیک نہیں آسکی ہے۔ زمانہ طالب علمی کا اختتام اور عملی زندگی کی ابتداء ایک نوجوان شخص کے لیے کئی ایک چھوٹی بڑی آزمائشیں لے کر آتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس موقع پر میں نے اپنے قدموں میں کوئی کمزوری محسوس نہ کی اور پورے ثبات کے ساتھ جمعیت کی رکنیت سے جماعت کی رکنیت کی طرف منتقل ہوگیا۔ اجتماع ماچھی گوٹھ کا MENTAL TORTUER بھی میرے لیے ایک امتحان تھا لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس موقع پر بھی محض جذبات میں، میں نے کوئی اقدام نہیں کیا اور اس کے بعد بھی سوا دو ماہ تک مسلسل سوچ بچار کرتا رہا ہوں۔

---

(۱) سردار محمد اجمل خان لغاری مرحوم، رحیم آباد، ضلع رحیم یار خان۔

۳۔ پھر میں نے اس اعتبار سے اپنا جائزہ لیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ (مولانا مودودی کے الفاظ میں) پہلے ضعف ارادہ پیدا ہوا ہو اور پھر اُس نے یہ مرکب شکل اختیار کر لی ہو تو مجھے اطمینان ہوا کہ کم از کم میرے معاملہ میں تو یہ صورتِ حال بھی ہرگز موجود نہیں ہے۔ میں اپنے بیان کی تحریر کے وقت تک جماعت کا تمام کام پوری تندہی اور سرگرمی سے کرتا رہا ہوں اور یہ صورت ہرگز نہیں ہوئی کہ پہلے اعضا اور جوڑ بند ڈھیلے پڑے ہوں اور بعد میں، میں نے اپنے تعطل کی وجہ جواز کے طور پر یہ سارا فلسفہ گھڑا ہو' بلکہ مجھے کم از کم اپنے آس پاس کی حد تک تو معاملہ اس کے بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ جو لوگ سست پڑ گئے ہیں اور جن میں مقصد اور تحریک کے ساتھ عملی دلچسپی کم ہوگئی ہے وہ تو ایک نفسیاتی سے سہارے کے طور پر جماعت کی رکنیت کو چمٹا چمٹا کر سینے سے لگاتے ہیں اور اپنا حال دیکھ کر پھر کسی عام رکن پر بھی تنقید کی جرأت نہیں کرتے' کجا کہ پوری جماعت اور اس کی قیادت پر!

۴۔ ایک یہ خدشہ بھی میرے سامنے پیش کیا گیا کہ شاید جماعت کی صفوں میں ''ترقی درجات'' نہ ملنے کے باعث تیرے نفس نے ایک چوٹ کھائی ہوئی خودی کی مانند یہ سارا زہر اُگلا ہے!!----- میں نے اس پر بھی غور کیا تو مجھے اپنے بارے میں اس کا بھی کوئی امکان نظر نہ آیا۔ اس لیے کہ جماعت صفوں میں جلد ترقی کرنی ہوتی تو مجھے اس کا موقع ملا تھا جبکہ اُس وقت کے امیر جماعت (مولانا امین احسن اصلاحی) نے مجھے اپنی تعلیم سے فراغت کے بعد یہ مشورہ دیا تھا کہ میں لاہور ہی میں رہوں اور ''اپنی ساری امنگیں سیاست کے میدان میں پوری کروں''۔ لیکن میں نے اس مشورہ کو ردّ کر کے منٹگمری میں سکونت اختیار کی! پھر سیدھی بات یہ بھی ہے کہ جماعت میں ''ترقی درجات'' ہاں میں ہاں ملانے اور مکھی پر مکھی مارنے سے ملتی ہے' نہ کہ اُلٹی تنقیدیں کرنے سے!!

شیطان کے ان تمام ممکنہ واروں کا میں نے جائزہ لیا تو مجھے معلوم ہوا کہ ان میں سے کوئی مجھ پر کارگر نہیں ہوا۔ میں نے اپنے ذہن کے ایک ایک کونے کو ٹٹولا ہے لیکن شیطان کی کوئی کمین گاہ تلاش نہ کر سکا۔ اب ایک آخری امکان ہے اور وہ یہ ہے کہ شیطان میرے

ذہن کے ریشے ریشے میں اور میرے خون کے ایک ایک خلیے میں اس طرح سرایت کر چکا ہو کہ اس نے مجھے اس قابل ہی نہ چھوڑا ہو کہ میں اپنے دل و دماغ میں اس کا سراغ لگا سکوں۔ تو اگر ایسی کیفیت ہے تو بھی جماعت کی رکنیت کے جاری رکھنے کا تو بہر حال کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہی ہو چکا ہے تو ظاہر ہے کہ مجھ سے کوئی خیر تو بن ہی نہیں آ سکتا اگر جماعت میں رہوں گا تو فتنہ انگیزی کروں گا اور فساد پھیلاؤں گا۔

❁ اجتماع کے بعد ان کے سوا دو ماہ میں، میں نے یہ محسوس کیا کہ نہ میں جماعت کے کسی کام کا رہ گیا ہوں اور نہ جماعت سے مجھے اب کوئی دینی فائدہ پہنچ سکتا ہے، بلکہ اب میرا جماعت کے اندر رہنا خود میرے لیے بھی نقصان دہ ہے اور جماعت کے لیے بھی۔ جماعت کے اجتماعی ذہن کے خلاف ایک ذہن لے کر جماعت کے اندر رہنا اپنی حیثیت کے مطابق چھوٹے یا بڑے پیمانے پر جماعت میں کش مکش کو باقی رکھنا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ جماعت کے لیے کسی طرح مفید نہیں ہے۔ کوئی سیاسی جماعت جبکہ ابھی وہ خارجی کش مکش کے دَور میں ہو اگر اندرونی طور پر بھی کش مکش میں مبتلا ہو جائے تو یہ اس کے حق میں بُرا ہی ہے، اچھا کسی طرح نہیں ہے۔ لہٰذا میرا وجود جماعت کے لیے کسی حیثیت سے مفید نہیں ہے بلکہ مضر ہے۔ دوسری طرف اب جماعت کی رکنیت سے میرے اندر ''نفاق'' کی سی کیفیت پیدا ہو رہی ہے! ایک چیز کو غلط اور ناحق سمجھتے ہوئے بھی میں مجبور ہوں کہ پبلک میں جماعت کے رکن کی حیثیت سے اس کی حمایت کروں اور یہ چیز اب میرے لیے ناممکن بنتی چلی جا رہی ہے!!

مندرجہ بالا امور پر غور و فکر کے بعد میں اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جماعت سے مستعفی ہو جاؤں، لہٰذا میرا استعفاء حاضر ہے!!

جماعت کے ساتھ میرا جذباتی اور غیر شعوری تعلق ۴۷ء سے، شعوری ہمدردی کا تعلق ۵۱ء سے) جبکہ میں نے جمعیت کی رکنیت اختیار کی) اور باقاعدہ رکنیت کا تعلق گزشتہ سوا دو سال سے ہے۔ اس دس سال کے عرصہ میں میری پوری دنیا جماعت ہی کے چھوٹے سے

حلقہ میں محدود رہی ہے۔ تعلقات اور دوستیاں، محبتیں اور الفتیں حتیٰ کہ رشتے داریاں تک اسی حلقہ میں محدود رہیں۔ بیٹھنا اُٹھنا بھی اسی میں رہا اور ہنسنا بولنا بھی اسی میں رہا۔ اب دفعتاً اس حلقہ سے نکلتے ہوئے دل ودماغ سخت صدمہ محسوس کر رہے ہیں۔ کتنے ہی بزرگوں سے مجھے والہانہ عقیدت ہے اور کتنے ہی ساتھیوں سے بے پناہ محبت ہے۔ جب میں سوچتا ہوں کہ آج کے بعد شاید میرے بزرگ میری عقیدت کی قدر نہ کریں اور میرے دوست میری محبت پر اعتماد نہ کریں تو دل اندر سے پکڑا سا جاتا ہے۔ پھر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جماعت کے بہت سے بزرگ مجھ سے بزرگانہ شفقت کا اور کتنے ہی ارکان و متفق مجھ سے حقیقی محبت کا تعلق رکھتے ہیں۔ جب سوچتا ہوں کہ آج اپنے اس اقدام سے میں نہ معلوم کتنوں کے جذبات کو مجروح کروں گا تو اپنے ہی آپ میں ایک ندامت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود اس اقدام پر مجبوراً اس لیے آمادہ ہو گیا ہوں کہ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا!

میں نے جب جماعت کی رکنیت اختیار کی تھی تو اس وقت بھی اسے کوئی بچوں کا کھیل نہ سمجھا تھا اور آج جبکہ اسے ترک کر رہا ہوں تو یہ اقدام بھی بغیر سوچ بچار کے کسی جذباتی کیفیت میں نہیں کر رہا۔ میں جائزہ کمیٹی سے ملاقات اور اس کے لیے اپنے مفصل بیان کی تحریر سے بھی ایک سال قبل سے شدید ذہنی کش مکش میں مبتلا ہوں، اور اس واقعہ کو بھی آج چھ ماہ سے اوپر کا عرصہ ہو چکا ہے جس میں، میں نے جذبات سے خالی ذہن کے ساتھ، اور جذبات کی رفاقت کے ساتھ، دونوں ہی طرح مسلسل غور وفکر کیا ہے اور آخر میں اللہ تعالیٰ سے رہنمائی کی دعا کرتے ہوئے ایک فیصلہ کیا ہے۔ جب اندر آیا تھا تو ''رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا'' کے ساتھ ''رَبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ'' کی دعا کرتا ہوا آیا تھا اور آج جب باہر جا رہا ہوں تو اپنے اللہ سے ''اَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ'' کی دعا کرتا ہوا جا رہا ہوں۔

جن حالات اور کیفیات سے گزر کر میں نے جماعت کی رکنیت سے تعلق منقطع کیا ہے

وہ میں نے اپنی حد تک صحیح صحیح اور صاف صاف بیان کر دیئے ہیں۔ اس کے بعد بھی کسی ”نفسیاتی تجزیے“ کی ضرورت ہو تو جماعت کے کئی اہل قلم کو ماشاء اللہ اس میں مہارت تامہ حاصل ہی ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گا کہ ایسے کسی تجزیے سے کوئی فائدہ ہی اُٹھا سکوں۔

آخر میں دست بدعا ہوں: **اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِحَیِّنَا وَ مَیِّتِنَا وَ شَاھِدِنَا وَ غَائِبِنَا وَ صَغِیْرِنَا وَ کَبِیْرِنَا وَ ذَکَرِنَا وَ اُنْثٰنَا. اَللّٰھُمَّ مَنْ اَحْیَیْتَہٗ مِنَّا فَاَحْیِہٖ عَلَی الْاِ سْلَامِ وَ مَنْ تَوَفَّیْتَہٗ مِنَّا فَتَوَفَّہٗ عَلَی الْاِ یْمَانِ۔ اٰمین!**

خاکسار: **اسرار احمد**

تحریر ۲۹/ رمضان المبارک ۱۳۷۶ھ مطابق اپریل ۱۹۵۷ء بحال اعتکاف بعد عصر

درخواست رکنیت

تحریر ۱۵؍نومبر ۱۹۵۴ء

یہ درخواست، جیسا کہ ظاہر ہے، کسی سوالنامے کے جوابات پر مشتمل ہے، میرے پاس اس کی جو نقل محفوظ ہے اس میں سوالات موجود نہیں ہیں لہٰذا اب قارئین کو بھی جوابات ہی کے مطالعے سے سوالات کا تعین کرنا ہوگا

(اسرار احمد)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بخدمت امیر جماعت اسلامی پاکستان

بتوسط امیر جماعت اسلامی منٹگمری

اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

میں کافی غور وفکر اور سوچنے سمجھنے کے بعد اپنے آپ کو جماعت اسلامی کی رکنیت کے لیے پیش کرتا ہوں۔ گوشوارہ کے سوالات کے جوابات نمبر وار ذیل میں درج کر رہا ہوں:

۱۔ اسرار احمد ولد شیخ مختار احمد صاحب مکان نمبر ۴۷/۷، گرجا گلی، بلاٹ گنج منٹگمری۔

۲۔ اس وقت تقریباً ساڑھے بائیس سال (تاریخ پیدائش ۲۶؍اپریل ۱۹۳۲ء)

۳۔ ا: فنی تعلیم کے سلسلے میں، میں نے اسی سال پنجاب یونیورسٹی سے ایم بی بی ایس کیا ہے۔

ب: علوم عمرانی کا باقاعدہ کسی تعلیمی ادارے میں تو میں نے مطالعہ نہیں کیا ہے تاہم چونکہ مجھے ان کے مطالعہ کا شوق رہا ہے لہٰذا ان کے سلسلے میں، میں نے اپنے طور پر کچھ پڑھا ہے جو اگرچہ مجموعی طور پر تو کافی ہے تاہم علیحدہ علیحدہ ہر مضمون میں ہنوز ابتدا ہی کا معاملہ ہے!

ج: علم دین بھی اگرچہ باقاعدہ کسی دینی درس گاہ میں حاصل نہیں کیا ہے تاہم اس میں بھی میں نے اپنے ذاتی مطالعہ سے خاصی استعداد بہم پہنچائی ہے۔ تھوڑی سی عربی بھی جانتا ہوں۔ چنانچہ قرآن وحدیث کا براہِ راست مطالعہ بھی میں نے کیا ہے اس کے علاوہ جماعت اسلامی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ندوۃ المصنفین دہلی اور تھانہ بھون کی مطبوعات کا کافی مطالعہ کیا ہے اور اس طرح دینی علوم میں بھی ابتدائی معلومات کا ایک اچھا ذخیرہ میں نے فراہم کرلیا ہے۔

اگرچہ یہ چیز سوال نمبر ۳ کے براہِ راست احاطہ میں تو نہیں آتی تاہم میں اس کا ذکر مناسب سمجھتا ہوں، اور وہ حصول علم کے سلسلے میں میرے آئندہ ارادوں کا معاملہ ہے۔ فنی تعلیم کو تو میں اپنے طور پر ختم کر چکا ہوں اور مزید اس سلسلے میں باقاعدہ مطالعے کا میرا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ باقی 'ب' اور 'ج' میں سے بھی علومِ عمرانی کو ثانوی درجے پر رکھتے ہوئے میں اپنی اصل توجہ علم دین کے حصول پر مرکوز کرنا چاہتا ہوں۔ میرا ارادہ ہے کہ پہلے عربی کا باقاعدہ مطالعہ کروں اور پھر قرآن اور حدیث اور دوسرے علوم کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دوں۔ وَ اللّٰہ المُسْتَعَان!

۴۔ ذریعۂ معاش کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اب میرے ہاتھ میں ایسا ہنر آ گیا ہے جس کے ذریعے میں اپنی معاشی ضرورت کو آزادانہ پورا کرنے کے ساتھ تحریک کے کام اور حصول علم کے لیے بھی خاصا وقت نکال سکوں۔ فی الحال میں جماعت اسلامی منٹگمری کے شفاخانے میں کام کر رہا ہوں۔

۵۔ یہ ایک لمبی داستان ہے، میں میٹرک کے زمانے ہی میں (۴۷ء) مطالعے کے شوق کی وجہ سے جماعت کے لٹریچر سے آشنا ہو چکا تھا، اس زمانے میں، میں ضلع حصار میں تھا۔ وہاں مرزا مسرت بیگ صاحب اور چوہدری نذیر احمد صاحب ایم اے سے میرا تعارف تھا اور یہ حضرات مجھے مطالعہ کے لیے کتابیں دیتے تھے جنہیں میں پڑھا کرتا تھا۔ اس زمانے میں، میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا ورکر تھا لہٰذا میں نے اس طرف زیادہ توجہ نہ دی۔ انقلاب ۴۷ء کے دوران ہم لوگ حصار میں محصور ہو گئے تھے اور اس طرح تقریباً ایک ماہ بہت فرصت کا

مل گیا۔اس زمانے میں، میں تفہیم القرآن سے روشناس ہوا اور یہ مجھے بہت دلچسپ معلوم ہوئی۔بس اس کے بعد میں نے جماعت کی مطبوعات کو ایک کے بعد دوسری کے حساب سے پڑھنا شروع کر دیا اور پاکستان آنے کے بعد جلد ہی میں نے جماعت کے لٹریچر میں سے مولانا مودودی صاحب کی تمام کتابیں پڑھ ڈالیں۔مولانا امین احسن صاحب کی کتابیں اس زمانے میں خشک معلوم ہوتی تھیں۔اس کے بعد میں نے جماعت اسلامی حلقہ کرشن نگر کے ساتھ عملاً کام شروع کر دیا۔کچھ دنوں بعد جب میں جمعیت طلبہ میں داخل ہو گیا تو اگرچہ جماعت اسلامی سے تنظیمی اعتبار سے تو کٹ گیا لیکن فکری طور پر وہ تمام غذا جو اس وقت تک جماعت اسلامی نے فراہم کی ہے میں برابر ہضم کرتا رہا ہوں۔ترجمان کے برانے فائلوں میں سے بہت سے میں نے حاصل کیے اور پڑھ ڈالے۔مختصراً اب یہ حال ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اور مولانا صدر الدین اصلاحی صاحب کی تصانیف میں نے تقریباً تمام پڑھ ڈالی ہیں۔یہ تقریباً کا لفظ اس وجہ سے لکھ رہا ہوں کہ ممکن ہے کہ جماعت اسلامی میں آنے سے قبل ان حضرات نے کچھ لکھا ہو جس کا تعلق اس تحریک سے نہ ہو اور وہ تحریر میں نے نہ پڑھی ہو ورنہ بقیہ وہ تمام کتابیں جو جماعت اس کی دعوت اور اس کے کام سے متعلق ہیں میں نے پڑھ ہی نہیں ڈالی میں بار بار پڑھی ہیں، ان میں سے بعض کو سبقاً سبقاً لوگوں کو پڑھایا بھی ہے۔

ان حضرات کے علاوہ نعیم صاحب کی چند کتب بھی میں نے پڑھی ہیں، اور ترجمان چراغ راہ، زندگی اور دوسرے اہم رسائل کے کم از کم پچھلے سات سال کے تو تمام پرچے پڑھے ہیں۔

سوال میں کتابوں کے نام طلب کیے گئے ہیں، ان کو نقل کرنا بیکار ہے۔جماعت اسلامی کا مرکزی مکتبہ وقتاً فوقتاً جو فہرست مطبوعات شائع کرتا ہے ان میں سے تازہ ترین فہرست کو میری پڑھی ہوئی کتابوں کی فہرست کی حیثیت سے شمار کر لیا جائے۔

٦۔ اس سوال کا جواب واقعتاً بہت مشکل ہے۔

❁ ’’کیا اثر پڑنا چاہیے‘‘ پر میں ایک طویل تقریر بھی کر سکتا ہوں اور تحریر بھی لکھ سکتا ہوں۔

❁ لیکن ''''کیا اثر ہوا ہے'' پر میں خود کچھ نہیں کہہ سکتا! اس معاملے میں آپ کو اُن حضرات کی آراء پر انحصار کرنا ہوگا جن سے اس سات سالہ دَور میں جو میں نے تحریک اسلامی سے متعارف ہونے کے بعد بسر کیے ہیں میرا سابقہ رہا ہے۔ مثلاً ۴۷ء اور ۴۸ء کے دوران ماسٹر شہادالدین صاحب، ناظم جماعت اسلامی حلقہ کرشن نگر لاہور سے۔

۴۹ء سے اب تک------(i) لاہور میں میرا تعلق یا تو جماعت کے مرکز سے رہا، اس میں مرکزی رفقاء مجھے جانتے ہیں یا پھر جمعیت طلباء سے رہا اور اس حیثیت سے جمعیت کے ذمہ دار حضرات کوئی رائے دے سکیں گے۔

(ii) منٹگمری میں، میں تعطیلات کے زمانے میں آتا رہا اور اس حیثیت سے میرے بارے میں رائے یا تو شیخ عبدالحمید صاحب (حال ملتان) دے سکیں گے جو اس سے قبل جماعت اسلامی منٹگمری کے امیر تھے یا پھر موجودہ ارکانِ جماعت منٹگمری میرے بارے میں کچھ بتا سکیں گے۔

❁ البتہ ایک بات ہے اور وہ یہ کہ میں جو آج یہ درخواست رکنیت تحریر کر رہا ہوں تو اس کا صاف مطلب ہے کہ میں یہ رائے تو رکھتا ہوں کہ جماعت کے انقلابی لٹریچر نے میرے ''خیالات، عملی زندگی اور اخلاق' پر کم از کم اتنا انقلابی اثر تو ڈالا ہے کہ میں جماعت کی رکنیت کے لیے اپنے آپ کو پیش کر سکوں''۔

۷۔ جی ہاں بہت اچھی طرح!

۸۔ اس سوال کا جواب کسی قدر سوال نمبر ۵ میں آ چکا ہے۔

مختصراً یہ کہ میں اُس دَور میں پیدا ہوا ہوں جبکہ احرار اور خاکسار تقریباً ختم ہو چکے تھے ملک میں دو ہی طاقتیں تھیں مسلم لیگ اور کانگرس' یا پھر جماعت اسلامی جو ایک فکری جنگ لڑ رہی تی۔ فطری طور پر میں اس وقت مسلم لیگ کے ساتھ تھا اور مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن میں' میں نے کام بھی کافی کیا۔ اس کے بعد میں جماعت اسلامی کے لٹریچر سے متعارف ہوا اور اس کے ساتھ پوری طرح متفق ہو گیا۔ وہ دن اور آج کا دن میں اسی کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔ اسلامی جمعیت طلبہ میں ایک رکن کی حیثیت سے اور ایک سرگرم کارکن کی طرح میں

نے چار سال کام کیا ہے اور دوران ایک لمحہ بھی مجھ پر ایسا نہیں گزرا کہ میں نے اصولاً اور فکراً جمعیت طلباء کو جماعت اسلامی سے علیحدہ متصور کیا ہو۔ اب میں یہ سمجھتا ہوں کہ پوری دنیا میں خالص تحریک اسلامی تو محض جماعت اسلامی ہے (پاکستان کی بھی اور ہندوستان کی بھی) البتہ دینی ہی مقاصد کے لیے اور اچھے کام کرنے والے اور ادارے بھی ہیں اور جماعتیں بھی ہیں، پاکستان میں بھی اور باقی دنیا میں بھی۔ ان اداروں نے یا جماعتوں نے مجھے بس اس حد تک تو متأثر کیا ہے لیکن جماعت اسلامی کے سوا کسی اور ادارے یا جماعت کے مقصد اور طریق کار کو میں خالصتاً اسلامی اور ٹھیٹھ دینی نہیں سمجھتا!

۹۔ جماعت اسلامی کی رکنیت پر مجھے ''احساسِ فرض'' نے آمادہ کیا ہے اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ راہ خاردار ہے اور مصائب و مشکلات سے بھرپور ہے میں اس کی رکنیت کے لیے اپنے آپ کو پیش کر رہا ہوں کہ:

میری رائے میں اللہ تعالیٰ کا مطالبہ ہر ذی شعور انسان سے بالعموم اور ہر مدعی ایمان و اسلام سے بالخصوص یہ ہے کہ (۱) اولاً خود اپنی زندگی کو اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کے رسولؐ کی ہدایت کے تحت دے دے، فرائض سے عہدہ برآ ہو، عبادات بجالائے اور حقوقِ نفس اور حقوق العباد کی ادائیگی میں وہ طریقہ اختیار کرے کہ جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ نے بتایا ہے۔ (۲) ثانیاً وہ اللہ کے دین کو دنیا میں عملاً قائم کرنے کے لیے مال اور جان صرف کرے اور اپنی قوتوں، قابلیتوں اور صلاحیتوں کو لگائے (اسی کا نام اقامت دین یا شہادتِ حق ہے!)۔ (۳) ثالثاً وہ اس کام کے لیے یا تو کسی ایسی جماعت میں شریک ہو جس کے بارے میں وہ پورے طور پر مطمئن ہو جائے کہ وہ بالکل اور ٹھیک ٹھیک اسی مقصد کے لیے کام کر رہی ہے ورنہ پھر خود کھڑا ہو کر اور اس کام کے لیے لوگوں کو اپنے گرد جمع کر کے ایک جماعت بنائے جو اس کام کو اس طرح کرے!

میں یہ محسوس کرتا ہوں اور آج نہیں بلکہ آج سے چار سال قبل سے محسوس کر رہا ہوں کہ اقامت دین میرا فرض ہے اور خدا کا شکر ہے کہ میں اس دَور میں پیدا ہوا جبکہ خالص اقامت دین کے لیے کام کرنے کے لیے جماعت اسلامی قائم ہو چکی ہے اور میں آسانی

کے ساتھ اس میں شریک ہوکر اپنے فرض سے عہدہ برآ ہونے کے لیے سعی کر سکتا ہوں۔ اس لحاظ سے میں جماعت اسلامی کے وجود کو اپنے لیے ایک نعمت متصور کرتا ہوں' اس لیے کہ اگر یہ نہ ہوتی تو اپنے طور پر کام کرنا میرے بس میں نہ ہوتا اور اللہ تعالیٰ کے ہاں باز پُرس کڑی ہو جاتی۔ چار سال میں جمعیت طلبہ میں رہا ہوں تو اسی تصور کے تحت کہ یہاں کام کر کے دراصل میں جماعت اسلامی ہی کا کام کر رہا ہوں (اس سلسلے میں' میں نے واضح طور پر امیر جماعت سے استفسار کر کے ان کی رضا حاصل کر لی تھی) اور اب جبکہ دَورِ طالب علمی کے اختتام پر میں جمعیت طلبہ سے علیحدہ ہو چکا ہوں تو اپنی پہلی فرصت میں درخواست رقم کر رہا ہوں۔ چاہتا تو میں یہ تھا کہ جس روز جمعیت طلبہ سے علیحدہ ہوں اسی روز جماعت کی رکنیت کی درخواست دے دوں اور ایک دن بھی مجھ پر کسی جماعت کے بغیر نہ گزرے لیکن صرف اس وجہ سے کہ معلوم نہ تھا کہ کہاں SETTLE ہوں گا اور کہاں درخواست دینی چاہیے' تقریباً پندرہ دن کی دیر ہوگئی ہے----- بہرحال آج یہ درخواست دے دینے کے بعد مطمئن ہوں گا کہ میں نے اپنی طرف سے اپنے آپ کو جماعت کی رکنیت کے لیے پیش کر دیا ہے!! اور اس حیثیت سے جب تک میری رکنیت منظور ہو اُس وقت تک بھی اپنے طور پر میں جماعت کے بغیر زندگی بسر نہیں کر رہا ہوں گا۔

۱۰۔ میں نے جماعت کے دستور کا ایک مرتبہ پھر از سر نو باقاعدہ مطالعہ کر لیا ہے اور میں مطمئن ہوں کہ میری زندگی میں جماعت کے دستور کے خلاف کوئی کوئی چیز موجود نہیں ہے! سوال نامہ میں خصوصاً دفعہ ۴ کے بارے میں دریافت کیا گیا ہے اور میں نے نئے اور پرانے دونوں دستوروں کی دفعہ (۴) کو دیکھ لیا ہے اور مطمین ہوں کہ میں اپنی زندگی میں ایسی کوئی چیز نہیں پاتا جو مجھے رکنیت جماعت کے ناقابل بنا دیتی ہو۔

۱۱۔ آخری سوال کے جواب میں' میں محض ''جی ہاں'' پر اکتفا کرتا ہوں۔ اس سلسلے میں بلند و بالا عزائم اور صبر و استقامت کے ارادے کا اظہار نہ ممکن ہے نہ مناسب! اس راہ کے تقاضوں کو میں نے سمجھ تو خوب لیا ہے لیکن ان کی بالفعل ادائیگی اور کماحقہٗ تکمیل محض اللہ کی توفیق اور اس کی مدد پر منحصر ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدَانَا لِھٰذَا وَ مَا کُنَّا لِنَھْتَدِیْ لَوْ لَا اَنْ ھَدَانَا اللّٰہُ کے بعد اب میں رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا وَ ھَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً اِنَّکَ اَنْتَ الْوَھَّابُ کے سہارے آج اتنا کچھ عرض کر دینے کے بعد اپنے دستخط ثبت کر دیئے کی جرأت کر رہا ہوں۔ فقط

خاکسار

اسرار احمد عفی عنہ

منٹگمری ۱۵؍نومبر ۱۹۵۴ء

نوٹ: اس درخواست کی تحریر کے ٹھیک تین ماہ بعد یعنی ۱۵؍فروری ۱۹۵۵ء کو راقم الحروف کو اس کی منظوری کی اطلاع دی گئی' چنانچہ اگلے ہی روز یعنی ۱۶؍فروری ۱۹۵۵ء کو راقم نے جماعت اسلامی منٹگمری شہر کے اجتماع میں رکنیت جماعت کا حلف اٹھالیا۔

مولانا اصلاحی کا استعفاء

اور مولانا مودودی سے تیز و تند خطوط کا تبادلہ

☆

مولانا اصلاحی اور مولانا مودودی مرحوم

کی سترہ سالہ رفاقت کا

افسوسناک اختتام

اور

ایک خالص دینی و انقلابی تحریک

کے ساتھ

جدید جمہوری فلسفہ تنظیم

کی پیوندکاری کا

عبرتناک انجام

استعفاء

محترم امیر جماعت اسلام علیکم ورحمۃ اللہ

مجھے جماعت کی موجودہ پالیسی، اس کے موجودہ نظام اور اس کے موجودہ دستور سے اتفاق نہیں ہے اور بدقسمتی سے آپ پر بھی آپ کے بعض اقدامات کے سبب سے مجھے اعتماد باقی نہیں رہا ہے، جماعت کے کچھ مخلصین جو اصلاح احوال کی کوشش کر رہے تھے اب وہ بھی اپنی کوششوں میں ناکام ہو کر مجھے اپنی مایوسی کی اطلاع دے چکے ہیں۔ اس وجہ سے نہایت افسوس کے ساتھ اب میں جماعت کی رکنیت سے استعفاء دیتا ہوں۔

اس موقع پر میں یہ ظاہر کرنے میں اطمینان اور خوشی محسوس کرتا ہوں کہ مجھے اس جماعت سے جو محبت رہی ہے انشاء اللہ بحیثیت مجموعی وہ اب بھی قائم رہے گی۔ اس جماعت کے اندر میرے بہترین احباب ہیں جن کے دینی جذبات و احساسات کی میرے دل میں بڑی قدر و عزت ہے۔

آپ سے مجھے کوئی ذاتی رنجش یا شکایت نہیں ہے اور اگر ہے تو یں اس کو صدق دل سے معاف کرتا ہوں۔ چودہ پندرہ سال کے تعلق کے دوران میں آپ کو مجھ سے بہت سی تکلیفیں پہنچی ہوں گی۔ میں ان سب کے لیے نہایت ادب سے معافی مانگتا ہوں اور اپنے لیے دعا کی درخواست کرتا ہوں۔ مرکز یا جماعت کے کسی اور رفیق کے لیے میری کوئی بات وجہ شکایت بنی ہو تو میں آپ کے واسطہ سے ان سے بھی معافی کی درخواست کرتا ہوں۔

والسلام

(دستخط) امین احسن اصلاحی ۱۳/جنوری ۵۸ء

مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کی باہمی خط وکتابت

مولانا امین اصلاحی کے استعفاء کے بعد مولانا مودودی صاحب نے اُن کو گفتگو کے لیے بلایا تھا اس گفتگو کے بعد حسب ذیل خط امیر جماعت کی طرف سے مولانا اصلاحی صاحب کے نام آیا۔

۱۵ر جنوری ۵۸ء

محترمی ومکرمی، اسلام علیکم ورحمۃ اللہ

رات میں نے اپنی گفتگو میں آپ سے ذکر کیا تھا کہ میں نے غلام محمد صاحب کو ایک خط میں اپنے حقیقی احساسات واضح طور پر لکھ کر بھیج دیئے تھے اور میرا منشا یہ تھا کہ آپ کو یا تو وہ خط دکھا دیا جائے یا کم ازکم اس کے مضمون سے پوری طرح آگاہ کر دیا جائے تا کہ آپ میرے احساسات سے بے خبر نہ رہیں۔ لیکن آپ کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ آپ کو اس کی ہوا بھی لگنے نہیں دی گئی۔ ہمارے یہ دوست اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ یہ غلطی کرتے رہے ہیں کہ ایک کو دوسرے کے احساسات سے پوری طرح باخبر نہیں کیا۔ ان کی یہ وضع احتیاط کچھ ایسی رہی ہے گویا وہ پرندے پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے اور ڈرتے تھے کہ کسی حرکت سے پرندہ بھڑک کر اُڑ نہ جائے۔ حالانکہ معاملات کی صفائی کے لیے یہ ضروری تھا کہ ہر ایک کے سامنے دوسرے کی حقیقی پوزیشن پوری طرح آجائے اور پھر ہم ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ آیا ہم ایک دوسرے کی تسکین خاطر کر کے باطمینان ایک ساتھ چل سکتے ہیں۔

میں اگرچہ وہ بیشتر باتیں آپ سے زبانی کہہ چکا ہوں جو میں نے غلام محمد صاحب کے خط میں لکھی تھیں، پھر بھی میں محسوس کرتا ہوں کہ اگر اس خط کو میں آپ سے پوشیدہ رکھوں تو آپ کے ساتھ خیانت کروں گا۔ اس لیے اس کی نقل آپ کو ارسال کر رہا ہوں۔ البتہ اس میں ایک دو باتیں میں نے اب بڑھا دی ہیں جو اصل خط میں نہ تھیں اور اس سے میرا مقصد بعض امور کی مزید توضیح ہے۔ میرا مقصد اس نقل کو بھیجنے سے یہ ہے کہ آپ کے سامنے میری

پوزیشن پوری طرح واضح ہو جائے اور اس کو سامنے رکھ کر آپ پورے معاملہ پر غور کریں' خدا نخواستہ آپ کو کوئی اذیت دینا میرے پیش نظر نہیں ہے۔

آپ نے جائزہ کمیٹی کے سلسلے میں جو خط مجھے لکھا تھا' اگر آپ ضرورت سمجھتے ہوں تو اس کے ایک ایک نکتہ کا جواب میں آپ کو لکھ کر بھیج سکتا ہوں۔ میں نے اس کا جواب لکھنے سے اس لیے احتراز نہیں کیا تھا کہ اس میں آپ نے جو اعتراض مجھ پر کیے تھے ان کا کوئی جواب میرے پاس نہ تھا' بلکہ اس کے وجوہ دوسرے تھے جن کی طرف میں زبانی گفتگو میں اشارہ کر چکا ہوں۔

یہ خط میں اس غرض کے لیے آپ کو نہیں لکھ رہا ہوں کہ آپ اسے رات کی گفتگو کے آخری نتیجہ کی حیثیت سے لیں۔ بلکہ دراصل یہ رات کی گفتگو کے سلسلہ ہی میں ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ آخری نتیجہ پر پہنچنے سے پہلے مزید غور کے لیے جس مواد کی ضرورت میں محسوس کرتا ہوں وہ آپ کے سامنے آجائے۔ آپ بھی اگر کسی مزید بات کی ضرورت محسوس کریں تو مجھے لکھ سکتے ہیں یا مجھ سے زبانی فرما سکتے ہیں۔ اُلجھے ہوئے معاملات کو صاف کرنا اگر پیش نظر ہو تو صبر کے ساتھ تمام حقائق کا سامنا کرنا ناگزیر ہے۔

خاکسار

(دستخط) ابوالاعلیٰ

مولانا مودودی صاحب کا خط بنام جناب چوہدری غلام محمد

مکرمی و محترمی' السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا خط انشاءاللہ خاں صاحب کے ذریعہ سے ملا۔ آپ نے ایک ایسا معاملہ چھیڑ دیا ہے جس کے متعلق میں کچھ کہنا یا لکھنا پسند نہ کرتا تھا۔ لیکن اب جبکہ آپ نے اسے چھیڑ دیا ہے تو میں چاہتا ہوں کہ اپنے خیالات صاف صاف آپ کو بتا دوں تا کہ آپ اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ میں کسی کبر یا ضد کی بنا پر اصلاحِ حال کی کوشش سے پرہیز کر رہا ہوں۔ اس کے ساتھ یہ مصلحت بھی میرے پیش نظر ہے کہ اگر آپ کو میرے احساسات کا علم ہو جائے تو

شاید آپ حقیقی صورتِ حال کو سمجھ کر اصلاح کی کوئی راہ نکال سکیں۔

آپ لوگ جانتے ہیں کہ پچھلے پندرہ سولہ برس کے دوران میں میرا طرزِ عمل مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے ساتھ کیا رہا ہے۔ جماعت میں مجھے سب سے بڑھ کر انہیں پر اعتماد تھا۔ ہر معاملہ میں ان کی رائے کو میں سب سے زیادہ وزن دیتا تھا۔ ہر معاملہ میں ان کے مشورے' ان کی شرکت اور معاونت کو ضروری سمجھتا تھا۔ ان کو بجا طور پر جماعت میں جو اہمیت حاصل ہے وہ میرے علی الرغم حاصل نہیں ہوئی ہے بلکہ ان کی قابلیت اور جماعت کی قدر شناسی کے ساتھ میری دلی خواہش اور کوشش کا بھی اس میں دخل ہے۔ میں نے ہمیشہ جماعت کے اندر بھی اور باہر بھی اُن کو آگے رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور قولاً و عملاً اپنے بدل کی حیثیت سے پیش کیا ہے تاکہ جماعت میں کم از کم ایک آدمی تو ایسا رہے جس پر میرے بعد جماعت پورے اعتماد کے ساتھ جمع ہو سکے۔ یہ بات بھی وہ سب لوگ جو مجلس شوریٰ کے رکن رہے ہیں اپنے تجربات و مشاہدات کی بناء پر جانتے ہوں گے کہ میں نے بارہا ان کی ناگوار باتیں ٹھنڈے دل سے برداشت کی ہیں۔ ان کی ناز برداری خود ہی نہیں کی ہے' دوسروں سے بھی کروائی ہے۔ پھر یہ بات آپ خود مولانا ہی سے پوچھ لیجئے کہ اس سالہا سال کی رفاقت کے دوران میں کیا کبھی میں نے ان کو کوئی سخت بات کہی یا لکھی ہے' یا ان کے متعلق کوئی ایسا اظہار خیال کیا ہے جو اُن کے لیے موجب شکایت ہو؟

لیکن اب یہ میرا نہیں' ان کا رویہ ہے جس کی بدولت میرے اور ان کے درمیان تعاون مشکل ہو گیا ہے (۱)۔ بے اعتمادی کا اظہار میری طرف سے نہیں' ان کی طرف سے ہوا ہے، اور ایسی سخت بے اعتمادی کا اظہار ہوا ہے' ایسی بدترین شکل میں ہوا ہے جس کے بعد اب کبھی میں اس اطمینان کے ساتھ ان سے بات نہیں کر سکتا کہ وہ مجھے نیک نیت اور ایماندار

حاشیہ (۱): اس سے مراد وہ خاص تعاون ہے جو اب تک میرے اور ان کے مابین رہا ہے' ورنہ دستورِ جماعت کے تقاضوں کے مطابق ایک رکن جماعت اور رکن مجلس شوریٰ کا امیر جماعت کے ساتھ جو تعلق ہونا چاہیے وہ بہر حال عملاً رہے گا۔ نیز یہ بھی واضح رہے کہ مولانا کے ساتھ جو طرزِ عمل اب میں نے اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ جماعت کا جو کام وہ خود بخوشی کرنا چاہیں وہی ان سے لیا جائے اور کسی ایسے کام کے لیے سرے سے ان کو کہا ہی نہ جائے جسے کرنے کے لیے وہ راضی نہ ہوں۔

آدمی سمجھتے ہوئے گفتگو کر رہے ہیں[1]۔

مایوسی اگر ان کو مجھ سے ہوئی ہے تو یہ عجیب بات ہے۔ انہوں نے تو سارے اسباب وہ جمع کیے ہیں جو مجھے ان سے مایوس کر دینے کے لیے کافی ہیں۔ رنج اگر انہیں مجھ سے ہے تو یہ میرے لیے حیران کن بات ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے میرے تحمل کو اس آخری حد پر پہنچا دیا ہے جس کے بعد جائز اور بجا تحمل کی کوئی گنجائش باقی نہیں ہے، نہ اس کے آگے کوئی شخص مجھ سے تحمل کے مطالبہ کا حق رکھتا ہے۔ انہوں نے میرے متعلق جتنے بُرے خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے واقف ہونے کے بعد میں حیران ہوں کہ ان سے میرا تعاون آخر کیسے ہو سکتا ہے؟

مجھے اس کا پورا احساس ہے کہ اس تحریک کے لیے میرا اور ان کا تعاون نہایت ضروری ہے اور اس میں فرق واقع ہو جانا سخت نقصان دہ ہے۔ اس معاملہ میں آپ کو یا کسی کو بھی مجھ سے کچھ کہنے کی حاجت نہیں۔ مگر آپ مجھے بتائیے کہ اس میں جو حقیقی موانع ہیں، ان کا آپ کے پاس یا میرے پاس کیا علاج ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں ان موانع کو دُور کروں۔ مگر وہ میری طرف سے ہوں تو میں انہیں دُور کروں۔ میں نے ان کو کبھی OFFEND کیا ہو تو اس کی نشاندہی کی جائے، میں ہر وقت ان سے معافی مانگنے کے لیے تیار ہوں۔ میں نے ان کی نیت پر، اخلاق پر، دیانت پر کبھی کوئی حملہ کیا ہو، یا شک میرے دل میں ہو تو آپ بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ میں اس رفع کروں۔ مجھے ان سے کوئی ذاتی رنجش ہو تو اس کو بھی دل سے نکال دینے کا آپ مطالبہ کر سکتے ہیں۔ لیکن یہاں تو ان میں سے کوئی چیز بھی موجود نہیں ہے۔ موانع جو کچھ بھی ہیں انہیں کی طرف سے ہیں اور وہی ان کو دُور کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔

(ا) اس کا شاہد ان کا وہ خط ہے جو انہوں نے جائزہ کمیٹی کے سلسلہ میں مجھے لکھا تھا۔ اس نے مجھ پر یہ بات واضح کر دی ہے کہ ان کے نزدیک میں ایک نہایت بے ایمان اور بدفطرت انسان ہوں، یہ معلوم ہونے کے بعد اب میرے لیے کس طرح ممکن ہے کہ میں ان سے اطمینان کے ساتھ کسی معاملہ میں بات کر سکوں۔

اگرچہ آپ خود حالات سے واقف ہیں، مگر میں مختصراً بیان کیے دیتا ہوں کہ وہ موانع کیا ہیں:

(۱) مولانا نے پچھلے چند مہینوں میں میری ہر بات کو بدترین معنی پہنائے ہیں اور اس سے وہ وہ مفہوم نکالے ہیں کہ اگر فی الواقع میری باتوں کے مفہوم وہی کچھ ہوں تو شاید جماعت اسلامی کے ارکان ہی میں نہیں، متفقین و متاثرین میں بھی مجھ سے بڑھ کر خبیث آدمی کوئی نہیں ہوسکتا۔ جائزہ کمیٹی کے ارکان کے نام میرے خط پر جو طویل تبصرہ فرما کر انہوں نے میرے پاس بھیجا تھا، اور امارت سے میرے استعفاء کو جو معنی انہوں نے پہنائے اور نئی مجلس شوریٰ کے افتتاحی اجلاس میں میری تقریر کا جو مفہوم انہوں نے نکالا، یہ اس معنی آفرینی کی چند مثالیں ہیں جس سے مولانا اپنے اس قدیم نیاز مند کو نوازتے رہے ہیں۔ اگر یہ طریقہ انہوں نے اس لیے اختیار کیا ہے کہ اس دباؤ سے مجھے ایسی باتیں ماننے پر مجبور کیا جائے جو سیدھی طرح دلیل سے نہیں منوائی جاسکتیں تو یہ کھلا بلیک میلنگ ہے۔ لیکن اگر واقعی مولانا کے نزدیک میں اتنا ہی خبیث النفس ہوں جیسا ان کے بیان کردہ مضمون کے لحاظ سے میں لا محالہ قرار پاتا ہوں تو میرے ساتھ تعاون تو درکنار، انہیں تو جماعت اسلامی کے اندر میرے وجود کو بھی ایک لمحہ کے لیے ناگوار نہ کرنا چاہیے۔ پھر مجھ سے زیادہ ذلیل آدمی اور کون ہوسکتا ہے اگر اس کے بعد بھی میں اُن کے ساتھ تعاون کروں۔ ان کی تمام تاویلات اور معنی آفرینیوں کو میں غلط اور بے ہودہ اتہام سمجھتا ہوں[۱]۔ وہ خواہ بلیک میلنگ کی خاطر یہ باتیں کر رہے ہوں، یا ان کے حقیقی خیالات میرے متعلق یہی ہوں، دونوں صورتوں میں نہ میں ان کے ساتھ تعاون کرنے کے لائق رہ گیا ہوں، نہ وہ میرے ساتھ تعاون کرنے کے لائق۔

(۲): مولانا نے اس سال جنوری میں جماعت کی رکنیت سے استعفاء دیتے وقت جو خط

---

(۱) یہ معاملہ میرے لیے جس قدر تکلیف دہ ہے اس کا اندازہ مولانا کو اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک میں بھی ان کے اقوال و افعال کے ویسے ہی بدتر معنی نکال کر ان کے سامنے رکھ دوں جیسے انہوں نے میرے اقوال و افعال کے نکال کر میرے سامنے رکھے ہیں، مگر میں اس سطح تک اُترنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔

مجلس شوریٰ کو لکھا تھا اور اس متن کی جو شرحیں مختلف مراحل پر انہوں نے ارشاد فرمائی ہیں ان کا حاصل یہ ہے کہ جامعت اسلامی میرے مریدوں اور خوشامدی مصاحبوں کی ایک جماعت بن گئی ہے۔ان باتوں سے مولانا کا نقطۂ نظر صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر جماعت میں ان کی بات چلے تو وہ خالص ان کی دلیل کی طاقت سے چلتی ہے، اور میری بات چلے تو اس کی وجہ نہ میری دلیل کی طاقت ہے، نہ یہ ہے کہ جماعت کے لوگ اپنی حقیقی رائے کی بنا پر میرے ہم خیال ہیں، بلکہ صرف پیری مریدی ہے یا پھر خوشامد ہے جو میرے گرد جمع ہو جانے والے مصاحب کر رہے ہیں۔اس معاملہ میں بھی میں یہی کہوں گا کہ یا تو ان باتوں کا اصل مدعا یہ ہے کہ جماعت میں بہر حال مرضی انہی کی چلنی چاہیے، دلیل سے نہ چلے تو وہ اس طرح کی دھونس اور بلیک میلنگ سے چلانے کی کوشش کریں گے۔یا پھر واقعی اب اس جماعت کے متعلق مولانا کی حقیقی رائے ہی یہ ہے۔پہلی صورت میں وہ جماعت کے لائق نہیں اور دوسری صورت میں جماعت ان کے لائق نہیں ہے۔

(۳): مولانا نے مجھ پر پورے اصرار کے ساتھ آمریت کا الزام عائد کیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ میں جماعت میں جمہوریت کا خاتمہ کر رہا ہوں۔قریب کے زمانہ میں میرے خلاف اس الزام کو جتنا اُچھالا گیا ہے، میں جانتا ہوں کہ وہ سب انہی کی شہ پر ہے۔اس کے اصل مصنف وہی ہیں۔اس کے لیے دلائل فراہم کرنے والے بھی وہی ہیں اور اس سارے پروپیگنڈہ کی حوصلہ افزائی بھی انہوں نے کی ہے۔اس سے وہ چاہے انکار کر دیں مگر ان کا ضمیر جانتا ہے کہ اس معاملہ میں انہوں نے کیا کچھ کیا ہے۔اب میری پوزیشن یہ ہے کہ ایک طرف میں اپنے متعلق یہ جانتا ہوں کہ یہ ایک سراسر جھوٹا اور بے بنیاد الزام ہے جو مجھ پر لگایا گیا ہے، اور دوسری طرف مجھے اپنے برسوں کے تجربے اور مشاہدے سے معلوم ہے کہ مولانا کیسے کچھ جمہوریت پسند ہیں۔دنیا بھر میں وہ اپنی جمہوریت پسندی کا سکہ جما سکتے ہیں مگر اس شخص کے سامنے ان کا یہ ادعا کیسے چل سکتا ہے جو ان کے آمرانہ مزاج کی ایک ایک ادا کو جانتا ہے۔میرے سامنے وہ برسوں مجلس شوریٰ کے اجلاسوں میں دلیل کے بجائے تیز مزاجی اور تیز زبانی کی دھونس سے اپنی بات منوانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔میں بارہا اپنی

آنکھوں دیکھ چکا ہوں کہ مجلس شوریٰ کے اجلاسوں میں ان پر تنقید کرنا تو درکنار ان کی رائے سے اختلاف کرنا بھی کیسی کچھ تلخیوں کا موجب ہوا ہے۔ پچھلے ہی سال کا وہ واقعہ بھی مجھے یاد ہے کہ مجلس شوریٰ صبح کے اجلاس میں ایک فیصلہ کر چکی تھی، اور شام کے اجلاس میں (غالباً مجلس شوریٰ ہی کی ایک معروف شخصیت کے نجویٰ سے متاثر ہو کر) وہ بھرے ہوئے تشریف لائے اور آتے ہی انہوں نے مجلس کے اس فیصلہ کو چیلنج کر دیا، حالانکہ ایک طے شدہ فیصلہ کو چیلنج کرنا ویسے ہی کسی جمہوری قاعدے سے صحیح نہ تھا، اور مزید برآں مولانا مجلس شوریٰ کے باقاعدہ رکن اور دستور کی رو سے ووٹ دینے کے مجاز تک نہ تھے۔ اس پر صدیق الحسن صاحب نے جب ان کو آئینی پوزیشن سمجھانے کی کوشش کی تو وہ جس طرح ان کے لتے لینے کے لیے تیار ہو گئے اسے میں نہیں بھولا ہوں اور شاید آپ لوگ بھی نہ بولے ہوں گے۔ ان کی جمہوریت پسندی کی تازہ ترین مثال مجلس عاملہ کی تشکیل پر ان کا اعتراض ہے، حالانکہ یہ تشکیل ٹھیک ٹھیک جماعت کے دستور کے مطابق ہوئی ہے، اور جماعت کے دستور میں بھی تشکیل کا یہ قاعدہ اجتماعِ عام کی منظور کردہ قرارداد پر مبنی ہے اس اجتماع میں مولانا خود شریک تھے ان کی موجودگی میں وہ دستوری قرارداد پاس ہوئی اور انہوں نے اس سے اختلاف تک نہ کیا تھا۔ جس شخص کی جمہوریت پسندی کا یہ حال ہم برسوں اپنی آنکھوں دیکھتے رہے ہوں، خدا کی شان ہے کہ وہ اس شخص پر آج آمریت کا الزام لگانے کی جرأت کرتا ہے، جس نے ہمیشہ ٹھنڈے دل سے اپنے خلاف تنقیدیں سنی ہیں، جس سے اختلاف کرنے میں جماعت کے کسی شخص نے کبھی جھجک محسوس نہیں کی، جس نے مجلس شوریٰ کے اجلاسوں میں گھنٹوں اور دنوں صرف اس لیے بحث کو طول دیا ہے کہ اگر ایک رکن بھی اختلاف کر رہا ہے تو فیصلہ اس وقت تک نہ کیا جائے جب تک اسے مطمئن نہ کر دیا جائے، جس نے بارہا ایک مسئلہ کے فیصلہ کو صرف اس لیے ملتوی کر دیا کہ مجلس شوریٰ میں ڈویژن کرانا اسے پسند نہ تھا حالانکہ اکثریت اس کی ہم خیال تھی اور وہ اپنی رائے کے مطابق اکثریت سے فیصلہ کرا سکتا تھا، جس نے اپنے زمانۂ امارت میں ڈویژن کی نوبت اس قدر کم آنے دی ہے کہ شاید تین چار مرتبہ سے زیادہ آپ اس کا شمار نہیں کر سکتے۔ آپ لوگوں میں سے کوئی شخص ایک مثال بھی ایسی

پیش نہیں کر سکتا کہ میں نے کبھی مجلس شوریٰ کے فیصلہ کو اپنی ذاتی رائے کی بنا پر ردّ کرنے یا بدلوانے کی کوشش کی ہو۔ آپ لوگ اس بات کے بھی گواہ ہیں کہ گزشتہ سال کی آخری مجلس شوریٰ میں اگر ڈویژن پر فیصلہ کیا جاتا تو اکثریت سے اس اقلیت کی رائے کو ٹھکرایا جا سکتا تھا جس کی پیٹھ آپ سب لوگوں کے سامنے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب ٹھونک رہے تھے۔ ان سب حقائق کی موجودگی میں جب مجھے آمر ٹھہرایا جاتا ہے اور مولانا جمہوریت نواز بنتے ہیں تو میں اس کا مطلب یہ سمجھتا ہوں کہ اپنی آمریت نہ چلتے دیکھ کر مولانا کو غصہ آ گیا ہے اور اسی سے ان کو جمہوریت کا غم لاحق ہو گیا ہے۔ جس جمہوریت کے وہ خواہش مند ہیں وہ میرے نزدیک اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ جماعت میں ایک آئینی اور ایک غیر آئینی' دو قسم کی امارتیں چاہتے ہیں۔ آئینی امارت خواہ کسی کی بھی ہو' مگر غیر آئینی امارت انہیں حاصل رہے' پھر انہیں کبھی آمریت کا شکوہ نہ ہو گا۔

(۴): قریب کے زمانہ میں مولانا کا مستقل رویہ یہ رہا ہے کہ میں نے اس زمانہ میں جو کچھ بھی لکھا ہے یا کہا ہے یا امیر جماعت کی حیثیت سے جو کام بھی کیے ہیں ان پر وہ ہمہ تن شکایت بنے رہتے ہیں' یہ ہر وقت کی عیب جوئی اور بات بات پر شکایت وہ چیز نہیں ہے جس کے ساتھ کبھی دو آدمیوں کے درمیان خوشگوار تعلق رہ سکتا ہو۔

(۵): مولانا نے پچھلے دنوں مسلسل یہ طرزِ عمل بھی اختیار کیے رکھا ہے کہ جماعت میں ہر اس شخص کی انہوں نے حوصلہ افزائی کی ہے جو مجھ پر کسی طرح حملہ کر سکتا ہو۔ اس کی ابتداء پچھلے سال آپ سب لوگوں کے سامنے مجلس شوریٰ میں ہوئی تھی جب ملک سعید صاحب نے میری دیانت پر سراسر بے بنیاد حملہ کیا اور مولانا نے اسی وقت ان لوگوں کو حق گوئی کی داد دی۔ اس کے بعد سابقہ مجلس شوریٰ کے اس معرکۃ الآراء اجلاس میں مولانا جس جس طرح ان سب اصحاب کی پیٹھ ٹھونکتے رہے جنہوں نے مجھ پر اعتراضات' الزامات اور صریح اخلاقی حملوں کی بوچھاڑ کی تھی اسے آپ لوگ چاہے بھول گئے ہوں مگر میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ کیونکہ نہ میں اندھا ہوں کہ اس وقت کا ان کا اندازہ نہ دیکھ رہا ہوں' نہ بے وقوف ہوں کہ ان کی باتوں کے معنی نہ سمجھتا ہوں' اور نہ بے حس ہوں کہ ان باتوں کو بھول جاؤں۔ پھر

میرے خلاف جن جن حضرات نے پبلک میں کھل کر پروپیگنڈہ شروع کیا، میں جانتا ہوں کہ مولانا کی ہمدردیاں ان سب کے شامل حال رہی ہیں اور یہ بات اب کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے کہ مولانا ان سب کو حق بجانب اور مجھے قصوروار ثابت کرنے کی کوشش فرماتے رہتے ہیں۔ میرے لیے ان باتوں پر صبر کرنا تو ممکن ہے' اور میں خدا کے فضل سے اتنا ذلیل آدمی نہیں ہو کہ جواب میں کچھ لوگوں کو ان پر حملے کرنے کی جسارت دلاؤں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ جس شخص سے مجھے یہ کچھ تجربات ہو رہے ہوں اس کے لیے میں اپنے دل میں کوئی گنجائش پیدا نہیں کر سکتا۔ میرا احساس یہ ہے کہ مولانا جماعت میں اپنی پوزیشن تو یہ بنا کر رکھنا چاہتے ہیں کہ کوئی ان کے سامنے دم نہ مار سکے اور میری پوزیشن یہ بنانا چاہتے ہیں کہ میں نہ صرف ان کے سامنے بلکہ ان کے منظورِ نظر لوگوں کے سامنے بھی دُم نہ مار سکوں اور اگر دُم ماروں تو وہ خود بھی آستین چڑھا کر میرے مقابلہ میں آ کھڑے ہوں گے اور اپنے ساتھیوں کو بھی مقابلہ میں ڈٹ جانے کی ہمت دلائیں گے۔ کیا اس کے بعد بھی یہ ممکن ہے کہ میرے اور ان کے درمیان مخلصانہ تعلق باقی رہ سکے؟

یہ ہیں وہ موانع جو میرے اور مولانا کے درمیان تعاون کی راہ میں حائل ہیں۔ ان میں سے کسی کو دُور کرنا بھی میرے اختیار میں نہیں ہے۔ آپ اگر انہیں دُور کرا سکیں تو ضرور اس کی کوشش کریں لیکن یہ خوب سمجھ لیجئے کہ ان موانع کی موجودگی میں میرے اور ان کے تعلقات کا بحال ہونا قطعاً ناممکن ہے' خواہ وہ جماعت میں رہیں یا نہ رہیں۔ جتنا کچھ وہ مجھے بدنام کرا چکے ہیں اسے صبر کے ساتھ میں نے برداشت کر ہی لیا ہے۔ اب اگر رکنیت سے مستعفی ہو کر باقی ماندہ کسر بھی پوری کرنا چاہیں تو کر لیں۔ بہر حال جس دوست کو انہوں نے کھو دیا ہے اسے اپنا رویہ بدلے بغیر اب وہ کبھی نہ پا سکیں گے۔ یہ فیصلہ کرنا ان کا اپنا کام ہے کہ وہ دوست ان کے لیے کوئی قیمت رکھتا تھا یا نہیں۔

آپ نے اپنے خط میں عبدالمجید قریشی صاحب' صفدر صاحب اور طفیل صاحب کی ان تلخ باتوں کی شکایت بھی کی ہے جو وہ بعض اوقات مولانا کے بارے میں کہہ بیٹھتے ہیں۔ قریشی صاحب کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا' مگر باقی دونوں صاحبوں کے متعلق میں جانتا

ہوں کہ ان کے دل مولانا سے کس قدر رنجیدہ اور کیوں رنجیدہ ہیں۔ مولانا نے متعدد مرتبہ خود میرے سامنے ان کی تذلیل کی ہے۔ طفیل صاحب کے ساتھ تو ان کا جو برتاؤ رہا ہے اس کی ایک نہیں بیسیوں مثالیں آپ سب لوگوں کے سامنے مجلس شوریٰ کے بھرے اجلاسوں میں پیش آ چکی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ ان باتوں سے ان کا دل اس قدر زخمی ہو چکا ہے کہ اگر آج مولانا امین احسن صاحب جماعت کے امیر ہو جائیں تو طفیل صاحب شاید ایک منٹ کے لیے بھی مرکز میں نہ ٹھہریں۔ نعیم صاحب کا معاملہ بھی اس سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ انہوں نے بارہا مجھ سے اس کی سخت شکایت کی ہے کہ مولانا نے ان سے نہایت تذلیل وتحقیر کا برتاؤ کیا ہے' حتیٰ کہ ایک دفعہ اسی بنا پر وہ مجلس شوریٰ کی رکنیت سے استعفاء بھی لکھ کر مجھے دے چکے ہیں جسے واپس لینے کے لیے میں نے بمشکل انہیں راضی کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں بیٹے تک باپ کی جھڑکیاں برداشت نہیں کرتے۔ آخر مولانا نے یہ کیوں سمجھ رکھا ہے کہ جو اعلیٰ تعلیم یافتہ' شریف اور معزز خاندانوں کے نوجوان محض اللہ کے دین کی خاطر جماعت کی خدمت کرنے کے لیے آئے ہیں' وہ ان کی خاکِ پا کے برابر ہیں اور انہیں پورا حق ہے کہ جب چاہیں انہیں دس بیس آدمیوں کے سامنے ذلیل کر دیں۔ دراصل یہ مولانا کی اپنی ہی تیز مزاجی اور درشت کلامی کا خمیازہ ہے کہ جو لوگ کبھی ان کے سامنے آنکھ اُٹھانے کی جرأت بھی نہ کرتے تھے وہ اب سارا ادب لحاظ ختم کر دینے پر تُل گئے ہیں۔ اس صورتِ حال کو آخر میں کیسے بدل سکتا ہوں اور کب تک ان لوگوں کے جذبات کو قابو میں رکھ سکتا ہوں۔ انہوں نے تو خود میرے ساتھ بھی لحاظ مروّت کے معاملہ کو ختم کر دیا ہے اور غالباً آئندہ میرے لیے بھی یہ مشکل ہو گا کہ ان سے لحاظ مروّت کا برتاؤ کر سکوں۔ میں جن باتوں کی اصلاح چاہتا ہوں وہ مختصراً یہ ہیں:۔

(ا) مولانا اپنی اس عادت کو بدلیں کہ جس شخص سے انہیں اختلاف ہوتا ہے وہ اس کی بات کو بدترین معنی پہنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ افسوس ہے کہ انہوں نے اس عادت کو ایک خوبی سمجھ کر پرورش کیا ہے' اور اب وہ اس انتہاء کو پہنچ چکی ہے جس کا نمونہ جائزہ کمیٹی کے ارکان کے نام میرے خط پر تنقید کرتے ہوئے انہوں نے اپنے نوازش نامہ میں پیش فرمایا

ہے۔ یہ طریقہ میرے نزدیک ایسا ہے جس کے ساتھ تو جماعتی زندگی میں نباہ سخت مشکل ہے۔

(۲): مولانا کا یہ نقطۂ نظر بھی بدلنا ضروری ہے کہ جماعت میں امیر سے اختلاف کرنا ایک خوبی اوراس سے اتفاق کرنا ایک برائی ہے۔ یہ نقطۂ نظر بھی بتدریج پرورش کرتے رہے ہیں' یہاں تک کہ اب وہ بڑھ کر اس حد تک پہنچا ہے کہ جماعت میں جو بھی مجھ سے اتفاق کرتا ہے وہ ان کے نزدیک خوشامدی یا مرید' یا اندھا مقلد ہے اور جو بی مجھ سے اختلاف کرے یا میرے خلاف صحیح یا غلط اظہار رائے کرے' اس کی وہ ہمت افزائی کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ روش جماعت اسلامی میں امارت کی حقیقی روح کو بالکل ختم کردینے والی ہے اوراس کا نتیجہ مجھے یہ نظر آتا ہے کہ کوئی شخص بھی پھر جماعت کی امارت سنبھال کر کام نہیں چلا سکتا۔

(۳): مولانا نے مسلسل اپنے طرز عمل اوراپنی باتوں سے جماعت میں ''امیر بمقابلہ مجلس شوریٰ'' کے سوال کو اُبھارا ہے اور یہ صورتِ حال پیدا کی ہے کہ گویا امیر اور مجلس شوریٰ میں اختیارات کی کوئی کشمکش برپا ہے۔ نیز انہوں نے یہ اسپرٹ پیدا کرنے کی کوشش بھی کی ہے کہ امیر کے مقابلہ میں مجلس شوریٰ کے ارکان کو متحد ہونا چاہیے اور جو لوگ امیر کا ساتھ دیں ان کو خوشامدی اور ''سرکاری پارٹی'' کا آدمی اور غیر اہل الرائے قرار دے کر دبا دینا چاہیے۔ یہ باتیں میرے نزدیک اسلامی مجلس شوریٰ اور امیر جماعت کے تعلق کی حقیقی اسپرٹ کے بالکل خلاف ہیں اوراس کا لازمی نتیجہ ہودھڑے بندی ہے جو پوری جماعت کے اخلاق اور اس کی اجتماعی روح کو برباد کردے گی۔ جماعت اسلامی اگر صحیح طریقہ پر چل سکتی ہے تو اسی طرح کہ امیر اور مجلس شوریٰ بالکل ایک ٹیم بن کر کام کریں اور بحث واختلا جو کچھ بھی ہو حق و صواب تک پہنچنے کی خاطر ہو۔

(۴): میں یہ جانتا ہوں کہ مولانا کو جماعت کی پالیسی سے کوئی اختلاف نہیں ہے' نہ جماعت کے متعلق ان کے جذبات میں کوئی فرق آیا ہے۔ ان کی ناراضی تمام تر مجھ سے ہے۔ ادھر میں مجبور ہوں کہ جماعت مجھے امارت سے سبکدوش کرنے پر کسی طرح راضی نہیں ہوتی اور

میں اس سے بھاگ کر کہیں جا نہیں سکتا۔اس لیے چار و نا چار اس جماعت کے نظام کو اب میری ہی امارت میں چلنا ہے۔اس حالت میں تعاون اور رفاقت کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میری امارت سے اگر مولانا اپنے آپ کو پوری طرح RECONCILE نہ کر سکتے ہوں تو کم از کم اسے برداشت کرنے پر راضی ہو جائیں۔اس کے بغیر میں نہیں سمجھتا کہ آخر کس طرح مل کر کام ہو سکتا ہے۔

(۵):مولانا کا یہ طرزِ عمل میرے نزدیک جماعت کی خیر خواہی کے بالکل خلاف ہے کہ ملک سعید صاحب کے انٹرویو سے لے کر آج تک اخبارات میں میرے اور جماعت کے خلاف جس قدر پروپیگنڈہ ان کے نام اور حوالے سے ہوا' اس کی نہ صرف انہوں نے کبھی تردید نہ کی بلکہ وہ ہر قدم ایسا ہی اُٹھاتے چلے گئے جس سے اس کی توثیق ہو۔اس کے لیے یہ نظیر کوئی نظیر نہیں ہے کہ آخر قیم جماعت نے میرا استعفاء بھی تو شائع کر دیا تھا۔میرے استعفے میں کسی پر کوئی الزام نہ تھا۔لیکن دوسرے جن حضرات کے استعفے بھی اخبارات میں آئے ہیں ان سب میں طرح طرح کی حاشیہ آرائیوں کے ساتھ مجھ پر اور جماعت پر الزامات کی بوچھاڑ کی گئی ہے اور ان سب میں کسی نہ کسی طرح مولانا کا نام بھی استعمال کیا گیا ہے۔میرے نزدیک اگر کسی شخص کے دل میں جماعت کے لیے محبت اور قدر اور خیر خواہی کا کوئی ادنیٰ جذبہ بھی باقی ہو' اور وہ جانتا ہو کہ جماعت کی اخلاقی ساکھ کو نقصان پہنچنا اس ملک میں اقامت دین کے نصب العین کو کس قدر ضرر اور لادینی کی علم بردار طاقتوں کو کس قدر فائدہ پہنچا سکتا ہے' تو وہ کبھی اس چیز کو ٹھنڈے دل سے برداشت بھی نہیں کر سکتا' کجا کہ وہ خود اس میں مددگار رہو' میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ مولانا کی طرف سے اس پروپیگنڈہ کی صاف صاف تردید ہو اور آئندہ وہ کوئی قدم ایسا نہ اُٹھائیں جو اسے تقویت پہنچانے والا ہو۔وہ خوب جانتے ہیں کہ جماعت کے کسی منصب سے ان کا استعفاء دو چار ہی دن بعد اخبارات میں بڑی حاشیہ آرائیوں کے ساتھ آ جائے گا۔یہ جانتے ہوئے بھی جب وہ کسی منصب سے استعفاء دیتے ہیں تو کم از کم میرے نزدیک تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ ان کا دل اب جماعت کے لیے ہر جذبۂ خیر سے خالی ہو چکا ہے اور میرا اندازہ ہے کہ یہی اثر ارکان

جماعت اور متفقین کی ایک بڑی اکثریت کے ذہن پر مترتب ہو رہا ہے۔

(٦): مولانا کے جس خط کو ڈاکٹر عثمانی صاحب پھیلا رہے ہیں اور جسے جماعت سے نکلنے والے حضرات جگہ جگہ لیے پھرتے ہیں' اس کی تلافی اب لامحالہ مولانا کو خود ہی کرنی ہو گی۔ اگر وہ نہ کریں گے تو میرے لیے زیادہ دیر تک اس صورتِ حال کو برداشت کرنا بالکل ناممکن ہے۔ پچھلے دورے میں کراچی' سکھر' بہاولپور' لائلپور اور راولپنڈی کے حلقوں میں مجھے اس سے سابقہ پیش آ چکا ہے۔ مختلف مقامات پر اسے جماعت کے ارکان اور متفقین تک پہنچایا گیا ہے' اور بعض جگہ تو خاص طور پر یہ کوشش کی گئی ہے کہ جماعت کو جن گوشوں سے مالی امداد ملتی ہے وہاں اسے پھیلا کر بدگمانیاں پیدا کی جائیں۔ اس میں میری جو گھناؤنی تصویر پیش کی گئی ہے' آخر اسے میں کب تک نظر انداز کر سکتا ہوں۔ اگر یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا اور مولانا نے خود اس کی کوئی تلافی نہ کی تو میں اس کے متعلق کچھ نہ کچھ کرنے پر مجبور ہوں گا اور اس صورت میں اس بات کا لحاظ کرنا میرے لیے قطعاً ناممکن ہو گا کہ مولانا ابھی تک میرے ایک رفیق جماعت ہیں۔ مجھے لامحالہ اس تحریک کی خاطر اپنی مدافعت کرنی ہو گی' اور اگر ناگزیر طور پر اس سلسلہ میں مولانا پر کوئی آنچ آئے تو پھر مجھ سے شکایت کرنا بالکل غلط ہو گا۔

(٧): مولانا کو ہم پہلے بھی سر آنکھوں پر بٹھاتے رہے ہیں اور اب بھی اس کے لیے تیار ہیں۔ لیکن بہت فرق ہے اس بات میں کہ کسی کو اس کے مرتبے اور خدمات کی وجہ سے سر پر بٹھایا جائے اور اس میں کہ کوئی اپنے مرتبے اور خدمات کی دھونس سے ہمارے سر پر سوار ہونے کی کوشش کرے۔ مولانا کو پہلی ہی صورت پر قناعت کرنی چاہیے اور ایسی باتیں نہ کرنی چاہئیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہو کہ وہ اپنے آپ کو دستور' نظام' جماعت اور امیر جماعت سب سے بالاتر رکھنا چاہتے ہیں۔

(٨): آخری اور میرے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ مولانا اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ اس جماعت میں اگر وہ میرے ساتھی اور مددگار کی حیثیت سے رہیں تو میری اور ان کی طاقت مل کر ایک بڑی طاقت بنتی ہے جو جماعت کے لیے بھی مفید ہے اور تحریک اسلامی کے لیے بھی' اور اگر وہ میرے مدمقابل اور زعیم حزب اختلاف کی پوزیشن اختیار کریں تو یہ

ہر حیثیت سے نقصان دہ ہے، جماعت کے لیے بھی اور تحریک اسلامی کے لیے بھی۔

نوٹ: مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کی طرف سے اس خط کا جو جواب دیا گیا ہے وہ اگلے صفحات پر درج ہے۔

مولانا اصلاحی کا مکتوب بنام مولانا مودودی

مخدومی مولانا! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

میں آپ کی اس عنایت کے لیے دل سے شکر گزار ہوں کہ آپ نے آخری نتیجہ تک پہنچانے میں میری مدد کے لیے وہ خط بھی بھیج دیا جو آپ نے میرے بارے میں چوہدری غلام محمد صاحب کو لکھا تھا۔ میں نے یہ خط پڑھ لیا۔ اس کو پڑھنے کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ میں نے استعفاء دینے میں دیر لگائی۔ اگر اپنے بارے میں آپ کے ان احساسات کا علم مجھے پہلے ہو گیا ہوتا تو میں بہت پہلے استعفاء دے چکا ہوتا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ تاخیر بھی منجانب اللہ ہے اور انشاء اللہ موجب خیر ہوگی۔ میں اس خط پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا صرف چند باتوں کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

(۱): اس خط میں آپ نے جماعت کے اندر میرا اعتبار و وقار قائم کرنے کے لیے میرے اوپر اپنے جن احسانات کا ذکر کیا ہے میں ان کے لیے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مگر یہ ضرور عرض کروں گا کہ اس اہتمام سے ان احسانات کے جتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس سے آپ کے اجر میں کمی ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ ایک نااہل پر اول تو یہ احسانات کرنے نہ تھے اور اگر آپ نے کر ہی ڈالے تھے تو کریم النفسی کا تقاضا یہ تھا کہ میرے کفرانِ نعمت کے باوجود ان کو بھول جاتے اور اگر آپ ان کو بھول نہیں سکتے تھے تو کم از کم یہ توقع تو مجھ سے نہ رکھتے کہ میں ان کے بدلہ میں ضمیر فروشی کروں گا۔

(۲): اس میں آپ نے مجھے جو دھمکیاں دی ہیں وہ بھی کچھ غیر ضروری سی ہیں اگر آپ یہ دھمکیاں نہ بھی دیتے جب بھی میں آپ کی طرف سے اسی طرزِ عمل کی توقع رکھتا ہوں جس کے اختیار کرنے کی آپ نے دھمکی دی ہے۔ میں زمانہ اور اہل زمانہ سے اتنا بے خبر نہیں ہوں۔ ان دھمکیوں کے جواب میں صرف یہ گزارش ہے کہ میں اللہ تعالیٰ سے برابر دعا کر رہا ہوں کہ وہ اس سلسلہ میں مجھے کسی ابتلا میں نہ ڈالے اور اگر ڈالے تو ایک مردِ حق کی طرح اس سے عہدہ برآ ہونے کی ہمت، توفیق اور قابلیت عطا فرمائے۔

(۳): آپ حضرات نے میری تیز مزاجی، سخت کلامی اور ''معنی آفرینی'' کا شہرہ تو عجم سے لے کر عرب تک پہنچانے کی سعی فرمائی لیکن اس خط میں آپ نے میری نسبت جو الفاظ رقم فرمائے ہیں، میری نیت پر جو حملے کیے ہیں اور افراد کو بھی اور جماعت کو بھی جن جن طریقوں سے میرے خلاف برانگیختہ کیا ہے کبھی ان پر بھی ٹھنڈے دل سے غور فرمائیے۔

(۴): میری آمریت اگر آپ کی طرف سے میری ''ناز برداری'' کے بل پر تھی تو گناہ گار آپ ہیں نہ کی میں۔غور کرنے کی بات ہے کہ ایک شخص جو شوریٰ کا رکن نہیں، جو ووٹ دینے تک کا مجاز نہیں، جس کو لوگوں کو شوریٰ سے کان پکڑ کر نکال دینے کا اختیار نہیں آخر اس کو یہ مقام کو کس طرح حاصل ہو گیا کہ وہ شوریٰ کو اس کے فیصلے بدلوا دینے پر مجبور کر دیتا تھا۔آخر میرے ہاتھ میں وہ کون سا ڈنڈا تھا جس کے آگے سب حضرات بے بس تھے۔میں نے شوریٰ کا جو فیصلہ اپنی آمریت کے زور سے شوریٰ سے بدلوا دیا تھا میں درخواست کرتا ہوں کہ وہ اور جن جن چیزوں پر آج اور اس سے پہلے میں ''ہمہ تن شکایت'' بنا رہا ہوں وہ سب آپ جماعت کے سامنے رکھ دیں اس سے جماعت کو میری نسبت رائے قائم کرنے میں بڑی مدد ملے گی اگر آپ کو ان کو ان کے سامنے لانے میں تردد ہو تو مجھے اجازت مرحمت فرمائیے میں ہی ان کو سامنے رکھ دوں تا کہ لوگ اندازہ کر سکیں کہ میں نے کن ہلاکتوں سے جماعت کو بچایا یا بچانے کی سعی کی مگر ناکام رہا۔

(۵): میں جماعت کے متعلق یہ خیال نہیں رکھتا کہ وہ خوشامدیوں کی جماعت ہے یا آپ کے مریدوں کی جماعت ہے۔میں جماعت کے اندرونی احساسات سے آپ سے زیادہ واقف ہوں میں خوشامدی صرف انہی افراد کو سمجھتا ہوں جو فی الواقع خوشامدی ہیں اور جن کے کارنامے ان کے اس وصف کے گواہ ہیں اور پیری کی گدی اُس جدید نظام کو سمجھتا ہوں جس کی بساط اب آپ نے بچھائی ہے اور جماعت جس کے نتائج سے بے خبر ہے۔

(۶): جو لوگ جماعت سے نکلے یا نکالے گئے ہیں میرا ان کے ساتھ تعلق ڈھکا چھپا نہیں ہے۔میں ان سے برأت کرنا گناہ سمجھتا ہوں۔میرے نزدیک یہ سب لوگ آپ کے استبداد کے شکار ہوئے ہیں اور اگر ان میں سے کسی نے کوئی غلط حرکت کی بھی ہے تو محض آپ

حضرات کی بے تدبیریوں سے مشتعل ہو کر کی ہے۔ میرے نزدیک آپ لوگوں نے ملک سعید کے ساتھ بھی سخت زیادتی کی ہے۔ ان کی غلطی اگر کوئی ہے تو یہ کہ انہوں نے آپ کی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی کوشش کی۔ میں نے اگر ان کی کسی بے جا حرکت پر پیٹھ ٹھونکی ہو تو مجھ پر خدا کی لعنت ہو۔

(۷): آپ اپنے آپ کو نہ صرف جماعت اسلامی کا قائم مقام سمجھتے ہیں بلکہ خود اسلام کا بھی قائم سمجھنے لگے ہیں۔ آپ کے نزدیک اگر آپ کی کسی حرکت پر کسی کو اعتراض ہو تو وہ جماعت پر اعتراض ہے اور جب یہ جماعت پر اعتراض ہے تو اسلام پر اعتراض ہے۔ اس طرح آپ اپنا یہ ذہن بنائے بیٹھے ہیں کہ آپ کی ذات اگر کہیں زیر بحث آئی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس ملک میں اقامت دین کا سارا کام درہم برہم ہو جائے گا اور لادینی طاقتیں غالب ہو جائیں گی۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ سوچنے کے اس انداز کو بدلیں۔ خدا نے اسلام کو نہ آپ کے ساتھ باندھا ہے نہ جماعت اسلامی کے ساتھ اور نہ کسی اور کے ساتھ۔ اگر آپ اسلام کا کام کرنے اُٹھے ہیں تو خدارا اس کی یہ قیمت تو نہ مانگیے کہ اگر آپ اسلام پر بھی ہاتھ صاف کرنے لگ جائیں تو بھی لوگ اس کو جاننے کے باوجود چپ رہیں کیونکہ اس سے اقامت دین کے جہاد کو نقصان پہنچ جائے گا۔

(۸): مصالحت کرانے والوں کے رویہ کا آپ نے جو شکوہ کیا ہے مجھے اس کی نسبت کچھ کہنا نہیں ہے۔ معلوم نہیں انہوں نے آپ کے ساتھ بے وفائی کی ہے یا آپ نے ان کے ساتھ۔ میں اس قضیہ میں پڑنا نہیں چاہتا۔ میرے نزدیک انہوں نے نہایت اخلاص اور احتیاط کے ساتھ حالات کو درست کرنے کی کوشش کی اگرچہ وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔

(۹): آپ نے جن شریف انسانوں کی تذلیل کا الزام مجھ پر لگایا ہے ان میں سے نعیم صدیقی صاحب کی نسبت مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔ ان کی تذلیل محض ان کے اپنے ذہن کی تخلیق کا کرشمہ ہے۔ البتہ طفیل صاحب کے اخلاص کی میں بڑی قدر کرتا رہا ہوں۔ جب کبھی میں نے محسوس کیا ہے کہ میری کسی بات سے ان کو تکلیف پہنچی ہے تو میں نے ان سے معافی مانگی

ہے۔ اگر ان کا کوئی حساب میرے ذمہ باقی رہ گیا تھا تو میرا خیال ہے کہ ادھر پچھلی دو ملاقاتوں میں انہوں نے چکا لیا ہوگا۔ لیکن اگر کوئی ملال اب بھی ان کے دل میں باقی ہے تو میں اپنی ذات کو، اپنے مال کو اور اپنی آبرو کو ان کے آگے پیش کرتا ہوں وہ مجھ سے قصاص لے لیں۔ اور آخرت کی مسئولیت سے مجھے بری کریں اور یہ تو آپ ان کو بہر حال اطمینان دلا دیں کہ وہ مرکز چھوڑنے کا ہرگز خیال نہ کریں۔ اب میرے امیر بن جانے کا کوئی امکان بھی باقی نہیں رہا ہے۔

والسلام

(دستخط) امین احسن اصلاحی ۱۶/جنوری ۵۸ء

نوٹ: مولانا اصلاحی کے اس خط کے جواب میں مولانا مودودی کی طرف سے جو خط آیا وہ اگلے صفحات پر ملاحظہ فرمائیے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا جوابی مکتوب

۱۶؍جنوری ۵۸ء

محترمی ومکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ

منسلکہ خط روانہ کرنے ہی والا تھا کہ آپ کا تازہ خط مل گیا۔ اگرچہ اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے' لیکن چونکہ میں نے وعدہ کیا تھا کہ آپ کی گفتگو پر غور کرنے کے بعد دو دن کے اندر میں اپنے آخری تاثرات عرض کردوں گا' اس لیے میں یہ خط بھیج رہا ہوں۔ مناسب ہوا گر آپ اسے کم از کم پڑھ ہی لیں اور اگر اس کے بعد اپنے نقطۂ نظر میں کوئی تبدیلی فرمائیے تو اس سے زیادہ خوشی کی کوئی بات نہ ہوگی۔

خاکسار ابوالاعلیٰ

محترمی جناب مولانا امین احسن صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ

میں حسب وعدہ دو دن سے غور وخوض کے بعد آپ کو مطلع کررہا ہوں کہ آپ سے جو گفتگو ہوئی تھی اس کے متعلق میں کن نتائج پر پہنچا ہوں۔

اس گفتگو میں جن مسائل کو آپ زیر بحث لائے تھے ان میں اصل اہمیت تین مسائل کی ہے۔

اول یہ کہ آپ کو جماعت کے موجودہ دستور' نظام اور پالیسی سے اتفاق نہیں ہے اور آپ ان میں ترمیم چاہتے ہیں۔ دوم یہ کہ آپ میرے اس اقدام کو غلط سمجھتے ہیں جو میں نے جائزہ کمیٹی کے ارکان کے نام اپنے خط میں کیا تھا۔ اور آپ چاہتے ہیں کہ میں بھی اسے غلط مان لوں۔ سوم یہ کہ آپ کے نزدیک کوٹ شیر سنگھ کے اجلاس شوریٰ میں میری افتتاحی تقریر آپ کے نزدیک سخت قابل اعتراض ہے اور آپ سمجھتے ہیں کہ یہ جماعت کے اندر جمہوریت کا خاتمہ کردینے والی چیز ہے۔

میں ان میں سے ہر ایک پر نمبروار اپنے خیالات ظاہر کروں گا۔

۱۔ جماعت کا دستور' نظام اور پالیسی وہ چیز نہیں ہے جو میرے اور آپ کے درمیان کسی

سمجھوتے کے ذریعہ سے بدلی اور بنائی جاسکے۔ یہ مرکزی مجلس شوریٰ کے اختیار کی چیز ہے، اور مرکزی مجلس شوریٰ ہرگز کوئی ایسا ادارہ نہیں ہے کہ میں اور آپ ایک جگہ بیٹھ کر بالا بالا کچھ فیصلے کریں اور وہ بس ان پر انگوٹھا لگا دے۔ آپ اگر جماعت کی ان بنیادی چیزوں میں کوئی تبدیلی چاہتے ہوں تو نظامِ جماعت میں رہ کر مجلس شوریٰ کے رکن کی حیثیت سے اپنی تجاویز اور ترمیمات باقاعدہ پیش کیجیے۔ مجلس اگر آپ کے دلائل سے مطمئن ہو کر کوئی تغیر و تبدل کرنے پر راضی ہو جائے گی تو جو تغیر بھی آپ چاہیں گے وہ ہو جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ آپ مجھ سے مطالبہ کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ آپ کی پیش کردہ ترمیمات کی میں تائید کروں۔ مگر اس مطالبہ کو بھی میں کسی سمجھوتے کی شکل میں پورا نہیں کر سکتا۔ اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ آپ مجھے اپنی ترمیمات کا قائل کرنے کی کوشش فرمائیں، میں قائل ہو جاؤں گا تو ضرور ان کی تائید کروں گا، ورنہ محض آپ کو راضی کرنے کے لیے ایک بات کو غلط سمجھتے ہوئے اس کی تائید کرنا بددیانتی بھی ہے اور مجلس شوریٰ کے ساتھ خیانت بھی۔ اس پوزیشن کو اگر آپ قبول کریں تو میں اس کے لیے تیار ہوں کہ جس قدر جلدی ممکن ہو مجلس شوریٰ کا ایک اجلاس بلاؤں اور اس میں آپ کو اپنی مجوزہ ترمیمات پیش کرنے کا موقع دوں۔ مجلس شوریٰ کے متعلق یہ بدگمانی آپ اپنے دل سے نکال دیں کہ وہ یا اس کی اکثریت یا اس کی کوئی اقلیت میرے حق میں یا آپ کے خلاف کوئی تعصب رکھتی ہے۔ یہ سب لوگ للہ و فی اللہ کام کرنے کے لیے اس جماعت میں آئے ہیں، کسی بندے کی خاطر نہیں آئے ہیں۔ آپ کے خلاف ان کے دلوں میں قطعاً کوئی تعصب نہیں ہے۔ سب آج بھی اسی طرح آپ کے نیازمند اور قدر شناس ہیں جس طرح پہلے تھے۔ آپ صاف دل کے ساتھ تشریف لائیے۔ آپ کی بات کھلے دل کے ساتھ سنی جائے گی۔ اس میں وزن ہوگا تو اپنے وزن کے لحاظ سے قبول کی جائے گی، اور اگر اس کے خلاف دلائل وزنی ہوں گے تو ان کے وزن کی بنا پر آپ کی بات ردّ کی جائے گی۔ کسی کے حق میں یا کسی کے خلاف تعصب کے جذبے سے معاملات پر غور کرنا اور اس لحاظ سے ان کا فیصلہ کرنا ایک گناہِ عظیم ہے اور اُس حلف کے خلاف ہے جو مجلس شوریٰ کا ہر رکن اپنا فرض منصبی سنبھالنے سے پہلے اُٹھاتا ہے۔

۲۔ جائزہ کمیٹی کے ارکان کے نام میرا خط جن اصحاب کے لیے موجب دل آزاری ہوا ہے ان سے میں بار بار علی الاعلان معافی مانگ چکا ہوں اور جتنی مرتبہ اور جس طرح آپ فرمائیں پھر معافی مانگنے کے لیے تیار ہوں۔ میں پچھلے سال جنوری ہی میں اس کو واپس بھی لے چکا ہوں اور اس کے کالعدم ہونے کا اعلان بھی کر چکا ہوں' یہ زیادہ سے زیادہ وہ حد ہے جہاں تک میں کسی کو راضی کرنے کے لیے جا سکتا ہوں۔ رہی یہ بات کہ جس چیز کو میں غلط نہیں سمجھتا اسے محض راضی نامہ کے طور پر غلط مان لوں' تو یہ میرے نزدیک بددیانتی ہے جس کا مجھ سے مطالبہ کرنے کا کسی کو بھی حق نہیں ہے۔ میں نے جس وقت یہ کام کیا تھا اسے حق سمجھتے ہوئے کیا تھا' اور اس کے بعد کوئی چیز میرے سامنے ایسی نہیں آئی جس کی بنا پر میں اسے باطل مان لیتا' بلکہ بعد کے واقعات نے تو میری رائے پر مہر تصدیق ثبت کر دی جس کی بنا پر میں آج پہلے سے زیادہ اسے حق سمجھتا ہوں۔ میں اپنے علم اور تجربے اور مشاہدے کی بنا پر یہ یقین رکھتا ہوں کہ ۵۶ء میں جماعت کے اندر ایک بلاک پیدا ہونا شروع ہوا۔ اس بلاک کے بننے اور منظّم ہونے میں ''جائزے'' کے کام نے سب سے بڑا کردار ادا کیا (قطع نظر اس سے کہ ایسا کرنے کا ارادہ کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو) یہ بلاک دسمبر ۵۶ء کی مجلس شوریٰ کے موقع پر بالکل مشہود صورت میں اس طرح سامنے آیا کہ مجلس کے اندر بھی اور اس کے باہر بھی اس سے تعلق رکھنے والے ارکان موجود تھے اور آپ جیسا بااثر آدمی اس کا محور اور مدار بنا ہوا تھا۔ اور اس دسمبر کی مجلس شوریٰ میں یہ بات بھی میں نے اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ لی تھی جسے میں جھٹلا نہیں سکتا کہ اس صورتِ حال نے جماعت میں دھڑے بندی کی بنا ڈال دی ہے اور نوبت یہ آ گئی ہے کہ جماعت کی بنیادی پالیسی' جس پر ساری تحریک کو چلنا ہے' اتفاق رائے سے بننے کے بجائے دو دھڑوں کے درمیان مصالحت اور لین دین کی بنیاد پر بننے لگی ہے۔ میرے نزدیک یہ چیز دستور جماعت کے قطعی خلاف تھی۔ میں یہ بھی قطعی رائے رکھتا تھا کہ مصالحتوں کے ذریعہ سے گول مول پالیسیاں بنا کر یہ تحریک ہرگز نہیں چل سکتی۔ میں یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ مصالحتی فارمولے جماعت کو جمع کرنے کے بجائے اس کے تفرقے کو روز بروز بڑھاتے چلے جائیں گے کیونکہ اس کی تعبیر ہر دھڑے کے لوگ اپنے

منشاء کے مطابق کریں گے، ہر ایک اپنی تعبیر کے حق میں ارکان جماعت کی رائے ہموار کرنے کی کوشش کرے گا، اور اس طرح رفتہ رفتہ پوری جماعت نہ صرف یہ کہ مختلف دھڑوں میں بٹتی چلی جائے گی بلکہ جماعت کے کارکن ان تعبیرات کی بحثوں میں الجھ کر کوئی کام کرنے کے قابل نہ رہیں گے۔ مجھے اس بات کا بھی یقین تھا کہ ایک مرتبہ دھڑے بندی میں مبتلا ہو جانے کے بعد اس جماعت کے اخلاق، اس کی یک جہتی، اس کی باہمی الفت، اس کا ڈسپلن، اس کی کارکردگی، غرض کوئی چیز بھی بخیریت نہیں رہ سکے گی۔ ان وجوہ سے میں یہ سمجھتا تھا کہ اس دھڑے بندی کو روکنے کے لیے مضبوط ہاتھوں سے ایک ضرب کاری لگائے بغیر چارہ نہیں ہے۔ میں جانتا تھا کہ اس کا نتیجہ اپنے عزیز ترین دوستوں سے لڑائی مول لینا ہو گا۔ میں اس سے بچنا چاہتا تھا۔ اسی لیے میں نے دسمبر ۵۶ء کی مجلس شوریٰ میں استعفاء پیش کیا تھا۔ مگر جب آپ لوگوں نے اسے قبول نہ کیا اور مجھے امارت کے فرائض ادا کرنے پر مجبور ہی کر دیا تو پھر میرے لیے ناگزیر تھا کہ امیر جماعت کی حیثیت سے جس چیز کو میں ایمانداری کے ساتھ اپنا فرض سمجھتا ہوں اسے ادا کروں۔ میں سخت گناہ گار اور بددیانت ہوتا اگر اس دھڑے بندی کو دستور کے خلاف، جماعت کے لیے مہلک اور تحریک اسلامی کے لیے تباہ کن سمجھنے کے باوجود گوارا کرتا اور اسے توڑنے کے لیے جلدی سے جلدی کوئی قدم نہ اٹھاتا۔ میں نے جلد بازی نہیں کی۔ اس مصالحتی فارمولے کو جسے دسمبر ۵۶ء کی مجلس شوریٰ پاس کر گئی تھی ایک مرتبہ آزمائش کا موقع دینے کی پوری کوشش کی۔ مگر جب بالکل آفتابِ روشن کی طرح یہ حقیقت میرے سامنے آ گئی کہ یہ فارمولا جماعت میں تفرقے کی پرورش اور افزائش کا ذریعہ بن گیا ہے، تب میں نے انتہائی قلبی اذیت کے ساتھ اپنا فرض انجام دیا۔ میں نے جو قدم اس وقت اٹھایا وہ اس دھڑے بندی کو توڑنے کے لیے میرا پہلا قدم تھا، اور اسی میں، میں نے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ آگے اس سلسلہ میں مجھے مزید قدم اُٹھانے ہیں۔ یہ قدم میں نے جن لوگوں کے خلاف اٹھایا ان سے مجھے کوئی عداوت نہ تھی۔ وہ میرے نہایت عزیز دوست تھے۔ اگر میں امیر جماعت نہ ہوتا تو ان سے ادنیٰ تعرض کرنے کا خیال بھی میرے دل میں نہ آ سکتا تھا۔ مگر جب آپ ایک نظام اور ایک تحریک کو چلانے کی ذمہ داری مجھ پر

ڈالتے ہیں جس کے لیے میں خدا اور خلق اور پوری جماعت کے سامنے جواب دہ ہوں' تو میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں دوستوں کی پاسداری تو نہیں کر سکتا۔ میرا فرض جس چیز کا مطالبہ بھی کرے گا' میں اسے کروں گا خواہ اس کی ضرب میرے کسی دوست پر پڑے یا میرے کسی بھائی بند پر' یا میری اپنی ذات پر۔

یہ تھی بنیاد میرے اُس اقدام کی۔ اس کے بعد سے آج تک جو حالات پیش آئے ہیں ان میں سے ہر ایک نے میری اس رائے کی توثیق و تصدیق کی ہے جو میں نے اس اقدام کے وقت قائم کی تھی۔ آج ایک اندھا بھی دیکھ سکتا ہے کہ جماعت کے اندر بلاک سازی ہوئی تھی یا نہیں اور بلاک سازی کے رجحانات کس نوعیت کے تھے اور یہ عناصر کس مرکز (NUCLEUS) کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ آپ کہتے ہیں کہ میرا اقدام جماعت کے لیے مہلک تھا۔ میں کہتا ہوں کہ اس کے نقصان کو اس نقصان سے کوئی نسبت نہیں ہے جو یہ قدم نہ اٹھانے کی صورت میں جماعت کو پہنچتا۔ بلکہ میں تو بالیقین یہ سمجھتا ہوں کہ اگر میں نے چند مہینے بھی اس حالت پر گزر جانے دیئے ہوتے تو آج جماعت کے جسم میں نہ معلوم کتنے بلاکوں کے کتنے بڑے بڑے سرطان پیدا ہو چکے ہوتے۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ اقدام دستور جماعت کے خلاف تھا۔ میں اس کے متعلق ماچھی گوٹھ کے اجتماع عام میں علی الاعلان بھی کہہ چکا ہوں' آپ سے زبانی گفتگو میں بھی عرض کر چکا ہوں' اور اب پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ پاکستان میں دستوری قانون کے جو نمایاں ترین ماہر موجود ہیں ان سب کی خدمات حاصل کر کے یہ معاملہ ان کے سامنے رکھ دیجئے اور ان سے یہ فیصلہ لے لیجئے کہ اقدام دستور کے اندر تھا یا باہر۔ ان ماہرین کی فیس میں اپنی جیب سے ادا کرنے کو تیار ہوں۔ آپ کہتے ہیں کہ وہ راستی اور انصاف کے خلاف تھا اور اس میں بے بنیاد الزامات لگائے گئے تھے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ آپ مجلس شوریٰ کے ایک رکن کی حیثیت سے بآسانی اس بنیاد پر میرے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد لے آئیں۔ مجلس کے پچاس ارکان' جنہیں ساری جماعت نے مل کر منتخب کیا ہے' نہ بے عقل اور کودن ہیں' اور نہ آپ یہی کہہ سکتے ہیں کہ سب کے سب بے ایمان ہیں۔ آپ اپنے سارے دلائل و شواہد ان کے سامنے رکھ دیجئے' اور میں

بھی اپنے حق میں جو دلائل اور شہادتیں رکھتا ہوں وہ بے کم و کاست پیش کروں گا۔ ان کا جو فیصلہ ہو، اسے آپ بھی مان لیں، میں بھی مان لوں گا۔ یہ سیدھا اور صاف راستہ علی رؤس الاشہاد اختیار کرنے کے بجائے آخر میں اور آپ دو چار آدمیوں کے درمیان بند کمروں میں فیصلے کرانے کی کوشش کیوں کریں۔ آپ کو شکایت ہے کہ میں نے آپ کے خط کا جواب نہیں دیا جس میں آپ نے جائزہ کمیٹی کے خلاف میرے اقدام پر گرفت فرمائی تھی اس کی وجہ سے مختصراً آپ سے عرض کروں کیے دیتا ہوں۔ میں اس بات کو پہلے سے جانتا تھا کہ جماعت میں بلاک سازی کرنے والے عناصر آپ کے گرد جمع ہو رہے ہیں۔ مجھے آپ سے امید نہیں تھی کہ آپ ایک حزبِ اختلاف کی قیادت سنبھالیں گے، بلکہ میں توقع رکھتا تھا کہ آپ میرے دست راست بن کر اس فتنہ کو روکنے میں میری مدد کریں گے۔ اسی لیے دسمبر ۵۶ء کی مجلس شوریٰ سے پہلے میں آپ ہی کو اس صورت حال کی اصلاح کے لیے ذریعہ بناتا رہا۔ مگر شوریٰ کے اس اجلاس میں آپ نے بڑی وضع احتیاط کے ساتھ جو روش اختیار فرمائی اس نے مجھے اچھی خاصی خد تک یہ یقین دلا دیا کہ آپ دانستہ یا نادانستہ اس بلاک سازی کے سرپرست بن چکے ہیں۔ اس کے بعد جب آپ کا وہ خط آیا تو میرے لیے درحقیقت وہ اس بات کی اطلاع تھی کہ آپ نے نہ صرف زعیم حزب اختلاف کی پوزیشن باقاعدہ سنبھال لی ہے بلکہ مجھ سے لڑنے کے لیے آستین بھی چڑھا چکے ہیں۔ میرے لیے یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ آپ سے تُو تُو مَیں مَیں کرنے کے لیے تیار ہو جاتا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ اگر اس تُو تُو میں میں سے اس جماعت میں اور سارے ملک میں میرا وقار آپ کے ہاتھوں اور آپ کا وقار میرے ہاتھوں ختم ہو جائے تو پھر کوئی تیسرا آدمی ایسا نہیں ہے جو اس تحریک کو لے کر چل سکے۔ اس بنا پر میں نے آپ کو جواب دینے کے بجائے امارت سے استعفاء دینے کو ترجیح دی مگر افسوس ہے کہ آپ نے اس کو بھی اُلٹے معنی پہنائے۔

اس کے بعد سے آج تک آپ جو کچھ کرتے رہے ہیں وہ بہرحال ظاہر صورت کے اعتبار سے تو ایک زعیم حزبِ اختلاف کا کردار ہی ہے۔ آپ ہی کے گرد وہ عناصر جمع ہوئے ہیں، آپ ہی کے ارشادات نے ان کے ذہن کی تخلیق کی ہے۔ آپ ہی کی حمایت نے ان کو

شدت کے ساتھ اپنے نقطۂ نظر پر جمایا ہے۔ یہ ایسے واقعات ہیں جن سے اب انکار کرنا تو کسی کے بس میں نہیں ہے۔ البتہ یہ بات میں جزم و یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ آیا آپ نے بالقصد یہ پوزیشن اختیار کی ہے' یا حالات و واقعات کے چکر نے آپ کو یہاں لا پھنسایا ہے۔ میں مجرد آپ کے قول پر یقین کرنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ اپنی زبان یا قلم سے یہ فرما دیں کہ آپ کی پوزیشن آپ کے قصد و ارادے سے نہیں بنی ہے۔ میں اس کو صدق دل سے مان لوں گا اور انشاء اللہ اس کے متعلق شبہ تک میرے دل میں باقی نہ رہے گا۔

۳۔ کوٹ شیر سنگھ کے اجلاس شوریٰ میں میری افتتاحی تقریر کے متعلق آپ کا تصور یہ ہے کہ یہ کوئی بلی تھی جو بہت دنوں سے تھیلے میں چھپی ہوئی تھی اور اس روز مناسب موقع دیکھ کر تھیلے سے باہر آ گئی ہے۔ اپنے پرانے دوست پر آپ کی یہ بڑی نوازش ہے کہ آپ اس کے متعلق اتنے بلند اور پاکیزہ خیالات رکھتے ہیں۔ ان خیالات سے واقف ہو جانے کے بعد میرے لیے یہ امید کرنا مشکل ہے کہ آپ کبھی میرے کسی قول کو اچھے مفہوم میں بھی لیں گے۔ تاہم میرا اخلاقی فرض یہ ہے کہ میں اپنا ما فی الضمیر صحیح صحیح بیان کر دوں۔ درحقیقت میرے پاس کبھی کوئی بلی نہ تھی جسے تھیلے میں چھپا کر رکھنے کی ضرورت مجھے محسوس ہوتی ہو اور اگر کوئی بلی تھی تو اگست ۱۹۴۱ء میں جس روز پہلی مرتبہ جماعت بنی تھی اور کسی امیر کا انتخاب ہوا بھی نہ تھا اسی وقت میں نے اسے تھیلے سے نکال کر سب کے سامنے رکھ دیا تھا۔ آپ روداد اجتماع اول ملاحظہ فرما لیں۔ تشکیل جماعت کے بعد سب سے پہلی تقریر جو میں نے کی تھی' اس میں جماعتی زندگی کے اصول بیان کرتے ہوئے میں نے عرض کیا تھا:-

''اسلامی جماعت میں امیر کی حیثیت وہ نہیں ہے جو مغربی جمہوریتوں میں صدر کی ہوئی ہے۔ مغربی جمہوریتوں میں جو شخص صدر منتخب کیا جاتا ہے اس میں تمام صفات تلاش کی جاتی ہیں مگر کوئی صفت اگر نہیں تلاش کی جاتی تو وہ دیانت اور خوفِ خدا کی صفت ہے' بلکہ وہاں کا طریقہ انتخاب ہی ایسا ہے کہ جو شخص ان میں سب سے زیادہ عیار اور سب سے بڑھ کر جوڑ توڑ کے فن میں ماہر اور جائز و ناجائز ہر قسم کی تدابیر سے کام لینے میں طاق ہوتا ہے وہی برسر اقتدار آتا ہے۔ اس لیے فطری بات ہے کہ وہ لوگ خود اپنے منتخب کردہ صدر پر اعتماد نہیں کر سکتے۔ وہ ہمیشہ اس کی بے ایمانی سے

غیر مامون رہتے ہیں اور اپنے دستور میں طرح طرح کی پابندیاں اور رکاوٹیں عائد کر دیتے ہیں تاکہ وہ حد سے زیادہ اقتدار حاصل کر کے مستند فرمانروا نہ بن جائے۔ مگر اسلامی جماعت کا طریقہ یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے صاحب امر کے انتخاب میں تقویٰ اور دیانت ہی کو تلاش کرتی ہے اور اس بنا پر وہ اپنے معاملات پورے اعتماد کے ساتھ اس کے سپرد کرتی ہے۔ لہٰذا مغربی طرز کی جمہوری جماعتوں کی تقلید کرتے ہوئے اپنے دستور میں اپنے امیر پر وہ پابندیاں عائد کرنے کی کوشش نہ کیجئے جو وہاں صدر پر عائد کی جاتی ہیں۔ اگر آپ کسی کو خداترس اور متدین پا کر اسے امیر بناتے ہیں تو اس پر اعتماد کیجئے اور اگر آپ کے نزدیک کسی کی خداترسی و دیانت اس قدر مشتبہ ہو کر آپ اس پر اعتماد نہیں کر سکتے تو اس کو سرے سے منتخب ہی نہ کیجئے''۔

میں پھر اس بات کا اعادہ کرتا ہوں کہ یہ تقریر میں نے اس وقت کی تھی جب کسی امیر کا انتخاب نہ ہوا تھا' یہ سوال ابھی در پیش تھا کہ کس شخص کو امیر بنایا جائے اور اس امر کا پورا امکان تھا کہ میری جگہ کوئی اور آدمی جماعت کا امیر منتخب ہوتا۔ اس لیے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں نے یہ بات اپنے اختیارات کی خاطر کہی تھی۔ دراصل میری یہ رائے ہمیشہ سے تھی اور آج بھی ہے خواہ امیر جماعت مَیں ہوں یا آپ ہوں یا کوئی اور۔ میں یہ ہی سمجھتا ہوں کہ اسلامی تحریک کو چلانے والی جماعت' جس کی اساس خداترسی و دیانت پر رکھی گئی ہو' اس میں امیر جماعت کے ہاتھ اس طرح باندھنے کی کوشش کرنا جس طرح مغربی طرز کے جمہوری نظام میں باندھے جاتے ہیں' صحیح نہیں ہے۔ خصوصاً جس تحریک کو جاہلیت سے مغلوب ماحول میں قدم قدم پر لڑ کر اپنا راستہ نکالنا ہو وہ اگر ایک شخص کو اپنا لیڈر بھی بنائے اور ادھر یہ چاہے کہ وہ ایک انجمن کے صدر یا ایک ڈسٹرکٹ بورڈ کے پریذیڈنٹ یا ایک میونسپلٹی کے ایگزیکٹیو آفیسر کی طرح کام کرے' تو میرے نزدیک یہ حماقت کے سوا کچھ نہیں ہے بلکہ یہ تو جمہوریت کا ایسا ہیضہ ہے جس سے خود مغربی طرز کی جمہوریتیں بھی پرہیز کرتی ہیں۔ حالت جنگ میں برطانیہ جیسے سخت جمہوری المزاج ملک نے چرچل کو جو اختیارات دے رکھے تھے وہ آپ کے سامنے ہیں۔

میری اس رائے کو آپ چاہیں تو غلط کہہ سکتے ہیں' اس کے خلاف دلائل دینے کی آپ کو پوری آزادی ہے' حتیٰ کہ آپ کو یہ بھی اختیار ہے کہ اس کو جو بدتر سے بدتر معنی چاہیں پہنائیں۔ مگر آپ یہ الزام مجھ پر نہیں لگا سکتے کہ ایک بدنیتی کی بلی مدتوں سے مجرم ضمیر کے تھیلے میں چھپائے پھرتا رہا تھا۔ اور پہلی مرتبہ اسے موقع تاک کر کوٹ شیر سنگھ میں باہر نکال لایا۔ میں اس رائے کو حق سمجھتا ہوں' ہمیشہ اس کو ظاہر کیا ہے اور تشکیل جماعت کے بعد سے آج تک اس پر عملاً کام کرتا رہا ہوں۔ آپ کو پورا حق ہے کہ اسے غلط ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ اس کی وجہ سے جماعت کو چھونے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ جماعت میں رہتے ہوئے آپ مجلس شوریٰ کے ذہن کو اس سے مختلف جس رائے کے حق میں بھی ہموار کرنا چاہیں پوری آزادی کے ساتھ کر سکتے ہیں۔

یہ میری گزارشات تو ان میں اہم ترین امور کے متعلق ہیں جو آپ میرے ساتھ اپنی گفتگو میں زیر بحث لائے تھے۔ باقی جو دوسرے امور ایسے ہیں جن پر آپ کو اعتراض یا شکایت ہو، اور جن کی تلافی آپ کے نزدیک ضروری ہو، آپ انہیں ایک دو تین چار کر کے مجھے لکھ دیں' یا کسی وقت زبانی ارشاد فرمائیں۔ ان کی میرے نزدیک کوئی بنیادی اہمیت نہیں ہے۔ اس لیے میں ان میں آپ کی رضامندی کو اپنی مرضی پر مقدم رکھوں گا اور بلا تأمل آپ کی ہر بات قبول کروں گا۔

خاکسار

(دستخط) ابوالاعلیٰ

مولانا امین احسن اصلاحی کی جانب سے جوابی مراسلہ

مکرمی جناب مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ کی چھٹی مورخہ ۱۶رجنوری موصول ہوئی۔ اس میں کوئی نئی بات ایسی نہیں ہے جو میرے لیے قابل غو ہو۔ ان باتوں کا جواب میں بار ہا دے چکا ہوں۔ تاہم مختصراً پھر عرض کیے دیتا ہوں۔

(۱): میں مجلس شوریٰ کے وجود سے واقف ہوں' اس بات سے بھی مجھے انکار نہیں کہ وہ جماعت کے منتخب نمائندوں پر مشتمل ہے' میں اپنی نسبت یہ گمان بھی رکھتا ہوں کہ میں دلیل سے بات کرسکتا ہوں لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ اگر میں نے دلیل کے ساتھ بات کی اور اور کچھ لوگ میری بات کے قائل ہو گئے' تو آپ مجھے سازش' جتھہ بندی' بلاک سازی اور شوریٰ کے اندر حزب اختلاف کی تخلیق کے الزامات دھر کے مجھے شوریٰ سے نکال باہر نہیں کریں گے۔ میں اس کی ضمانت تو دے سکتا ہوں کہ میں دلیل سے بات کروں گا لیکن اس کی ضمانت کس طرح دے سکتا ہوں کہ میری دلیل آپ کی دلیل کے خلاف نہیں جائے گی یا وہ دلیل آپ کے نقطۂ نظر سے کسی مختلف نقطۂ نظر کا ارکانِ شوریٰ کو قائل نہ کر سکے گی۔ میں ارکانِ شوریٰ کے خلاف یہ بدگمانی نہیں رکھتا کہ وہ میرے خلاف کسی تعصب میں مبتلا ہیں۔ لیکن آپ نے ان کے لے آزادانہ غور کرنے کی کوئی راہ کھلی کب چھوڑی ہے؟ وہ ایک ایسے شخص کی بات کس طرح سنیں گے جس کی قائم کی ہوئی ''حزب اختلاف'' کی سرکوبی سے آپ ابھی اچھی طرح فارغ بھی نہیں ہوئے۔ فرض کیجئے کہ میں آپ کی خواہش کے مطابق یہ قسم بھی کھالوں کہ ماضی کی حزب اخلاف سے میرا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ اور یہ عہد بھی کرلوں کہ آئندہ میں کبھی بلاک سازی نہیں کروں گا تو اس سے آپ کو یا شوریٰ کو اطمینان کس طرح ہوگا کہ اب میرے اندر سے بلاک سازی اور لیڈری کے جراثیم نکل چکے ہیں اور اب میرے ارد گرد جمع ہو جانے یا میری کسی رائے کو قبول کر لینے میں شوریٰ کے ارکان کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ان خطرات کے ہوتے ہوئے کس کی شامت آئی ہوئی ہے کہ میرے ''بلاک''

میں شامل ہو کر اپنا حشر وہ کرائے جو جائزہ کمیٹی کے ارکان اور دوسرے بہت سے لوگوں کا ہوا۔

(۲): جائزہ کمیٹی کے ارکان سے معافی مانگنے کے بارے میں آپ جو کچھ کہتے ہیں معاف کیجیے گا اس سے آپ نے اپنے آپ کو ایک سخت ناگوار پوزیشن میں ڈال دیا ہے۔ آپ کا موقف اگر یہ ہے کہ آپ نے ان کے ساتھ جو کچھ کیا وہ مبنی بر انصاف اور مبنی بر دستور ہے تو پھر آپ معافی کس بات کی مانگتے ہیں۔ ایک جج ایک شخص کو قانون اور عدل کے تقاضوں کے مطابق سزا دیتا ہے تو اس سے مجرم اور اسکے ورثہ کو تکلیف تو ہو گی ہی، مگر وہ معافی کیوں مانگے؟ اور اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ سے اس معاملہ میں غلطی ہوئی ہے تو پھر صاف صاف کہیے کہ بھائیو، معاف کرو، مجھ سے اس معاملہ میں سخت غلطی ہو گئی۔ ان دو واضح روشوں میں سے کسی ایک روش کو صاف صاف اختیار کرنے کی بجائے میں دیکھ رہا ہوں کہ اس معاملہ میں آپ نے ایک تیسری روش اختیار کر رکھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایک طرف تو آپ بڑے طنطنہ کے ساتھ یہ فرماتے ہیں کہ میں نے جو کچھ کیا وہ دستور اور عدل کے عین مطابق ہے لیکن دوسری طرف یہ بھی فرماتے جاتے ہیں کہ میں جائزہ کمیٹی کے ارکان سے معافی مانگ چکا ہوں اور ہزار بار معافی مانگنے کے لیے تیار ہوں۔

میرے نزدیک آپ نے یہ روش اس وجہ سے اختیار کی ہے کہ آپ اس بات کے لیے تو تیار نہیں ہیں کہ اپنی غلطی کا اقرار کریں کیونکہ اس سے شانِ امارت مجروح ہوتی ہے لیکن دوسری طرف آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ آپ کے سوا ہر انصاف پسند آپ کے اس اقدام کو ناجائز ٹھہرا رہا ہے۔ اپنی شانِ امارت کی سرفرازی کے لیے تو آپ یہ فرما دیتے ہیں کہ میں نے جو کچھ کیا عدل، مصلحت اور دستور کا تقاضا وہی تھا لیکن جب خیال آتا ہے اس بات کا کہ دنیا میں سب اندھے بہرے ہی نہیں ہیں تو ان کی گرفت سے بچنے کے لیے معافی اور اس اقدام کی واپسی کا بھی حوالہ دے دیتے ہیں۔ اخلاقی جرأت کی کمی آدمی کو بسا اوقات اس طرح کی ناگوار پوزیشن میں ڈال دیتی ہے۔

آپ کہیں گے کہ میں نے آپ کی ایک اچھی بات میں سے برے معنی نکال لیے ہیں

لیکن میں کروں کیا؟ یہ بات ہی ایسی ہے کہ اس کے اندر سے کوئی اچھے معنی نکالے ہی نہیں جا سکتے۔

اپنے اس اقدام کو جائز ثابت کرنے کے لیے آپ نے دھڑے بندی، بلاک سازی اور سازش وغیرہ کا جو افسانہ اپنے اس مکتوب میں پیش کیا ہے میں کہتا ہوں کہ آپ کے ذہن کے سوا اس کا کہیں وجود نہیں تھا۔ آپ کے ذہن پر شروع سے میری طرف سے جو ایک خطرہ مسلط ہے اس کے سبب سے آپ کو اکثر ڈراؤنے خواب نظر آتے رہتے تھے۔ اسی طرح کا ایک ڈراؤنا خواب آپ نے دسمبر ۵۶ء میں دیکھا اور پھر اس کے تحت آپ نے یہ کارنامہ سرانجام دے ڈالا۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ ابھی آپ امیر جماعت اسلامی ہی تھے کہیں خدا نخواستہ امیر المؤمنین بن چکے ہوتے تو خدا ہی جانے کہ اس حالت میں آپ حزب اختلاف اور اس کے لیڈر کی کیا گت بناتے؟

آپ اس کارنامہ کی مصلحتیں مجھے سمجھانے کی بجائے بہتر ہے کہ اب معاملہ کو مستقبل کے مؤرخ کے حوالہ کیجیے۔ اس کے سامنے ہم سے زیادہ واضح نتائج ہوں گے اور وہ زیادہ بہتر طریقہ پر فیصلہ کر سکے گا کہ آپ نے جو کچھ کیا اس سے کیا برکتیں ظہور میں آئیں۔ مجھے اپنی سیاسی بصیرت پر اتنا اعتماد نہیں ہے کہ کوئی بات آپ کی طرح دعوے کے ساتھ کہہ سکوں لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ آپ کے سوا شاید ہی کوئی ایسا بدقسمت لیڈر ہو جس نے ایک معمولی CRISIS سے عہدہ برآ ہونے میں وہ بے بصیرتی دکھائی ہو جو آپ نے دکھائی۔ آپ نے میری لیڈری کے موہوم خطرہ سے لڑنے میں برسوں کے اُس کیے کرائے پر پانی پھیر دیا جس میں آپ کی طرح دوسروں کی محنتوں کا بھی بہت کچھ حصہ تھا۔

آپ نے اس اقدام کی دستوری حیثیت کا فیصلہ کرانے کے لیے اپنی جس پیش کش کا حوالہ دیا ہے اس کا ذکر ظفر احمد انصاری صاحب نے مجھ سے کیا تھا میں نے اُن سے عرض کیا کہ تصفیہ صرف اس بات کا نہیں ہونا چاہیے کہ امیر کو شوریٰ کے ارکان کو اس طرح کا نوٹس دینے کا حق ہے یا نہیں بلکہ ان الزامات و اتہامات کا بھی ہونا چاہیے جو جائزہ کمیٹی کے ''شریف'' ارکان پر لگائے گئے ہیں۔ مگر معلوم ہوا کہ آپ اس چیز کو کسی عدالت کے سامنے

لانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

پھر ماہرین دستور سے فیصلہ حاصل کرنے کا طریقہ بھی آپ نے خود معین فرما دیا تھا وہ یہ کہ آپ نے اپنے زعم کے مطابق ایک استفتاء مرتب کر دیا تھا اور اس پر کسی ماہر دستور کا فتویٰ حاصل کرنا چاہا تھا۔ یہ شکل نہیں تھی کہ کسی ماہر دستور کی عدالت میں جماعت کا پورا دستور پیش ہوتا' اس کے سامنے فریقین کے نقطہ ہائے نظر رکھے جاتے اور پھر وہ اپنا فیصلہ دیتا۔ ایسی احمقانہ شکل کو کون مان سکتا ہے؟ فتویٰ تو صورت مسئلہ کو سامنے رکھ کر دیا جاتا ہے اگر آپ مسئلہ کی شکل اپنے رنگ میں رکھ دیتے تو اپنے منشاء کے مطابق جواب حاصل کر لیتے' دوسرا دوسری شکل پیش کر کے اپنے مطلب کے مطابق جواب حاصل کر لیتا۔ چنانچہ آپ نے جو استفتاء مرتب کیا تھا وہ میں نے دیکھا تھا اور مجھے آپ کی اس کوشش پر سخت حیرانی ہوئی تھی جو آپ نے اس میں کتمانِ حقیقت کے لیے فرمائی تھی۔

جائزہ کمیٹی کے ارکان پر آپ نے جو الزامات لگائے تھے اب تک آپ ان کے بارے میں اپنے سوا کسی اور سے فیصلہ کرانے پر تیار نہیں ہوئے تھے۔ حد یہ ہے کہ پچھلے دنوں چار آدمیوں کی ایک پنچایت پر راضی ہو چکنے کے بعد نہ صرف یہ کہ اس پنچایت سے آپ مُکر گئے بلکہ آپ اور آپ کے اہل مرکز اب ان غریبوں کو صلواتیں بھی سنانے لگے ہیں حالانکہ وہ مجھ سے زیادہ آپ کے معتمدین میں ہو سکتے ہیں۔ عمر بہاؤالدین امیری سابق سفیر شام نے مجھ سے خواہش کی کہ میں سارے معاملات میں ان کی تحکیم پر راضی ہو جاؤں۔ میں راضی ہو گیا۔ میرے راضی ہو جانے کے بعد ان کا حکم بننے سے گریز کرنا اور محض باہمی مصالحت کی اپیل پر اکتفا کر کے چلے جانا آخر کس کے گریز کا نتیجہ ہو سکتا ہے؟

اب آپ کے اس گرامی نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس معاملہ کا تصفیہ ''بند کمروں'' میں کرانے کے بجائے کھلے میدان میں کرنا چاہتے ہیں اور اس کی شکل آپ یہ تجویز فرماتے ہیں کہ میں (امین احسن اصلاحی) اس بنیاد پر کہ آپ نے جائزہ کمیٹی کے ارکان کے ساتھ نا انصافی کی ہے' شوریٰ کے سامنے عدم اعتماد کی ایک قرارداد لاؤں۔ اگر قرارداد پاس ہو جائے تو میں جیتا آپ ہارے اور اگر ردّ ہو جائے تو میں ہارا اور آپ جیتے۔ اتنے دنوں کے گریز و فرار

کے بعداب آپ کی یہ مبارزت طلبی دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی ہے لیکن افسوس ہے کہ آپ کا یہ تجلد بھی اپنے اندر بہت سی کمزوریاں چھپائے ہوئے ہے اور جو اسباب و وجوہ اس کے محرک ہوئے ہیں ان میں سے بعض کی طرف مجھے اشارہ کرنے کی اجازت دیجیے۔

(۱): اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ جب جائزہ کمیٹی کے ارکان کے ساتھ ناانصافی کا مطالبہ آ کے اوپر عدم اعتماد کے ساتھ اُٹھے گا تو آپ کو معلوم ہے کہ کم از کم موجودہ شوریٰ میں تو ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جو عبدالرحیم اشرف اور عبدالغفار حسن وغیرہ کی خاطر آپ کو قربان کرنے پر تیار ہو' ان میں سے جن کو انصاف عزیز ہو گا وہ بھی اتنے انصاف پسند نہیں ہو سکتے کہ چند مُردوں کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے خود اپنی زندگی خطرہ میں ڈال دیں اور جماعت کے لیے پریشانی پیدا کر دیں۔

(۲): دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ موجودہ شوریٰ تقریباً ان تمام عناصر سے پاک ہو چکی ہے جن کو جائزہ کمیٹی کے ارکان سے' اور وہ بھی ان کے جماعت سے نکل جانے کے بعد' کوئی ہمدردی ہو سکتی ہے۔

(۳): تیسری وجہ یہ ہے کہ آپ موجودہ شوریٰ کو شروع ہی سے ایسی تربیت دے رہے ہیں کہ وہ آپ کی آنکھوں سے دیکھے اور آپ کے کانوں سے سُنے۔ جو لوگ اس سے مختلف مزاج رکھتے ہیں ان کا مستقبل نہ صرف اس شوریٰ میں بلکہ سرے سے جماعت ہی کے اندر میں نہایت تاریک دیکھتا ہوں۔

(۴): چوتھی وجہ یہ ہے کہ جو معاملہ عدالتی نوعیت کا ہے جس میں ٹھنڈے ماحول کی ضرورت ہے جس میں گواہوں اور بیانات کی ضرورت ہو گی اس کو آپ عدم اعتماد کی تحریک کے ساتھ چھپا کر اور پچاس آدمیوں کی ایک بھیڑ کے سامنے رکھ کر نہ صرف خراب کرنا چاہتے ہیں بلکہ مجھے بھی ذلیل کرانا چاہتے ہیں۔

معاف کیجئے گا یہ وجوہ ہیں جو آپ کو جرأت دلا رہے ہیں کہ آپ مجھے شوریٰ میں اپنے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کرنے کے لیے بلا رہے ہیں۔

(۵): آپ نے اپنی ''بلی'' کی تاریخ پیدائش ناحق بیان کرنے کی کوشش فرمائی ہے میں اس

بات سے ناواقف نہیں ہوں کہ یہ بلی آپ کے تھیلے میں روزِ اول سے موجود ہے لیکن آپ کو یاد ہوگا کہ تقسیم سے پہلے آلہ آباد کی شوریٰ کے اجلاس میں، میں نے اس کا گلا دبانے کی کوشش کی۔ یاد نہ ہو تو مذکورہ شوریٰ کی رُوداد پڑھ لیجئے۔ اس وقت تو یہ مر نہ سکی لیکن میں اور جماعت کے دوسرے اہل نظیر برابر اس کی فکر میں رہے اور شوریٰ میں اس کی موت وحیات کا مسئلہ بار بار چھڑتا رہا یہاں تک کہ تقسیم کے بعد ہم نے جو دستور بنایا اس میں اس کی موت کا آخری فیصلہ ہوگیا۔ واضح رہے کہ جب اس کے قتل کا فیصلہ ہوا تھا تو اس وقت شرع شریف، مصلحت زمانہ اور اسلامی جمہوریت سب کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر ہوا تھا۔ اس کی تائید میں علماء کے فیصلے بھی حاصل کیے گئے تھے اور اہل نظیر کی رائیں بھی جمع کی گئیں تھیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ آپ اپنے عمل سے وقتاً فوقتاً اس کو زندہ بھی کرتے رہے لیکن ہمارے دستور نے اس کی زندگی تسلیم نہیں کی۔ اس سلسلہ میں جب کبھی آپ نے دستور کی مخالفت کی تو عموماً آپنے اقدامات میں بے بصیرتی کا ثبوت دیا جس سے جماعت کے اہل الرائے اس بارہ میں یکسو ہو گئے کہ یہ ''بلی'' مردہ ہی رہے تو اچھا ہے۔ لیکن آپ پر اس کی موت بڑی شاق تھی۔ آپ اس کو حیاتِ تازہ بخشنے کے لیے برابر بے چین رہے اسی کے عشق میں آپ نے استعفاء دیا۔ ماچھی گوٹھ میں آپ نے اس کے لیے رازداروں کو خلوت میں بلا کر سازش کی۔ پھر کوٹ شیر سنگھ میں اس پر مسیحائی کا آخری افسوں پڑھا اور یہ واقعی زندہ ہوگئی۔ اب آپ مجھے دعوت دیتے ہیں کہ میں پھر شوریٰ میں آؤں اور اس کے اندر رہ کر اس کو مارنے کی کوشش کروں تو میں اس سے معافی چاہتا ہوں۔ ایک ''بلی'' برسوں کی محنت سے میں نے ماری، آپ نے وہ پھر زندہ کر دی اور اب آپ کی مجلس عاملہ نے اس کی رضاعت و پرورش کی ذمہ داری بھی اٹھالی۔ اب میں پھر اس کے مارنے میں لگوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میں اپنی ساری زندگی اس ''گربہ کُشی'' ہی کی نذر کردوں، آخر یہ کون سا شریفانہ پیشہ ہے۔

میرے نزدیک جماعت اسلامی کے امیر کو شوریٰ کے فیصلوں کا پابند ہونا چاہیے اگرچہ وہ تقویٰ اور تدین کے کتنے ہی اونچے مقام پر ہو۔ اس کو جو آزادی دی جائے وہ ہرگز غیر محدود نہیں ہونا چاہیے۔ میں اس چیز کو اسلام اور جمہوریت دونوں ہی کی مشترک تقاضا سمجھتا

ہوں آپ اگر زمانۂ جنگ کے چرچل کے اسوہ کی پیروی زمانہ امن میں کرنا چاہتے ہیں تو شوق سے کیجئے میں اس آمریت کو اسلامی نظام جماعت کے نام سے پیش کر کے اسلام کو رسوا کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔

آپ نے مجھ پر بلاک سازی، جتھہ سازی، حزبِ اختلاف کی لیڈری، بلیک میلنگ مخالفینِ امیر کی حوصلہ افزائی اور جماعت کی بدخواہی وغیرہ کے جو الزامات لگائے ہیں، میں ان کے لیے کوئی صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ حالات کی اصلاح کے سلسلہ میں میرا جو رول رہا ہے اس کو میں جانتا ہوں میرا رب جانتا ہے اور جماعت کے مخلصین جانتے ہیں۔ آپ اگر مجھے ان الزامات کا مستحق خیال فرماتے ہیں تو میں اس امیر کی طرف سے ان کا خیر مقدم کرتا ہوں جس کو تقویٰ اور تدین کی بنا پر انتخاب کرنے میں، میں نے بھی حصہ لیا ہے اور جو ابھی کل تک خدا کو گواہ بنا بنا کر علی رؤس الاشہاد بھی اور نجی ملاقاتوں میں بھی مجھ پر اپنے کامل اعتماد کا اظہار کرتا رہا ہے۔

اس باب میں میری طرف سے یہ آخری تحریر ہے۔ میں آپ سے بھی ملتجی ہوں کہ اس بارہ میں اب مجھے کچھ نہ لکھیں۔

میں جانتا ہوں کہ آپ کی رفاقت سے محروم ہو کر میں کیا کچھ کھو رہا ہوں لیکن آپ کو بھی یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اگر آپ نے مجھ جیسے خیر خواہ مخلص کے مشوروں کی قدر نہیں کی ہے تو آپ کو "بُرے مشیروں" کے مشورے ماننے پڑیں گے میں دل سے متمنی تھا کہ مجھے آپ کی رفاقت حاصل رہے لیکن آپ نے اپنے دونوں خطوں میں اس کی جو قیمت مانگی ہے میں وہ اداء کرنے سے قاصر ہوں۔

یہ جو کچھ میں نے لکھا ہے آپ کو جماعت اسلامی کے امیر کی حیثیت سے لکھا ہے اس حیثیت سے الگ آپ میرے بڑے بھائی ہیں اور میں انشاء اللہ آپ کی برابر عزت کرتا رہوں گا۔ مجھے امید ہے کہ آپ مجھے اپنی شفقتوں سے محروم نہیں فرمائیں گے۔

والسلام

(دستخط) امین احسن اصلاحی، ۱۸؍جنوری ۵۸ء

نگاہِ بازگشت

اور

حاصل کلام

مؤلف "نقض غزل" کا قولِ فیصل

("تذکرہ وتبصرہ" ماہنامہ 'میثاق' مارچ ۹۰ء)

"نقض غزل" پر ردّ عمل کا جائزہ

("تذکرہ وتبصرہ" ماہنامہ 'میثاق' جون ۹۰ء)

مکتوبِ گرامی جناب نعیم صدیقی اور اس کا جواب

('میثاق' اگست ۹۰ء)

قولِ فصیل

(’تذکرہ وتبصرہ‘ ماہنامہ ’میثاق‘ مارچ ۹۰ء)

اس بات کی اطلاع تو قارئین کرام کو گزشتہ شمارے کے ’عرض احوال‘ کے ذریعے ہو ہی چکی ہے کہ جنوری میں راقم شدید علیل ہو گیا تھا۔ عزیزم عاکف سعید نے علالت کا آغاز جنوری کے دوسرے ہفتے سے تحریر کیا‘ واقعہ یہ ہے کہ تکلیف کا آغاز تو پہلے ہی ہفتے سے ہو گیا تھا‘ شدت دوسرے ہفتے میں شروع ہوئی۔ اور مسلسل دو ہفتے جاری رہی‘ اواخر جنوری میں کراچی کا ایک سفر طے تھا‘ اُس کے پیش نظر راقم نے پوری پابندی کے ساتھ اِس طرح جم کر علاج کرایا کہ اس سے قبل کبھی نہ کرایا تھا۔ اس سے بحمد اللہ کسی قدر افاقہ ہو گیا۔ چنانچہ کراچی کا چار روزہ سفر اختیار کر لیا۔ لیکن اللہ کی شان کہ وہاں جاتے ہی تکلیف بڑھ گئی۔ چنانچہ جیسے تیسے دونوں عوامی پروگرام تو نبھائے‘ لیکن متعدد بزرگوں اور احباب سے ملنے کی خواہش دل ہی میں رہ گئی۔ جس کے لیے اس بار اضافی وقت لے کر گیا تھا‘ صرف شیخ سلطان احمد صاحب اور مولانا محمد طاسین صاحب سے ملاقات کے لیے حاضری دے سکا۔ کراچی سے واپسی کے بعد بھی دو ہفتے پھر شدید تکلیف میں گزرے۔ ہفتہ عشرہ قبل پھر کسی قدر افاقہ کی صورت نظر آئی تو قلم ہاتھ میں لیا----- اور اولاً ’’اجتماعِ ماچھی گوٹھ کی بقیہ رُوداد‘‘ تحریر کر کے ’نقض غزل‘ کی تکمیل کر لی۔ اور اِس سے فارغ ہوتے ہی اِس پورے معاملے پر اپنا ’تبصرہ‘ اور ’تذکرہ‘ ----- یا بالفاظ دیگر ’’محاکمہ‘‘ سپرد قلم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں ----- **اَلسّعیُ مِنّا وَاِلا تمامُ مِنَ اللّٰہ** ----- پر اعتماد اور توکل کے علاوہ اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اپنے خصوصی فضل وکرم سے‘ اس معاملے کی خصوصی اہمیت اور نزاکت کے پیش نظر‘ اپنے اِن احکام پر عمل کرنے کی خاص الخاص توفیق عطا فرمائے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ﴾. (النساء:۱۳۵)

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ط اِعْدِلُوْا قف هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ز وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾. (المائدہ:۸)

===================

'نقض غزل' کی بارِ دگر اشاعت' اور اس کی تکمیل کے عزم پر ہمیں حسب توقع بعض خطوط تہدید و تنبیہ بلکہ عتاب و عناد پر مشتمل بھی موصول ہوئے' اور بعض محبت آمیز گلوں شکوؤں پر مبنی بھی' یہاں تک کہ دسمبر کی ریفریشر کورس والی تربیت گاہ کے موقع پر بعض رفقاء و احباب نے بھی شدید تنقید کی' اور ایک محترم بہن (ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم کی صاحب زادی) نے تو محبت بھرے انداز میں یہ تنبیہ بھی کی کہ ''کیا عجب کہ آپ کی علالت کا اصل سبب یہی ہو!'' ----- بنابریں سب سے پہلے ہم اسی بات کی وضاحت کئے دیتے ہیں کہ اس سے ہماری غرض کیا ہے ----- اور بعض حضرات کے بقول: ''اس سے ہمیں کتنے نفلوں کا ثواب حاصل ہوتا ہے؟''

ہمارے نظریات و افکار سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ ہمارے نزدیک:

(ا): اسلام کے موعودہ عالمی غلبے کے ضمن میں مشیت ایزدی میں ارض پاک و ہند کو خصوصی اہمیت حاصل ہے' یہی وجہ ہے کہ (ا) گزشتہ چار صدیوں کے دوران تجدید دین کا سارا سلسلہ اسی خطے سے متعلق رہا۔ چنانچہ سوائے محمد ابن عبدالوہابؒ کی قدرے یک رخی شخصیت کے حضرت مجدد الف ثانیؒ اور امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ ایسی عظیم شخصیتیں' اور تحریک شہدین جیسی عظیم تحریک جہاد سب اسی خطے میں رونما ہوئیں! (ب) بیسیویں صدی عیسوی کے درمانی حصے میں آزادی کی جو تحریکیں مختلف مسلمان ملکوں میں چلیں' ان میں سے بھی صرف تحریک پاکستان میں اسلامی جذبے کو اپیل کیا گیا۔ چنانچہ پورے کرہ ارضی پر صرف پاکستان ہی ایک ایسا ملک ہے جو اسلام کے نام پر بنا' اور اس کے سوا کوئی اور جڑ بنیاد نہیں

رکھتا۔ (ج) اسی طرح چودھویں ہجری کے مابین جتنے اعاظم رجال اس خطے میں پیدا ہوئے کہیں اور نہیں ہوئے' چنانچہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن' علامہ محمد اقبال' مولانا ابوالکلام آزاد' مولانا محمد الیاس اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (رحمہم اللہ) مقابلے میں بیرون ہند صرف ایک نام لیا جاسکتا ہے ----- یعنی شیخ حسن البنا شہیدؒ کا!

(۲): جملہ دینی مدارس اور اداروں کی خدمات اپنی جگہ' حضرات علماء کرام اور اصحاب علم و فضل کی انفرادی مساعی کی اہمیت بھی مسلم' علماء کی بے شمار جمعیتوں کی گھن گرج اور اثر و نفوذ بھی اپنے مقام پر ----- لیکن ہمارے نزدیک برعظیم پاک و ہند میں اصل احیائی تحریکیں دو ہی ہیں: ایک جماعت تبلیغی' جس میں سارا زور عوامی سطح پر تجدید ایمان اور انفرادی اصلاح پر ہے ----- اور ''فَكُّ كُلِّ نِظَامٍ'' (شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نعرۂ مستانہ) کا نام لینا بھی اس کے نزدیک خلافِ مصلحت ہے ----- اور دوسری تحریک جماعت اسلامی کی ہے' جس کا آغاز عہد حاضر کی صحیح ترین اور جامع ترین تحریک اقامت دین کی حیثیت سے ٹھیٹھ انقلابی رنگ میں ہوا تھا' لیکن جو ''بدقسمتی'' سے پاکستان میں ایک خالص سیاسی جماعت کی صورت اختیار کر گئی (اگرچہ اس ''صحرائے تیہ'' کی چالیس سالہ بادیہ پیمائی سے نہ صرف یہ کہ تا حال اُس کے ہاتھ پلّے کچھ نہیں پڑا بلکہ روز بروز ع ''پر شب کی منتوں نے تو کھو دی رہی سہی!'' کے مصداق عزت و آبرو کا دھیلا ہوتا چلا جا رہا ہے اور اس طرح گویا ''اسلاف کی عزت کے کفن'' بھی سرعام بک رہے ہیں!(۱))

(۳): متذکرہ بالا ''بدقسمتی'' کے اسباب کی صحیح صحیح تعیین تحریک جدید و احیائے دین اور سعی و جہد اقامت دین کے مستقبل کے لیے لازمی و لابدی ہے' تاکہ واضح طور پر متعین کیا جاسکے کہ اس عظم قافلے کو کب ''کہاں'' کیسے اور کیا حادثہ پیش آیا، تاکہ جو غلطی ہوگی ہو اس کا

---

(۱) عرشی بھوپالی کے دلدوز اشعار ہیں

میں نے دیکھا ہے کہ فیشن میں الجھ کر اکثر
تم نے اسلاف کی عزت کے کفن بیچ دیئے
نئی تہذیب کی بے روح بہاروں کے عوض
اپنی تہذیب کے شاداب چمن بیچ دیئے!

تدارک کیا جاسکے، جو کمی رہ گئی ہو اس کی تلافی کی جاسکے، اور جو زیادتی ہوگئی ہو اس سے رجوع کیا جاسکے! ورنہ شدید اندیشہ ہے کہ ایک مبہم سی مایوسی اس قافلے کے بچے کھچے رہ نوردوں پر مسلّط ہو جائے گی، جذبے اور ولولے بالکل سرد پڑ جائیں گے اور کیا عجب کہ اسلام کے مستقبل اور اس کے احیاء کے امکان کے بارے میں ایسی شدید بددلی اور گہری مایوسی پیدا ہو جائے کہ ایک طویل عرصے کے لیے ع ''اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا!'' کا سماں بندھ جائے! جب کہ ہمارے نزدیک شخصیتوں اور تنظیموں سے بالاتر سطح پر اسی ''تحریک'' کے تسلسل کو برقرار رکھنا ہر باشعور مسلمان کے دین وایمان کا بنیادی تقاضا ہے! اور اس سلسلہ میں، بحمد اللہ، ہمیں بعض اہم اور اساسی حقائق کا شعور وادراک بہت پہلے ہو گیا تھا۔ چنانچہ ''امت مسلمہ کا عروج و زوال اور موجودہ احیائی مساعی کا جائزہ'' نامی تحریر میں جو ابتداءً ''میثاق'' بابت اکتوبر نومبر ۱۹۷۴ء میں (گویا تنظیم اسلامی کے باضابطہ قیام سے لگ بھگ چھ ماہ قبل) شائع ہوئی تھی حسب ذیل صراحت موجود ہے:-

> ''اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور ملت اسلامی کی تجدید کا یہ کام دس بیس برس بدرجہ بہت سے مراتب ومراحل سے گزر کر ہی پایۂ تکمیل کو پہنچے گا، لہٰذا اس ارتقائی عمل کا ہر درجہ اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے اور چاہے بعد کے مراحل سے گزر کر پہلوں کا کام بہت حقیر بلکہ کسی قدر غلط بھی نظر آئے اپنے اپنے دَور کے اعتبار سے اس کی اہمیت و وقعت سے بالکلیہ انکار ممکن نہیں۔ تیسرے یہ کہ اس ہمہ گیر تجدیدی جدوجہد میں اگرچہ افراد کی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے تاہم جماعتوں اور تنظیموں کے مقابلے میں کم تر ہے۔ پھر جماعتیں بھی تحریکوں کی وسعت میں گم ہو جاتی ہیں اور بالآخر تمام تحریکیں بھی اُس وسیع احیائی عمل کی پہنائیوں میں گم ہو جاتی ہیں جو ان سب کو محیط ہے''۔

ہمیں خوب اندازہ ہے کہ ہماری یہ بات آسانی سے سمجھ میں آنے والی نہیں ہے کہ تحریک اسلامی کے مستقبل کے لیے سابقہ غلطیوں کی صحیح صحیح اور بلا کم و کاست نشاندہی ضروری اور ناگزیر ہے لہٰذا اس کی مزید وضاحت کے لیے ہم ایک مثال کا سہارا لے رہے ہیں:

آپ ذرا ایک ایسی بہت بڑی مشین کا تصور کیجئے جس کے صرف دو چھوٹے چھوٹے پرزے خراب ہو گئے ہوں، دو کا عدد ہم نے جان بوجھ کر استعمال کیا ہے، ورنہ ہماری تمثیل کے لیے تو ایک پرزے کا ذکر بھی کفایت کرتا ہے۔ اس لیے کہ صرف ایک چھوٹے سے پرزے ہی کی خرابی سے کروڑوں روپے کی پوری مشین کھڑی ہو جائے گی، اور اگر اس پرزے کی صحیح صحیح نشاندہی کر کے اُسے درست یا تبدیل نہ کر دیا جائے تو یا تو پوری مشین کباڑ خانے میں جائے گی یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اُس کے مختلف اجزاء کسی دوسری جگہ اضافی پرزوں (Spare Parts) کی حیثیت سے استعمال ہوں گے! بالکل یہی معاملہ ایک تحریک کا ہوتا ہے کہ اس میں جہاں اور جو غلطی ہوگئی ہو اس کی صحیح صحیح تشخیص نہ ہو سکے تو ہو سکتا ہے کہ تحریک کی ناکامی کے باعث اس کے کارکن اور وابستگان اس کے جملہ تصورات و نظریات اور کُل صغریٰ کبریٰ ہی کو غلط سمجھ بیٹھیں اور تحریک کا سارا کیا دھرا اکارت چلا جائے (ملاحظہ ہوں فیضؔ کے اشعار مشمولہ 'نقض غزل' صفحہ ۸۵) اور پھر کوئی نیا آغاز ع ''ہر کہ آمد عمارت نو ساخت'' کے مصداق بالکل ہی نئے سرے سے کرنا پڑے۔ اور ''لَتَرْکَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ'' کی ارتقائی صورت پیدا نہ ہو سکے!

کاش کہ ہمارے دوست احباب، اور سابقہ و حالیہ رفقاء اور بزرگ اس بات کو سمجھ لیں کہ مولانا مودودی مرحوم یا جماعت اسلامی کے ماضی و حال کے بارے میں کچھ لکھنے کا سبب ع ''چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ'' کے نوع کی تفریح طبع نہیں ے بلکہ ہمارے متذکرہ بالا احساس کی شدت ہے!

غالبؔ کے اس شعر کے مصداق کہ

عرض کیجئے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل اُٹھا!

یہ اسی شدت احساس کا کرشمہ تھا کہ مجھ ایسے تصنیف و تالیف سے نابلد محض شخص کے قلم سے کُل ساڑھے چوبیس برس کی عمر میں سوا دو سو سے زائد صفحات پر مشتمل بیان ''صادر'' ہو گیا'

جس پر جو دوسری سندیں مجھے ملیں اُن سے قطع نظر' سب سے بڑا اخراج تحسین یکے از اکابرین جماعت' جناب سید اسعد گیلانی صاحب کے ان الفاظ کی صورت میں ملا جو موصوف نے اب سے سات آٹھ سال قبل رفیق مکرم قاضی عبد القادر صاحب (کراچی) سے کہے تھے کہ: ''میں یہ مان ہی نہیں سکتا کہ یہ بیان ڈاکٹر صاحب کا اپنا تحریر کردہ تھا' یہ تو اصل میں مولانا اصلاحی کا لکھا ہوا تھا جسے اُس وقت مصلحتاً ڈاکٹر صاحب سے منسوب کیا گیا!'' اس جملے سے موصوف کی اپنی جس ذہنی اور مزاجی کیفیت کا سراغ ملتا ہے' اُس سے قطع نظر گیلانی صاحب جیسے کہنہ مشق ادیب اور بیسیوں کتابوں کے مصنف شخص کی جانب سے یہ بلا شبہ 'ہجو ملیح' کے برعکس ''مدح کریہہ'' کی صورت میں ایک بہت بڑا Compliment ہے!

اس بیان کے ''شانِ صدور'' کے ضمن میں یہ واقعاتی حقائق بھی پیش نظر رہیں تو اچھا ہے کہ راقم جب ۳۰ ستمبر ۵۶ء کو اوکاڑہ میں جائزہ کمیٹی سے ملاقات یا اس کے سامنے ''پیشی'' کے لیے حاضر ہوا تو بالکل خالی ہاتھ تھا۔ اگرچہ ذہن میں خیالات کا لاوا بُری طرح پک رہا تھا۔ میں نے اپنے دوسرے ساتھیوں (سید شیر محمد شاہ اور نور محمد قریشی وغیرہما) کو پہلے اندر بھیج دیا اور خود جس کمرے میں ملاقات ہو رہی تھی اُس کے باہر برآمدے میں بیٹھ کر اپنی گفتگو کے لیے خاکہ (Synopsis) مرتب کیا۔ حسن اتفاق سے آج ہی اپنے فائل کو دیکھا تو اس میں اُن Notes کو محفوظ دیکھ کر میں خود بھی متحیر ہو گیا جو میں نے اُس وقت تیار کئے تھے۔ اس کے بعد جب کمیٹی سے ملاقات ہوئی اور میں نے اپنے خیالات شرح و بسط سے پیش کئے تو ان حضرات کی جانب سے یہ سرسری سی فرمائش ہوئی کہ: ''کیا آپ اپنے ان خیالات کو قلمبند نہیں کر سکتے؟'' جس پر میں نے جواب دیا: ''کوشش کروں گا' لیکن ہے بہت مشکل!'' اس کے ٹھیک ستر دن بعد ۱۷/۱۱ اکتوبر کو جب راقم نے لاہور میں اپنے بیان کا مسودہ شیخ سلطان احمد صاحب کے ہاتھ میں تھمایا تو انہوں نے نہایت تحیر کے عالم میں سوالیہ انداز میں خراجِ تحسین پیش فرمایا کہ: ''کیا واقعتاً آپ نے یہ ان ہی دنوں میں لکھا ہے؟''

پھر میرے ساتھ وہ معاملہ کرنے کی بجائے کہ ؏ ''وز درونِ من نہ جست اسرارِ

من!'' خدارا ان حقائق پر بھی غور کیا جائے کہ:

(۱): جماعت سے علیحدہ ہو کر نہ میں نے کوئی بیان دیا' نہ پریس کانفرنس کی' نہ ہی اس بیان کو شائع کیا۔ حالانکہ ایک جانب میرے پاس پیسوں کی اتنی تنگی تو کبھی بھی نہ تھی کہ یہ کتاب نہ چھپوا سکتا۔ ۶۲ء تا ۶۵ء بھائیوں کے ساتھ کاروباری شراکت کے دَور میں تو میں بحمد اللہ گویا دولت میں کھیل رہا تھا! اور دوسری جانب اس نوعمری میں ''صاحبِ تصنیف'' بننے کا شوق بھی دل میں گدگدی پیدا کر سکتا تھا ان سب کے باوصف میں نے اس کی اشاعت کو اُس وقت تک مؤخر کیے رکھا جب تک یہ حتمی فیصلہ نہ کر لیا کہ اب اپنے بل بوتے ہی پر کام کا آغاز کر دینا ہے اور اسی فیصلہ کے تحت لاہور نقل مکانی کی! اس لیے کہ میرے نزدیک کسی جدید تعمیر کے لیے تو ناگزیر ''تخریب'' کا جواز رومیؔ کے اس شعر کے مصداق موجود ہے کہ ؎

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کا باداں کنند

می نہ دانی اول آں بنیاد را ویراں کنند!

لیکن تخریب محض یا تخریب برائے تخریب کو میں ہرگز جائز نہیں سمجھتا! اس ضمن میں مولانا محمد منظور نعمانی کے ایک خط کے اقتباس کا عکس دیا جا رہا ہے' جو 'میثاق' کی اشاعت بابت نومبر ۶۶ء کے کور کے اندرونی جانب ٹائپ میں شائع ہوا تھا' اس کا آخری فقرہ لائق توجہ ہے:

> ''...... ڈاکٹر صاحب کی کتاب میں نے بھی پڑھی' میرا خیال یہ ہے کہ جو کچھ بعد میں سامنے آیا اس کی پوری بنیاد آغاز ہی میں موجود تھی لیکن ہم اس کو اپنے ذہن کے مطابق سمجھتے اور ڈھالتے تھے' اسلام کی سربلندی کا نصب العین زیادہ چھان پھٹک اور کھود کرید کرنے نہیں دیتا تھا۔ اس کے باوجود کتاب بہت خوب ہے اور ۸-۱۰ سال تک اس کو روکے رکھنے کا ان کا عمل تو بہت ہی قابل داد اور لائق سبق آموزی ہے۔''
>
> (مولانا) محمد منظور نعمانی
>
> مدیر مسئول ماہنامہ ''الفرقان'' لکھنؤ

(۲): ۷۲-۱۹۷۱ء میں رفیق مکرم شیخ اجمل الرحمٰن صاحب سے ربط ضبط قائم ہوا تو معلوم ہوا کہ انہوں نے بڑی تحقیق و تفتیش اور عرق ریزی و جاں فشانی سے کام لے کر ایک پوری کتاب کا مواد اکٹھا کر لیا ہے جس سے جماعت اسلامی کے فکر و عمل اور قول و فعل کا تضاد واقعات کے

آئینے میں نمایاں ہوکر سامنے آ جائے' لیکن میں نے ہرگز اُس کی اشاعت کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ اس لیے کہ میرا پختہ خیال ہے کہ بات اصولی طور پر سامنے آنی چاہیے' اگر لوگ اسے نہیں مانتے تو خواہ کتنا ہی واقعاتی استشہاد کرلیا جائے اسے بھی ہرگز نہیں مانیں گے! چنانچہ شیخ صاحب کی ساری محنت اکارت گئی اور جب اس کی اشاعت کا سوال ہی باقی نہ رہا تو عدم توجہی کے باعث پورا مسودہ ہی گم ہوگیا!

(۳): راقم کے مزاج اور افتاد کی سب سے نمایاں مثال یہ ہے کہ ۷۶-۷۵ء کے لگ بھگ جب مولانا سید وصی مظہر ندوی کا جماعت سے اخراج عمل میں آیا' تو انہوں نے بھی جماعت کے خلاف ایک پوری کتاب کا مسودہ تیار کرلیا جو اشاعت کے لیے پریس جانے ہی والا تھا کہ بات میرے علم میں آ گئی۔ اس پر میں نے اُن سے عرض کیا کہ: ''مولانا اگر تو آپ نے عزم فرما لیا ہے کہ اب خود داعی کی حیثیت سے سامنے آ کر انے طور پر تحریک کا آغاز کر دینا ہے تو بسم اللہ اس کتاب کو ضرور شائع فرمائیں اور اگر ایسا نہیں ہے بلکہ مخالفت محض برائے مخالفت مقصود ہے تو میں اس کی اشاعت کو جائز نہیں سمجھتا!'' (واضح رہے کہ اس فقرے کے دوسرے الفاظ میں تو کمی بیشی یا تقدیم وتاخیر کا امکان موجود ہے' لفظ جائز مجھے قطعی اور حتمی طور پر یاد ہے!) یہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور مولانا کی طبعیت کی سلامتی کا مظہر ہے کہ انہوں نے راقم کی بات مان لی' اور کتاب کی اشاعت کا ارادہ ترک کر دیا! ؏ ''پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں؟''

الغرض اپنی جملہ تحریروں اور کاوشوں سے راقم کا اصل مقصد تحریکِ تجدید واحیاءِ اسلام اور سعی دعوت واقامت دین کے تسلسل کا برقرار رکھنا ہے، ورنہ ہمیں نہ پہلے مولانا مودودی مرحوم سے کوئی ذاتی عداوت یا پرخاش تھی نہ اب جماعت اسلامی سے کوئی دشمنی یا عناد ہے' بلکہ جیسا کہ 'نقض غزل' میں بیان ہوا مولانا نے تو عین ماچھی گوٹھ میں اور وہ بھی اس وقت جب کہ میں تین گھنٹے تک جماعت اسلامی کی پالیسی پر جرح وتنقید کے بعد سٹیج سے اترا ہی تھا مجھ سے بالمشافہ فرمایا تھا: ''آپ کو معلوم ہے کہ مجھے آپ سے کتنی محبت ہے؟'' پھر میرے

جماعت سے علیحدہ ہونے کے بعد ایک بار جب مولانا منٹگمری آئے اور وہاں آزاد میڈیسن کمپنی کے مالک عبدالرحمٰن آزاد کے مکان پر مقیم تھے تو میرے بارے میں استفسار کرنے والے لوگوں سے مولانا نے فرمایا تھا: ''مجھے تو وہ اپنے بیٹوں سے بھی بڑھ کر عزیز رہا ہے!'' یہاں تک کہ ۷۶-۷۵ء کے آس پاس بھی جب بعض اسباب سے ہمارے مابین کشدگی عروج پر تھی مولانا نے میرے بارے میں فرمایا: ''اس شخص کے بارے میں مجھے یہ اطمینان ہے کہ وہ جہاں بھی رہے گا دین کا کام کرتا رہے گا!'' (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو میری تالیف ''اسلام اور پاکستان'' کا دیباچہ)

رہی جماعت اسلامی، تو ہر شخص جانتا ہے کہ ہم نے اگر اپنی نوجوانی کے دس قیمتی سال

ع

یہ اور بات کہ تم پر نثار کر دی ہے
عزیز اپنی جوانی کسے نہیں ہوتی!

کے مصداق اس کے ساتھ براہِ راست تنظیمی ربط کی صورت میں نذر کیے، تو اس سے علیحدگی کے بعد سے اس ساعت تک ثلث صدی کے طویل عرصے کے دوران بھی ہمیں کبھی ایک لمحے تک کے لیے بھی اس کے مقصد اور نصب العین سے اختلاف نہیں ہوا، اور ہم نے اپنی صوابدید کے مطابق اپنی عمر عزیز کا ایک ایک لمحہ، اور اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کا ایک ایک شمّہ اسی کی نذر کیا ہے! اور اسی کی قبولیت پر اپنی نجات کا دارومدار سمجھتے ہیں!

ہاں دو فکری 'بے اعتدالیاں' ہمیں اس تحریک کے اساسی نظریات میں نظر آئیں، جن میں سے ایک پر ہم نے کسی قدر مفصل کلام کیا، اور دوسری کی اجمالی نشاندہی کی، اور اسی طرح دو ہی (۱)عملی غلطیوں کا انکشاف ہم پر ہوا،

اگرچہ وہ دونوں اتنی اساسی اور گمبھیر اور دُور رس نتائج کی حامل تھیں کہ ایک نے اس کے رُخ ہی کو یکسر تبدیل کر دیا، تو دوسری نے اس کی چوٹی کی قیادت میں باہمی عدمِ اعتماد اور سوءِ ظن اور اس سے آگے بڑھ کر نفرت و حقارت کے بیج بو دیئے۔ ان میں سے پہلی کی تشخیص و تعیین

حاشیہ (۱): اسی مناسبت سے ہم نے مشین والی مثال میں دو پرزوں کی خرابی کا ذکر کیا تھا!

کے لیے ہم نے متذکرہ بالا طویل بیان تحریر کیا تھا جواب ''تحریک جماعت اسلامی، ایک تحقیقی مطالعہ'' کے نام سے طبع شدہ موجود ہے' اور دوسری کی تعیین وتبیین کے لیے 'نقض غزل' لازمی ولابدی ہے۔

جہاں تک جماعت کے تأسیسی افکار ونظریات کی ''بے اعتدالیوں'' کا تعلق ہے' اُن میں سے ایک وہ ہے جس کا تذکرہ ہم نے اجمالاً ۱۹۶۶ء میں ''تحریک جماعت اسلامی'' کی اشاعت کے موقع پر اس کے دیباچے میں ان الفاظ میں کیا تھا: (صفحہ ۱۸)

> ''مولانا مودودی صاحب بیک وقت داعی دین بھی ہیں اور متکلم اسلام بھی اور ان کی دعوت کی رگ وپے میں فطری طور پر ان کے کلامی نظریات سرایت کیے ہوئے ہیں۔ اب ظاہر بات ہے کہ مولانا مودودی اس دور کے متکلم ہیں جب کہ دنیا مختلف ''نظام ہائے حیات'' کے نظری وفکری ادوار سے گزر کر عملی زندگی کی نہج قرار پانے اور پھر ان کے باہمی تصادم کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے۔ اس تاریخی پس منظر میں مولانا مودودی صاحب نے اسلام کا مطالعہ کیا تو وہ انہیں ایک ''بہترین نظام حیات'' اور ''انسانی زندگی کے تمام مسائل کا بہترین حل'' نظر آیا۔ چنانچہ یہی ان کی دینی فکر کا مرکزی نقطہ بن گیا جس کے یمین و یسار انہیں اسلام کے عقائد، اس کی عبادات اور اس کی شریعت کے تفصیلی احکام صف بستہ نظر آئے، اور اس طرح انہیں دین کا اصل مطالبہ یہ نظر آیا کہ اس نظام کلی کو نظامِ زندگی پر عملاً نافذ کر دیا جائے ----- یہ تمام باتیں اپنی جگہ صحیح ہیں لیکن مولانا مودودی صاحب کی تحریروں پر ان کا اس قدر غلبہ ہے کہ دین کے دوسرے پہلو مثلاً بندے کا اپنے رب کے ساتھ تعلق اور اس میں عبدیت، انابت، اِخبات، تضرع اور اخلاص منجملہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ----- اور جماعت اسلامی کی تحریک میں فرد پر اجتماعیت، باطن پر ظاہریت، اور حیات اخروی پر حیاتِ دنیوی اس طرح چھا گئے کہ اس کے کارکنوں کی زبان پر اگرچہ ''نجات اخروی'' بھی رہی لیکن ان کی عملی سعی و جہد کا اصل مرکز ومحور دنیا میں ''اقامت دین'' بن کر رہ گئی''۔

تاہم اس وقت بھی ہم نے مولانا وحیدالدین خان کی کتاب 'تعبیر کی غلطی'' کے مرکزی

خیال سے اختلاف کرتے ہوئے اُسے دوسرا انتہائی رُخ قرار دیا تھا' اور پھر جب ایک سال بعد جب محولہ بالا رائے کی شرح ''اسلام کی نشاۃِ ثانیہ: کرنے کا اصل کام'' کے عنوان لکھی تو اس میں بھی تعبیر کی غلطی کی بجائے ''تعبیر کی کوتاہی'' کا عنوان اختیار کیا۔

اور دوسری ''بے اعتدالی'' کا مظہر وہ ''انتہا پسندی'' ہے جس کا اظہار مولانا مودودی نے اولاً وطنی قومیت اور ثانیاً مسلم قومیت کی نفی کے ضمن میں کیا، جس کے بارے میں ہم نے ۱۹۴۷ء میں تو اس اجمالی اشارے پر اکتفا کیا تھا:

''ہمارے نزدیک اس موقف میں انتہا پسندی کی شدت تو موجود ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کا ٹھیٹھ نظریاتی اور اصولی موقف یہی ہے''۔ (سرافگندیم' صفحہ:۳۴)

لیکن ۱۹۸۷ء میں ''جماعت شیخ الہندؒ اور تنظیم اسلامی'' نامی کتاب کے مقدمے میں قدرے وضاحت کی کہ:

''اُن کی اس انتہا پسندی کا اولین مظہر یہ تھا کہ انہوں نے متحدہ قومیت کو نہایت شدو مد کے ساتھ ''کفر'' قرار دیا، اور کانگریسی مسلمانوں اور جمعیت علماء ہند اور اس کی قیادت پر نہایت جارحانہ ہی نہیں حد درجہ دل آزار تنقیدیں کیں' اور پھر اس کے کچھ ہی عرصے بعد انہوں نے مسلم قومیت کو بھی ''کفر بواح'' کا ہم پلہ قرار دے دیا'' (صفحہ:۲۲)

اور اس طرح مسلمانانِ ہند کی قومی تحریک یعنی تحریک پاکستان سے کامل علیحدگی ہی نہیں مخالفت و مخاصمت کی روِش اختیار کر لی!

لیکن ان دونوں ''بے اعتدالیوں'' کے باوصف ہماری جو رائے تحریک جماعت اسلامی کے دورِ اول کے بارے میں تھی وہ ۵۶ء میں تحریر شدہ ''بیان'' میں تو ''دورِ اول اور اس کے بنیادی افکار و نظریات'' کی بحث کے اختتام پر ''خاتمہٗ کلام'' کے عنوان سے ان الفاظ میں سامنے آئی تھی کہ:

''ان نقوش پر کہ جو صفحاتِ گزشتہ میں ثبت کیے گئے ہیں، سرسری طور پر نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ ایک اصولی اسلامی تحریک کے نقوش

ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی کی تحریک کا یہ دورِ اول کم از کم ظاہری اعتبار سے بالکل وہی نقشہ پیش کرتا ہے جو ہمیشہ سے انبیاء کرام علیہم السلام کی تحریکوں کا خاتمہ رہا ہے۔ بالکل وہی افکار و نظریات و عقائد اور بعینہٖ وہی دعوت پیش کی گئی کہ جو انبیاء کرام پیش کرتے آتے ہیں اور بہت حد تک وہی نصب العین اختیار کیا گیا اور اس کے لیے وہی طریق کار اختیار کیا گیا کہ جو ان کی تحریکوں میں اختیار کیا جاتا رہا ہے۔ ان دونوں کے نقوش میں بہت مشابہت پائی جاتی ہے اور بنظر ظاہر ان میں کوئی نمایاں فرق محسوس نہیں ہوتا۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس تحرک میں کوئی خامی اور کمی نہ تھی اور یہ ہر اعتبار سے مکمل تھی، اس لیے کہ اس میں خامیاں اور کوتاہیاں بہرحال موجود تھیں، جن پر آئندہ کسی جگہ مجھے بھی اپنی محدود بصیرت کے مطابق کلام کرنا ہے [1]۔ لیکن جو بات ایک گونہ اطمینان اور وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ تحریک اپنی نوعیت، اپنے بنیادی افکار و خیالات، اپنی دعوت اور اپنے طریق کار اور اس میں ترتیب اور تقدیم و تاثیر کے اعتبار سے، تھی بہرحال اسلام کے اصولوں کے مطابق اور انبیاء کرام علیہم السلام کی تحریکوں کے نقش قدم پر۔''

اور پھر لگ بھگ ۲۱ برس بعد ۱۹۸۷ء میں بھی ہم نے بحمد اللہ ''جماعت شیخ الہندؒ '' کے مقدمے میں جماعت اسلامی کے دور اول کو ''ایک خالص اصولی' اسلامی' انقلابی تحریک'' ہی قرار دیا جو ۱۹۴۷ء تک ''خالص اصولی اور انقلابی طریق پر عمل پیرا اور گویا منہاج نبوت و رسالت پر قائم اور گامزن رہی!'' (صفحہ:۲۲)

لیکن دو عظیم عملی غلطیوں کا معاملہ اس کے برعکس ہے!

ان میں سے پہلی یعنی ۱۹۴۷ء میں طریق کار کی تبدیلی نے اس تحریک کی نوعیت ہی کو ازسرتاپا بدل کر رکھ دیا۔ تاہم اس کے ضمن میں اس موقع پر کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے'

---

(۱) یہ اشارہ ہے اپنی اس رائے کی جانب جو ہم نے دس سال بعد ''تحریک جماعت اسلامی'' کے دیباچے میں ظاہر کی اور جو ابھی قارئین کی نگاہوں سے گزر چکی ہے۔

اس لیے کہ راقم کی پوری تالیف ''تحریک جماعت اسلامی'' اسی کے دلائل وشواہد پر مشتمل ہے۔ یہاں ایک تو اس کے دوسرے حصے یعنی ''دورِ ثانی اور اس کی خصوصیات'' کے ''نتیجۂ کلام'' کا یہ مختصر اقتباس کفایت کرے گا:

''اس دورِ ثانی کے نقوش کا سرسری سا مطالعہ بھی یہ واضح کر دینے کے لیے کافی ہے کہ اس میں ''ایک اصولی اسلامی جماعت'' کی خصوصیات کہیں ڈھونڈھے سے بھی نہیں ملتیں ...... یہ ایک خالص بے اصولی قومی جماعت کا نقشہ پیش کرتے ہیں، جو یا تو واقعی اسلام پسند ہے یا اپنی قوم میں برسر اقتدار آنے کے لیے اسلام کو بطور نعرہ (Slogan) استعمال کر رہی ہے۔

میں نے نہ یہ کہا ہے اور نہ میں ایسا سمجھتا ہوں کہ ۴۷ء میں جب طریق کار تبدیل کیا گیا تو دانستہ طور پر ان لازمی نتائج کو جاننے کے باوجود اور اس تبدیلی کا ادراک کرنے کے باوجود کیا گیا کہ جو اس طرح اس پوری تحریک کی بنیادی نوعیت میں برپا ہو رہی تھی لیکن یہ بہر حال میں سمجھتا ہوں اور اسی کو وضاحت کے ساتھ میں نے اس قدر طویل تحریر میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ طریق کار کی اس تبدیلی نے جماعت کو سطحی طور پر متاثر نہیں کیا بلکہ اس کو جڑوں سے لے کر شاخوں تک اور سر سے لے کر پیر تک بدل کر رکھ دیا ہے۔ اور اب اس جماعت کی بنیادی نوعیت تک میں فرق واقع ہو چکا ہے''۔ (تحریک جماعت اسلامی صفحات: ۲۰۲-۲۰۳)

اور دوسرے اُن بے شمار خطوط میں سے صرف چار کے اقتباسات کفایت کریں گے جو کتاب کی اشاعت پر موصول ہوئے تے' ان میں سے دو جماعت اسلامی پاکستان کے ایسے سابق ارکان کے ہیں جن کا ذکر 'نقض غزل' میں موجود ہے، اور دو کا تعلق بھارت سے ہے (یہ خطوط ''میثاق'' کے اگست اور ستمبر ۶۶ء کے شماروں کے کور کے اندرونی صفحات پر شائع ہوئے تھے)۔

☆

''......آپ کی معرکۃ الآرا، وقیع اور تحقیقی تصنیف ''تحریک جماعت اسلامی'' ایک تحقیقی مطالعہ'' نظر سے گزری...... کتاب وقت کی ایک متحرک' جامع اور تاریخی تحریک سے

متعلق ہے لہٰذا ظاہر ہے۔ کہ بہت دلچسپی اور شوق سے پڑھی جائے گی ......علماء کے علاوہ خواص نے بھی اسے بالاستیعاب از ابتدا تا انتہا بہت ہی شوق سے پڑھا اور پڑھنے کے بعد بہت اطمینان اور خوشی کا اظہار فرمایا خصوصاً اس بات پر کہ آپ نے باضابطہ جماعت میں اتنی کم مدت رہنے کے باوجود اور اس نوعمری میں ان حقائق وکوائف کا ادراک کیا اور پھر ایسے سلیس ومتین پیرائے میں اور اس قدر مرتب اور سلجھے ہوئے انداز میں پیش بھی کر دیا ......بہر کیف آپ امت کی جانب سے شکریے کے مستحق ہیں......

دل سے دعا نکلتی ہے کہ کاش جماعت جن مقاصد کے لیے قائم ہوئی تھی اور جن کا اس نے اپنے دور اول میں کسی حد تک عملی مظاہرہ بھی کیا اپنی بنیادی خامیوں کی اصلاح کے بعد پھر اسی کا عملی نمونہ پیش کرے۔نہیں معلوم کتنے مضطرب قلوب اس کے منتظر ہیں! ......محترمی! ہمارے قلوب پژمردہ ہو چکے ہیں، ہماری مایوسی انتہا کو پہنچ چکی ہے، ہم بہت ٹھوکریں کھائے ہوئے، مخدوع اور زخم خوردہ ہیں......اے اللہ ہمارے زخموں کی مرہم پٹی کے لیے کسی کو بھیج، جو ہمیں ہر لحاظ سے ایسا بنا دے کہ ہم اسلام کے عملی ترجمان بن کر اپنے فرائض کی انجام دہی میں ہمہ تن مصروف ہو جائیں!......

مکرمی! آپ نے تحریک کے دَور ثانی میں بتدریج رونما ہونے والے جن نقائص و عیوب کا تذکرہ فرمایا ہے، میرے خیال ہی میں نہیں، بلکہ ہر منصف مزاج شخص یہ کہنے پر مجبور ہے کہ یہ بالکل بدیہی امر ہے اور خود جماعت کے اربابِ حل وعقد اور اصحاب فکر ونظر کو بھی اس کا پورا احساس ہے، لیکن اصلاح کے لیے جس ہمت مرداں وجرأت رنداں کی ضرورت ہے وہ مفقود ہے......وہاں تو لومۃ الائم سے بڑھ کر یہ احساس سد راہ ہے کہ ہم اپنے طویل سفر پر کس طرح پانی پھیر سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان زخارف سے لا پروا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔نہیں معلوم کتاب کے منظر عام پر آنے کے بعد آپ کن ''مشکلات'' اور ''نوازشات'' سے دوچار ہوں۔اللہ تعالیٰ آپ کو صحت وعافیت کے ساتھ رکھے، آپ سے کوئی ٹھوس اور محکم خدمت لے اور اس راہ کے تمام موانع وعوارض کو دُور فرمائے......''

(Academy

Islamic Research and Publications.

Nadwatul Ulama,

LUCKNOW

☆

''...... جماعت کے ماضی وحال کے تقابلی مطالعہ سے یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہوکر ثابت ہوگئی ہے کہ ع

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے''

حکیم افتخار الحق تکمیلی

بیسل پور۔ پیلی بھیت (یو۔ پی) بھارت

☆

''......اسی اثناء میں ''تحریک جماعت اسلامی'' کا مطالعہ کیا۔ تقریباً وہ سب باتیں آپ نے تفصیل سے بیان کردی ہیں جو جائزہ کمیٹی کو ہم لوگوں نے نوٹ کرائی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ باتیں ہماری ہیں قلم آپ کا ہے اور آپ نے ہم سب کی بھرپور نمائندگی کی ہے ...... یہ کتاب محض آپ کی نہیں ہے' اور اس میں صرف آپ کے دل کی دھڑکنیں نہیں' بلکہ ان سینکڑوں افراد کا درد دل بول رہا ہے جو کراچی سے پشاور تک پھیلے ہوئے ہیں......

......ماچھی گوٹھ کے بعد جماعت نے جس تیزی کے ساتھ اپنے مقصد سے انحراف کیا ہے، اُگلے ہوئے نوالوں کو جس طرح چبایا ہے اور تقیہ سے لے کر ہیر پھیر کے جتنے بھی پینترے اس نے بدلے ہیں ان کا تجزیہ ضروری تھا جس کی کمی کتاب میں محسوس ہوتی ہے''

نجیب صدیقی' شاہی بازار' سکھر

☆

''......آپ کی کتاب ...صاحب سے لے کر دیکھی' جماعت اسلامی کے پرانے اور نئے موقف کا تضاد آپ نے خوب واضح کردیا ہے۔ افراد کے کردار میں گراوٹ کے جو اسباب آپ نے بیان کئے ہیں وہ صحیح ہیں' اگر جماعت پرانے موقف پر چلتی رہتی تو زوال پذیر نہ ہوتی یا کم از کم اس قدر جلد نہ ہوتی...... بہرحال آپ کا تجزیہ بنیادی طور پر صحیح ہے اور دس سال قبل کی تحریر ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ ستائش کی مستحق ہے......''

ظفر الاحسن' ناظم آباد' کراچی

تاہم یہ واضح رہنا چاہیے کہ جماعت اسلامی پاکستان کے رُخ کی تبدیلی کو نہایت اساسی اور حد درجہ دُور رس نتائج کی حامل سمجھنے کے باوجود راقم نے اسے کبھی کسی بد نیتی پر مبنی قرار نہیں دیا۔ اس سلسلے میں راقم نے اپنے بیان جائزہ کمیٹی کے آخری باب ''تبدیلی کیوں؟'' میں ان تمام دلائل کو ردّ کرنے کے بعد جو جماعت کی قیادت کی جانب سے اس تبدیلی کے جواز کے طور پر وقتاً فوقتاً پیش ہوئے ''اصل وجہ'' کے عنوان کے تحت لکھا تھا:

> ''سوال کیا جا سکتا ہے کہ پھر تمہارے خیال میں اس تبدیلی (بلکہ تمہاری رائے میں تحریک اسلامی کی ''راہ راست سے انحراف'') کی وجہ کیا ہے۔ اس سوال کا جواب میرے ذمے ہے اور اس کا وعدہ میں صفحہ ۱۲۰ پر بھی کر آیا ہوں۔
>
> میں اگر ایک لفظ میں اس اصل وجہ کو بیان کرنا چاہوں تو وہ ایک لفظ ''عجلت پسندی'' ہے، لیکن میں چاہتا ہوں کہ ذرا اس کی تفصیل بیان کر دوں۔ خصوصاً اس غرض سے کہ اس ''دورِ فتن'' میں جب کہ طرح طرح کی باتیں کی جا رہی ہیں اور بھانت بھانت کی بولیاں بولی جا رہی ہیں، کہیں میں بھی ان لوگوں کے زمرے میں شریک نہ سمجھا جاؤں جو محض بیان حال ہی پر اکتفا نہیں کر رہے ہیں بلکہ نیتوں تک کو زیر بحث لا کر فضا کو مکدر کر رہے ہیں۔
>
> میری رائے میں عجلت پسندی کہنے کو تو ایسی چیز ہے کہ جس کے بارے میں معمولی استعداد اور تھوڑی سی صلاحی رکھنے والا شخص بھی فوراً کہہ دے گا کہ یہ ایک نہایت غلط اور بڑی مہلک چیز ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ انسان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے اور انسان کا خمیر جس مٹی سے اٹھا ہے اس میں ایک جزو لاینفک کے طور پر موجود ہے۔ یہ مفہوم جو میں نے اپنے ان الفاظ میں ادا کیا ہے قرآن مجید کا بیان کردہ ہے ''خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ'' اور ''وَ کَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلاً'' کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں حقیقت کے اعتبار سے معنی اور مفہوم کے دریا بند ہیں''۔

اور اس کے بعد ''عجلت پسندی'' کے موضوع پر آٹھ دس صفحات پر پھیلی ہوئی ایک بحث [1] کے بعد (جس کی علمی حیثیت کو مولانا اصلاحی نے ایک موقع پر بہت سراہا تھا) آخر میں راقم نے دوبارہ عرض کیا تھا کہ:

---

(۱) ملاحظہ ہو ''تحریک جماعت اسلامی'' صفحہ ۲۱۶ تا ۲۲۵

’’میں خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں اس کے سوا کسی اور بری نیت یا "Malafide" کو برسر کار نہیں پاتا۔ اسے غلطی میں ضرور سمجھتا ہوں لیکن اس غلطی کو میں جذبہ عجلت پسندی پر محمول کرتا ہوں‘ کسی بری نیت یا ارادے پر مبنی نہیں سمجھتا!‘‘

اور بحمد اللہ راقم اب بھی اسی رائے کا حامل ہے!

دوسری عظیم عملی غلطی جس نے ٹائم بم کے مانند ’نقض غزل‘ کی صورت میں مہیب دھما کہ کیا اور جماعت اسلامی کی بنیادوں تک کو ہلا ڈالا‘ جماعت کی ہیئت تنظیمی سے متعلق ہے۔ اور جہاں پہلی غلطی کی نوعیت ایسی تھی کہ جیسے کوئی انسان ایک خاص رخ پر چلتے چلتے دفعتاً اپنا رخ تبدیل کر لے اور اس کے بعد پھر سیدھی لائن پر چلنا شروع کر دے تو خواہ ابتداء میں رُخ کی یہ تبدیلی معدودے چند ہی درجوں کے زاویے کے مساوی ہو لیکن جیسے جیسے وہ آگے بڑھے گا اُس کا فاصلہ سابق رُخ سے بڑھتا چلا جائے گا‘ اور گو اسے خود بھی محسوس ہوگا کہ وہ کچھ صحیح رُخ پر نہیں بڑھ رہا ہے لیکن جب تک وہ اُس خاص نقطے کا تعین نہ کر لے جہاں سے زاویہ بدلا تھا وہ کبھی اپنی غلطی کی صحیح تشخیص نہیں کر سکے گا۔ اس لیے کہ اس خاص نقطے کے بعد سے تو وہ پھر خط مستقیم ہی پر چل رہا ہوگا‘ چنانچہ ہر پچھلا قدم اگلے قدم کے لیے جواز فراہم کر دے گا!! ----- وہاں اس دوسری غلطی کی نوعیت اُس سرطان کی سی تھی جو بظاہر صحت مند اور ہر طرح سے چاق و چوبند شخص کے جسم میں خاموشی کے ساتھ اندر ہی اندر جڑیں پھیلاتا رہتا ہے یہاں تک کہ بالکل اچانک پورا جسم ؏ ’’تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم‘‘ کے مصداق متعفن پھوڑوں سے پھل جاتا ہے۔ چنانچہ اول تو صرف ’نقض غزل‘ میں جو مواد شامل ہے اسی سے اس مسموم اور متعفن فضا کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے جو ۵۷-۵۶ء میں جماعت اسلامی کے چوٹی کے قائدین کے باہمی تعلقات کے ضمن میں پیدا ہوگئی تھی‘ اور اگر اس کی شدت کا بھرپور اندازہ کرنا ہو تو اُس خط و کتابت پر ایک نظر ڈال لینا کافی ہوگا جو مولانا اصلاحی کے رکنیت جماعت سے مستعفی ہونے کے بعد ان کے اور مولانا مودودی کے مابین

ہوئی۔

یہ عظیم اساسی غلطی جو جماعت اسلامی کی ہیئت تنظیمی میں

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج!

کے مانند پیوست ہوگئی تھی، یہ تھی کہ:

> حقیقت نفس الامری کے اعتبار سے تو جماعت اسلامی ایک داعی کی دعوت پر جمع ہونے والے لوگوں پر مشتمل تھی چنانچہ داعی کو از خود امیر و قائد کی حیثیت حاصل تھی، اور جمع ہونے والے لوگوں کی حیثیت اصلاً اُس کے اعوان و انصار کی تھی ----- لیکن مختلف اسباب کی بناء پر ظاہری اعتبار سے اس کا ڈھانچہ ایک ایسی دستوری اور جمہوری تنظیم کے طرز پر اٹھایا گیا جو کچھ لوگوں کے باہمی اتفاقِ رائے سے وجود میں آتی ہے اور جس کا صدر یا امیر ان کے ووٹوں سے منتخب ہوتا ہے!!

اب ظاہر ہے کہ مقدم الذکر نوعیت کی جماعت میں قیادت کی اصل ذمہ داری ''داعی امیر' کی ہوتی ہے، وہی پالیسی معین کرتا ہے' اسی کی صوابدید ہر معاملے میں فیصلہ کن ہوتی ہے چنانچہ وہ صرف اپنی ''ضرورت'' کے بقدر ساتھیوں سے مشورہ کرتا ہے' اور ساتھی اپنے امکانی ''اجتہاد'' کو بروئے کار لا کر مشورہ دیتے ہیں' اور مشورہ پیش کرنے کے بعد اپنے آپ کو بَری الذّمہ سمجھتے ہیں' اور آخری فیصلہ کا معاملہ اپنے داعی و قائد پر چھوڑ دیتے ہیں' اس نوع کی کسی تنظیم کے ساتھ اگر ''اسلامی'' کا سابقہ یا لاحقہ بھی لگا ہوا ہو تو حدیث نبویؐ:

"لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ"

کے مطابق، جس کا تقاضا ہے کہ داعی ہو یا قائد' صدر ہو یا امیر' حتیٰ کہ حاکم اور سلطان ہو یا خلیفہ' کسی کی بھی اطاعت کسی ایسے معاملے میں نہیں کی جا سکتی جو شریعت کے خلاف ہو۔ اس تنظیم یا جماعت میں بھی ''سمع و طاعت'' تو بھرپور انداز میں ہو گی لیکن ''معروف'' کے دائرے کے اندر اندر! ۔ جب کہ مؤخر الذکر نوعیت کی تنظیم کے منتخب سربراہ کو نام خواہ صدر کا

دیا جائے خواہ امیر کا اسے اصلاً کوئی امتیازی حیثیت اپنے ساتھیوں پر حاصل نہیں ہوتی اور جو کچھ اختیار اس کے پاس ہوتا ہے ساتھیوں ہی کا تفویض کردہ ہوتا ہے' جسے وہ جب چاہیں واپس لے سکتے ہیں' اس نوع کی تنظیم میں مشورہ کرنا صدر یا امیر کا ''فرض'' اور ساتھیوں کا ''حق'' ہوتا ہے اور سربراہ کے لیے لازم ہوتا ہے کہ اکثریت کی رائے کی پابندی کرے!!

'نقض غزل' کی تیسری قسط جس پر اب ''مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کی رفاقت کا تاریخی پس منظر' اور جماعت اسلامی کا تنظیمی ڈھانچہ'' کا عنوان قائم ہوا ہے' جب نومبر ۱۹۶۶ء کے ''میثاق'' میں شائع ہوئی تو مولانا اصلاحی کی جانب سے تو اس کی کامل اور صراحتاً تصویب ہوئی تھی۔ چنانچہ ان کے تأثر اور تبصرہ کا ایک حصہ تو وہ ہے جو دسمبر ۶۶ء کی اشاعت کے کور پر شائع کر دیا گیا تھا ---- یعنی:

> '' 'نقض غزل' کی گذشتہ قسط راقم الحروف نے اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر تحریر کی تھی اور مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے علم میں وہ طباعت کے بعد ہی آئی' لیکن بحمد اللہ مولانا نے نہ صرف اس کی مجموعی اعتبار سے مکمل تصویب فرمائی بلکہ شدت تاثر میں بار بار یہ شعر مولانا کی زبان پر جاری ہوتا رہا کہ
>
> سر خدا کہ عارف و سالک بکس نہ گفت
> در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید!
>
> اس مضمون کی حالیہ قسط میں راقم الحروف نے مولانا کے موقف سے اختلاف بھی کیا ہے اور اس پر تنقید بھی کی ہے۔ مولانا کی انساف پسندی سے توقع ہے کہ وہ اس پر بھی ''ہمدردانہ'' غور فرمائیں گے۔
>
> اسرار احمد''

مزید برآں مولانا کے یہ الفاظ بھی ہمیں واضح طور پر یاد ہیں کہ: ''آپ نے تو جماعت کی ایسی تاریخ لکھ دی ہے کہ اگر خود میں بھی کوشش کروں تو اس خاکے میں صرف واقعاتی رنگ مزید بھرنے کے سوا اور کوئی اضافہ نہیں کر سکتا!'' ---- مولانا مودودی مرحوم کی جانب سے بھی ''سکوت'' کو کامل توثیق نہ سہی ''نیم رضا'' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اس وقت اس کے حوالے سے دو باتیں ذہن میں تازہ کر لی جائیں:

ایک یہ کہ مولانا محمد منظور نعمانی مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی اور بعض دوسرے نمایاں علماء کے جماعت سے علیحدہ ہو جانے کے بعد مولانا اصلاحی کو جماعت اسلامی میں واضح اور مسلّم طور پر ''شخص دوم'' کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ اور دوسرے یہ کہ جماعت کی ہیئت تنظیمی کے ضمن میں مولانا مودودی کے نظریات اور تصورات اوپر بیان شدہ مقدم الذکر نوعیت کے تھے' جب کہ مولانا اصلاحی مؤخر الذکر نظریئے اور تصور کے حامل تھے۔

چنانچہ ان ''دو بڑوں'' کے مابین' سترہ سالہ رفاقت کے دوران' دعوتی اور تحریکی سرگرمیوں میں ''یک جان دو قالب'' کی حد تک رفاقت اور مثالی تعاضد و تناصر کے باوصف اندر ہی اندر ایک کشمکش بھی جاری رہی' جو آغاز میں تو محض ایک علمی اختلاف کی حیثیت رکھتی تھی' لیکن قیام پاکستان سے متصلاً قبل ۱۹۴۶ء میں الٰہ آباد کے سالانہ اجتماع میں اس کے ضمن میں تلخی کا ظہور ہو چکا تھا' چنانچہ قیام پاکستان کے بعد دس سالوں کے دوران یہ ایک ''سرد جنگ'' کی صورت میں مرکزی مجلس شوریٰ کی سطح پر جاری رہی اور بالآخر اس نے 'نقض غزل' کے تند و تیز دھماکے کی صورت میں ظہور کیا۔ جس کی ذمہ داری کا اگر پچھتر فی صد حصہ مولانا مودودی پر آتا ہے تو کم از کم پچیس فی صد بار مولانا اصلاحی پر بھی ہے!!

راقم الحروف کو اقامت دین کے مقصد عظیم کے لیے ''برپا'' ہونے والی جماعت کی ہیئت تنظیمی اور اس کے امیر اور دوسرے شرکاء کے مابین تعلقات کی نوعیت' اور بالخصوص قائد اور امیر کے حقوق و اختیارات کے ضمن میں مولانا مودودی کی رائے کا اندازہ تو اگرچہ حالات و واقعات کے بین السطور سے پوری طرح ہو گیا تھا (جیسے کہ 'نقض غزل' کے متذکرہ بالا حصے سے ظاہر ہے) لیکن اس کے سامنے اس موضوع پر مولانا مرحوم کی کوئی واضح تحریر موجود نہ تھی۔ مولانا نے اس سلسلے میں جو تقریر کوٹ شیر سنگھ کی شوریٰ میں کی تھی اس کی اُڑتی اُڑتی سی خبریں ملیں تو تجسس تو بڑھ گیا لیکن تفصیلات کے حصول کی کوئی سبیل نظر نہ آئی اور

متعدد رابطوں کے باوجود اس کا کوئی سراغ نہ مل سکا!

اسی اثناء میں ۸۳-۱۹۸۲ء کے لگ بھگ زمانے میں حیدر آباد (دکن) سے مولانا محمد یونس (مرحوم) کی تالیف ''خطوط کے چراغ'' موصول ہوئی تو مولانا مودودی کے ایک مکتوب میں، جو قیامِ جماعت سے چھ ماہ قبل مارچ ۴۱ء میں تحریر ہوا تھا، موضوع زیر بحث پر ان کی سوچ واضح طور پر سامنے آ گئی۔ اس لیے کہ اس خط میں مولانا مرحوم نے بیعت کی اقسام کے ضمن میں بیعت نظم جماعت کا ذکر نہایت صراحت و وضاحت کا ورعزم و جزم کے ساتھ کیا ہے، جو حسب ذیل ہے:

> ''۳۔ تیسری بیعت وہ ہے جو اسلامی جماعت کے امیر یا امام کے ہاتھ پر کی جاتی ہے۔ اس کی نوعیت یہ ہے کہ جب تک امیر یا امام اللہ اور اس کے رسولؐ کا مطیع ہے، اس وقت تک جماعت کے تمام ارکان پر اس کی اطاعت فرض ہے۔ ''مَنْ مَّاتَ وَ لَيْسَ فِيْ عُنُقِهٖ بَيْعَةٌ'' اور دوسری تمام احادیث میں جس بیعت کی اہمیت پر زُور دیا گیا ہے ان سب سے مراد تیسری بیعت ہے کیونکہ اس پر اسلامی جماعت کی زندگی اور اس کے نظام کا قیام منحصر ہے۔ اس سے الگ ہونے یا الگ رہنے کے معنی یہ ہیں کہ نبی ﷺ جس کام کے لیے تشریف لائے تھے اور جس امر عظیم کا بار آپؐ امت پر چھوڑ گئے ہیں اس کو نقصان پہنچایا جائے یا ختم کر دیا جائے۔ (۱)''

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس مسئلے میں مولانا مودودی مرحوم کے نظریات کمالِ شرح و بسط کے ساتھ ان کی اُس تقریر میں سامنے آئے جو ہفت روزہ ''آئین'' نے شائع کی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اسے شکریہ کے ساتھ فوراً ''میثاق'' میں من و عن شائع کر دیا (اس لیے کہ ہم تو اس کے ایک عرصے سے متلاشی تھے!)

---

(۱) مولانا مرحوم کے اس خط کے ضمن میں ہفت روزہ ''تکبیر'' کراچی نے کچھ غلط مبحث، اور مغالطہ آمیزی کی سعی کی تھی جس پر ہماری جانب سے وضاحت ارسال کر دی گئی تھی لیکن افسوس کہ اسے پورا شائع نہیں کیا گیا۔ تاہم ''میثاق'' میں یہ پوری بحث ۱۹۸۶ء میں شائع ہو گئی تھی اور دوبارہ مارچ ۸۹ء کی اشاعت میں بھی!

مولانا مرحوم کے جو افکار اور نظریات اس تقریر (یا تحریر) کے ذریعے سامنے آئے ہیں' ان میں سے بعض سے ہمیں شدید اختلاف بھی ہے (جس پر ہم بعد میں گفتگو کریں گے) لیکن جہاں تک تحریک اسلامی کے قائد اور امیر کے حقوق و اختیارات کا معاملہ ہے اس کے ضمن میں ہم اُن سے صد فی صد متفق ہیں۔ یعنی یہ کہ اگر اس تحریک کے پیش نظر محض اصلاحی یا تبلیغی کام نہ ہو' بلکہ حقیقی معنی میں ''اقامت دین'' یعنی دین کامل نظامِ عدل و قسط (System of Social Justice) کا قیام یا بالفاظِ دیگر ''اسلامی انقلاب'' ہو تو اس کے لیے قائم ہونے والی جماعت یا تنظیم کے امیر کے حقوق و اختیارات وہی ہونے چاہئیں جو مولانا نے بیان کئے ہیں۔ بالخصوص جبکہ اس کی حیثیت ''داعی امیر'' کی ہو یعنی اسی کی دعوت اور اسی کے افکار و نظریات کی اساس پر وہ جماعت یا تنظیم وجود میں آئی ہو۔ تاہم ہماری پختہ رائے ہے کہ یہ تصورات صرف نظامِ بیعت سے مناسبت رکھتے ہیں اور کسی دستوری اور جمہوری تنظیم میں ان کو بہ تمام و کمال سمونا تو ممکن ہی نہیں ہے' لیکن اگر کسی مجبوری کے باعث ایسا کرنا لازمی ہو تو اس میں امیر یا صدر کے حق استرداد (Veto) کا غیر مبہم انداز میں تسلیم کیا جانا ضروری اور لابدی ہے!

جہاں تک ہمارا تعلق ہے' بحمد اللہ ہم پر یہ حقیقت پوری وضاحت کے ساتھ جماعت سے علیحدہ ہونے کے بعد جلد ہی ''منکشف[1]'' ہو گئی تھی ----- چنانچہ ہم نے اللہ کے فضل و

---

(۱) اس لفظ کا واقعاتی پس منظر بہت دلچسپ ہے۔ راقم جماعت سے مستعفی ہونے کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال تک تو لاہور اور فیصل آباد سے تعلق رکھنے والے اکابر (مولانا اصلاحی' مولانا عبد الغفار حسن اور حکیم عبد الرحیم اشرف وغیرہم) کے ساتھ کسی نئی تنظیم کی تشکیل کی مساعی میں مصروف رہا۔ لیکن اوائل ۵۹ء میں ان سے مایوس ہو کر ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی مرحوم کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے کراچی ہجرت کر لیا۔ وہاں بھی ایک خاصا بڑا گروپ ''خوارج'' کا موجود تھا اور ان کے مابین ان دنوں کسی نئی جماعت کے ضمن میں ہیئت تنظیمی کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ چنانچہ راقم بھی اس مسئلے کے حل میں سرگرداں ہو گیا۔ اسی اثناء میں ایک دن یہ واقعہ پیش آیا کہ راقم نماز عشاء کے بعد مطب سے فارغ ہو کر کیماڑی سے ناظم آباد واپس آنے کے لیے بس میں سوار ہوا تو ذہن اسی ادھیڑ بُن میں مصروف ہو گیا اور راقم اس میں اس درجہ مستغرق ہوا کہ اسے کچھ پتہ نہ چلا کہ کب بس ٹاور سے گزری اور کب صدر پہنچی۔ لیکن جیسے ہی ڈرائیور نے ایمپریس ◀◀

کرم سے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور قائم کی تو اُس میں بھی اپنا ویٹو تسلیم کرایا اور اس کے بعد تنظیم اسلامی قائم کی تو اُس کی اساس بھی ''بیعت سمع و طاعت فی المعروف'' پر رکھی' اور اگرچہ اس میں اصل دخل تو ''وَ مَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْ لَا اَنْ هَدَانَا اللّٰهُ'' کے مصداق اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و احسان ہی کا ہے' تاہم ایک حد تک یہ سہولت بھی ہمیں حاصل تھی کہ ہمارے سامنے جماعت اسلامی کا تکلیف دہ تجربہ اور 'نقض غزل' کی عبرت انگیز مثال موجود تھی۔

مولانا مودودی مرحوم کے ۴۱ء کے خط اور ۵۷ء کی تقریر سے یہ بات بلا شبہ ریب و شک ثابت ہو جاتی ہے کہ اصلاً مولانا مرحوم کا ذہن بھی یہی تھا۔ اور ہمارے نزدیک وہ کوہ ہمالیہ جتنی بڑی غلطی جو مولانا سے قیامِ جماعت کے موقع پر سرزد ہوئی یہی تھی کہ انہوں نے جماعت کی اساس 'بیعت سمع و طاعت فی المعروف'' پر نہیں بلکہ ایک دستور پر قائم کی۔ جس کے نتیجے میں ان کی جو حیثیت معین ہوئی وہ ایک دستوری تنظیم کے ''منتخب امیر'' کی تھی۔ جبکہ نہ صرف یہ کہ حقیقت واقعی کے اعتبار سے وہ ''داعی امیر'' تھے' بلکہ ان کے ذہن اور مزاج کی ساخت بھی اُسی سے مناسبت رکھتی تھی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ مولانا مودودی کی ان دو حیثیتوں' یعنی حقیقی اور واقعی حیثیت اور دستوری قانونی حیثیت' کے مابین فرق و رفاوت بلکہ کشاکش اور تصادم ہی کے بطن سے ان جملہ پیچیدگیوں نے جنم لیا جن کے نتیجے میں وہ متعدد مواقع پر موردِ الزام بنے' اور ان کے بعد اقدامات اس درجہ قابل اعتراض صورت میں سامنے آئے کہ انکی بنا پر ان کی نیت تک پر شک کی گنجائش پیدا ہوئی۔ اس لیے کہ اگرچہ جماعت کے پہلے اجتماع میں مولانا مرحوم نے یہ وضاحت کر دی تھی کہ: ''اسلامی جماعت کا طریقہ یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے صاحب امر کے انتخاب میں تقویٰ اور دیانت ہی تلاش کرتی ہے

◂◂ مارکیٹ پر بریک لگایا میں ایک دم چونک سا گیا اور اُسی لمحے میرا مسئلہ حل ہو گیا' اس لیے کہ عین اسی وقت سورۃ الصّف کی آخری آیت میرے ذہن میں بجلی کی طرح کوندگئی اور یہ حقیقت ''منکشف'' ہوگئی کہ یہ مسئلہ ''مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ؟'' کے الفاظ کے حوالے سے داعی اور اس کے اعوان و انصار کے اساسی تصور کے ذریعے ہی حل ہو سکتا ہے!

اور اسی بنا پر وہ اپنے معاملات پورے اعتماد کے ساتھ اس کے سپرد کرتی ہے''۔ لیکن چونکہ دستور جماعت میں امیر کے لیے ویٹو کا حق طے نہیں کرایا' لہٰذا بات گول مول رہ گئی!

اس سلسلے میں تاسیس جماعت کے عین موقع پر اگر موجود الوقت ظروف واحوال کے پیش نظر صورتِ معاملہ کے کسی قدر گول مول اور مبہم رہنے کے لیے کوئی وجہ جواز تسلیم کر بھی لی جائے' تو جماعت کے پہلے تنظیمی بحران کے بعد تو اس کے لیے قطعاً کوئی جواز باقی نہ رہا تھا جب بہت سے ''اکابر'' (مولانا محمد منظور نعمانی' مولانا سید ابوالحسن علی ندوی وغیرہم) امیر جماعت میں اسی ''تقویٰ'' کی کمی کے (صحیح یا غلط) احساس کی بنا پر جماعت سے علیحدہ ہو گئے تھے اور باقی رہنے والے لوگوں میں سے اس نمایاں ترین شخص (مولانا اصلاحی) نے' جنہیں اب واضح طور پر ''شخص دوم'' کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی' امیر کے حق استرداد کے خلاف نہ صرف یہ کہ علانیہ موقف اختیار کر لیا تھا بلکہ ڈٹ کر مورچہ لگا لیا تھا۔ اُس موقع پر اگر مولانا مودودی اُن کے دلائل سے قائل ہو جاتے تب تو معاملہ دوسرا ہوتا' بصورتِ دیگر راست معاملگی (Straight Dealing) بلکہ دور اندیشی کا تقاضا بھی یہی تھا کہ مولانا بھی پوری طرح ڈٹ جاتے اور نہ کسی شخصیت کا لحاظ کرتے نہ کسی فوری مصلحت کے تحت خم کھاتے! لیکن افسوس کہ مولانا نے اس موقع پر وقتی مصلحت ہی کو پیش نظر رکھا اور اُس ''عزیمت'' کے عشر عشیر کا بھی مظاہرہ نہ کیا جس کا اظہار ان کی جانب سے دس گیارہ سال بعد ماچھی گوٹھ کے اجتماعِ ارکان کے موقع پر' یا اس کے بعد ہوا۔ لہٰذا معاملہ پھر گول مول ہی رہ گیا!

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قیامِ پاکستان کے بعد جب جماعت کے سیاسی میدان میں چھلانگ لگا دینے کے باعث حالات و واقعات کی رفتار تیز ہوئی تو نو دس سال تک صورت یہ رہی کہ چونکہ مولانا مودودی کا ذہن اور مزاج تو وہی تھا جو اوپر بیان ہو چکا ہے' لہٰذا ان کا مستقل طرزِ عمل یہ رہا کہ ہر بڑا فیصلہ خود کر لیتے اور اس کا اعلان و اظہار بھی کسی خطاب عام' یا اخباری بیان' یا ماہنامہ ترجمان القرآن کے ''اشارات'' میں کر دیتے[1] اور پھر جب

(۱) اپنے اس طرزِ عمل کا صریح اعتراف مولانا مودودی نے نہایت اعتماد اور طنطنہ کے ساتھ ◄◄

مجلس شوریٰ کا اجلاس ہوتا تو وہ غریب اس صورتِ حال پر سر پکڑ کر رہ جاتی کہ اب تو تیر کمان سے نکل چکا ہے۔ چنانچہ بعض مواقع پر شوریٰ کے ارکان اس طرز پر بھی سوچتے کہ میاں طفیل محمد صاحب کو قیم جماعت کی بجائے صرف ناظم دفتر کی حیثیت دی جائے، اور مولانا مودودی کو پابند کیا جائے کہ وہ شوریٰ سے پیشگی مشورہ لیے بغیر کسی نئے اقدام کا اعلان نہ کریں (یہ روایت حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کی ہے جو انہوں نے حالیہ ملاقات میں بیان کی)۔

امیر جماعت اور مرکزی مجلس شوریٰ کے مابین اسی کشمکش کا نتیجہ تھا کہ بالآخر دستورِ جماعت میں یہ پیچ در پیچ فارمولا طے پایا کہ: اگر کسی معاملے میں امیر جماعت بھی اپنی رائے پر اصرار کرے، اور مجلس شوریٰ کی اکثریت بھی کسی مقابل رائے پر مُصر ہو جائے تو اس معاملے میں جماعت کے عام ارکان سے استصواب کیا جائے گا۔ پھر اگر ارکانِ جماعت کی اکثریت امیر کی رائے کے حق میں فیصلہ دے دے گی تو امیر اپنے منصب پر برقرار رہے گا جبکہ شوریٰ معزول ہو جائے گی اور اس کا نیا انتخاب ہوگا، اور اگر برعکس صورت پیدا ہو جائے تو امیر معزول ہو جائے گا اور نیا امیر منتخب کر لیا جائے گا!

جماعت اسلامی کی پوری تاریخ میں دستورِ جماعت میں طے شدہ اس راستے کو عملاً اختیار کرنے کا پہلا اور آخری موقع نومبر دسمبر ۵۶ء کی اُس شوریٰ میں آیا تھا جس میں جائزہ کمیٹی کی رپورٹ پیش ہوئی۔ شوریٰ کے اس طویل ترین اجلاس کے دوران ارکانِ شوریٰ کے مابین جماعت کی پالیسی اور طریق کار کے ضمن میں جو دو انتہائی متضاد نقطہ ہائے نظر سامنے آئے ان پر جانبین کے اصرار کی شدت تو اس سے ظاہر ہے کہ پندرہ دن کی طویل بحث کے بعد بمشکل ایک ''مصالحتی قرار داد'' پر اتفاق ہو سکا، اور اس معاملے میں خود مولانا مودودی کے جو احساسات تھے وہ انہوں نے بعد میں خود ہی ارکانِ جائزہ کمیٹی کے نام اپنے الزام نامے میں وضاحت سے بیان کر دیئے۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے

◀◀ جنوری ۵۸ء میں مولانا اصلاحی کے نام خط میں کیا ہے کہ: ''میں اسی رائے کو حق سمجھتا ہوں، ہمیشہ اسی کو ظاہر کیا ہے، اور تشکیل جماعت کے بعد سے آج تک اسی پر عملاً کام کرتا رہا ہوں!''

کہ دستورِ جماعت کا متذکرہ بالا پیچ در پیچ فارمولا آخر اور کس مرض کی دوا تھا؟ دستور کی روح ہی نہیں الفاظ کے مطابق بھی صاف اور سیدھا راستہ یہ تھا کہ جو کام مولانا مودودی نے ''بعد از خرابی بسیار'' ماچھی گوٹھ میں کیا وہ وہاں کرتے' یعنی اپنے نقطۂ نظر کو وضاحت سے بیان فرما دیتے اور پھر رائے شماری کرا لیتے' اس کے نتیجے میں اگر شوریٰ کے ارکان کی اکثریت مولانا کے موقف کی تائید کر دیتی تب تو کوئی بحران یا تعطل پیدا ہی نہ ہوتا۔ بصورتِ دیگر عام ارکان سے استصواب کے لیے اجتماع طلب کر لیا جاتا۔ جہاں واضح طور پر امیر جماعت اور شوریٰ کی اکثریت کی قراردادیں ایک دوسرے کے بالمقابل پیش ہوتیں اور ارکان جو فیصلہ کرتے اسے فریقین دستور کے مطابق قبول کر لیتے۔ اس کے برعکس جو روش مولانا نے اختیار کی وہ نہ صرف یہ کہ دستور کی روح اور الفاظ دونوں کے منافی تھی' بلکہ باہمی معاملات کے معروف اور معقول معیارات سے بھی اس درجہ بعید تھی کہ انسان کے لیے کم از کم اس معاملے کی حد تک مولانا کے ساتھ حسن ظن برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے! ------ چنانچہ اس کا بالکل صحیح پوسٹ مارٹم تھا جو مولانا اصلاحی نے اپنے اُس طویل خط میں کر دیا تھا' جسے سفیر شام جناب عمر بہاء الامیری نے ''قاضی کا فیصلہ'' قرار دیا۔

اس معاملے میں اگر اس امکان کو پیش نظر رکھا جائے کہ مولانا مودودی نے دسمبر کی شوریٰ میں تو مصالحت کی کوشش پورے خلوص و اخلاص اور کامل صفائے قلب ہی سے کی تھی' لیکن بعد میں جب اس مصالحتی قرارداد کی مختلف اور متضاد تعبیریں کی گئیں اور اس کے نتیجے میں لاہور' راولپنڈی اور لائلپور میں جماعت کے حلقوں میں ہنگامہ ہو گیا تب مولانا کا ذہن تبدیل ہوا' تب بھی یہ الزام پوری شدت سے برقرار رہتا ہے کہ اس صورت میں بھی متذکرہ بالا راستہ ہرگز بند نہیں ہوا تھا بلکہ پوری طرح کھلا تھا۔ اور مجلس شوریٰ کا اجلاس ہنگامی بنیادوں پر دوبارہ فوراً طلب کیا جا سکتا تھا۔

مزید برآں مولانا اصلاحی کے خط کے موصول ہوتے ہی مولانا مودودی کا انتہائی جذباتی انداز میں جماعت کی امارت سے استعفاء دینا اور پھر اس کا سنسنی خیز انداز میں

اخبارات میں شائع کرایا جانا[1] وغیرہ مروّجہ

سیاست کے تو یقیناً ''معروف'' طور طریقے ہیں لیکن (ہلکے سے ہلکے انداز میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ)ع ''ایں حال نیست' داعی' عالی مقام را!''

اس کے بعد کی مصالحتی مساعی کے ضمن میں بھی بہت سی کہانیاں عام ہوئیں' یہاں تک کہ صریح کذب بیانی اور دروغ گوئی کے الزام بھی لگے' لیکن چونکہ ان کا حتمی علم سوائے علام الغیوب تبارک وتعالیٰ کے اور کسی کو نہیں ہو سکتا' لہٰذا ہم اُن سب سے صرفِ نظر کرتے ہوئے آخر میں صرف اُس بات کی جانب اشارہ کرنا چاہتے ہیں جس پر تفصیلی گفتگو اجتماعِ ماچھی گوٹھ کی روداد کے سلسلے میں 'نقض غزل' کے اُس حصے میں ہو چکی ہے جو اسی شمارے میں شائع ہو رہا ہے' یعنی یہ کہ اولاً مولانا مودودی کو اپنی قرارداد میں مولانا اصلاحی کا اضافہ ہرگز قبول نہیں کرنا چاہیے تھا' اور مولانا اصلاحی کو پورا موقع دینا چاہیے تھا کہ وہ اپنے قول کے مطابق مولانا کی قرارداد کے بالمقابل دسمبر کی شوریٰ والی قرارداد کو پیش کرتے اور اس طرح دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی جدا ہو جاتا۔ ثانیاً جب انہوں نے اپنی قرارداد میں مولانا اصلاحی کی ترمیم قبول کر لی تھی تو اب یہ ان کی ذاتی قرارداد نہیں رہ تھی بلکہ اس نے دوبارہ

---

(۱) اس کی جو تفصیل حال ہی میں مولانا عبدالغفار حسن صاحب کی زبانی معلوم ہوئی' وہ یہ ہے کہ: یہ جنوری ۵۷ء کی کوئی تاریخ تھی' اور زوردار بارش ہو رہی تھی' کہ مرکزی گاڑی کا ڈرائیور میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ ''میاں طفیل محمد' جناب نعیم صدیقی اور ملک نصر اللہ خاں عزیز گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہیں اور آپ کو بلا رہے ہیں' فوراً اصلاحی صاحب کے پاس چلنا ہے''۔ وہاں پہنچے تو طفیل صاحب نے مولانا مودودی کا استعفاء پڑھ کر سنایا جس پر نعیم صاحب کمبل میں منہ چھپا کر سسکیاں لینے لگے------- لیکن مولانا نے فرمایا: ''اس کی خبر نہ کسی رکن جماعت کو دیں' نہ اخبارات کو' بلکہ بذریعہ ٹیلی گرام شوریٰ کا اجلاس طلب کر لیا جائے!'' لیکن واپسی پر جب نعیم صاحب مرکز پہنچے تو انہوں نے یہ اعلان کیا کہ: ''میں جماعت کی رکنیت سے استعفاء دیتا ہوں' اور چونکہ اور چونکہ اب میں نظم کا پابند نہیں رہا لہٰذا میرے لیے ارکانِ جماعت کو مولانا کے استعفے کی خبر پہنچانے میں کوئی چیز مانع نہیں ہے!'' اور دھر فون اٹھایا اور مختلف ارکانِ جماعت کو اطلاع دینی شروع کر دی۔ شام کو میاں طفیل محمد صاحب کا خط بھی آ گیا کہ ''چونکہ ارکان جماعت کو سینہ بہ سینہ خبر پہنچ چکی ہے' لہٰذا اب اخفاء کی کوشش عبث ہے' لہٰذا میں استعفے کی خبر اخبارات کو بھی دے رہا ہوں!''۔

ایک ''مصالحتی فارمولے'' کی صورت اختیار کر لی تھی' لہٰذا اس میں ترمیم بھی فریقین کی رضا مندی ہی سے ہونی چاہیے تھی' جس کے لیے شوریٰ کا اجلاس طلب کیا جانا چاہیے تھا تا کہ مولانا اصلاحی کو بھی دوبارہ پورا موقع مل جاتا کہ اپنا موقف اور لائحۂ عمل از سرِ نو معین کر لیں' لیکن افسوس کہ اس مرحلے پر مولانا مودودی نے اچانک مبارزت طلبی کی وہ صورت اختیار کر لی' جو اس کے بعد سے اُن کے ہر اقدام اور ہر لفظ سے مترشح ہوتی رہی۔

الغرض! بات کو کھولا جائے تو قدم قدم پر ؎

ناطقہ سر بگریباں ہے' اسے کیا کہیے
خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے!

والا معاملہ نظر آتا ہے اور لسان العصر اکبر الٰہ آبادی کے اس فلسفیانہ شعر کے مصداق کہ ؎

جہاں ہستی ہوئی محدود' لاکھوں پیچ پڑتے ہیں
عقیدے' عقل' منطق' سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

مولانا مودودی کی رائے' قول اور عمل سب ایک دوسرے سے دست و گریباں نظر آتے ہیں' اور ''ہاتھی کے پاؤں میں سب کے پاؤں'' کے مطابق سو بات کی ایک بات درکار ہو تو یہ سب کچھ نتیجہ ہے اس کا کہ تاسیس جماعت کے موقع پر مولانا مودودی نے اپنے اصل خیالات و نظریات کے برعکس ایک ایسی تنظیمی ہیئت اختیار کر لی جس کو وہ نہ ذہناً قبول کر سکے نہ عملاً۔ جس کے نتیجے میں خود ان کی برسہا برس کی محنت شاقہ کو جو نقصان پہنچا' اور انہیں خود اپنے ہی ہاتھوں محنت و مشقت سے کاتا ہوا سوت جس طرح تار تار کر دینا پڑا' اس سے قطع نظر تجدید و احیائے دین کی تحریک اور اقامت دین کی سعی و جہد کو شدید نقصان پہنچا----- **فاعتبروا یا اولی الابصار!**

دوسری طرف اس 'نقضِ غزل' کی ذمہ داری کا کم از کم ۲۵ فی صد حصہ مولانا امین احسن اصلاحی پر بھی عائد ہوتا ہے' اور وہ اس لیے کہ انہوں نے مولانا مودودی کے ساتھ مسلسل کئی سال کی کھینچ تان کے بعد جو پیچ در پیچ دستوری فارمولا طے کرایا تھا' وقت آنے پر

اس کے منطقی تقاضوں کو پورا کرنے سے خود بھی کامل گریز کیا۔

اس سلسلے میں الحمدللہ کہ ہم نے اپنی تئیس برس قبل کی تحریر میں بھی جو ''میثاق'' میں دسمبر ۶۶ء میں اس وقت شائع ہوئی تھی جب ''میثاق'' مولانا اصلاحی کے ''زیر سرپرستی'' شائع ہوا کرتا تھا' واضح کر دیا تھا کہ ہمارے نزدیک جائزہ کمیٹی کے ارکان پر مولانا مودودی کے الزام نامے' اس پر مولانا اصلاحی کے مدلل تعاقب' اور اس کے جواب میں مولانا کے امارتِ جماعت سے استعفے کے اعلانِ عام کے بعد مولانا اصلاحی کی مصالحت پر آمادگی اور مصالحت کنندگان کی مساعی کے ساتھ تعاون ناقابل فہم ہے۔'' اور مستقبل کے مؤرخ کے لیے یہ حق باقی رہ جاتا ہے کہ وہ چاہے تو اُن کے طرزِ عمل کو انتہائی دردمندانہ اور مخلصانہ صلح جوئی کا نتیجہ قرار دے لے اور چاہے تو کمزوری پر محمول کر لے!'' (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''میثاق'' جنوری ۱۹۹۰ء صفحات ۸۲ء تا ۸۶)

راقم الحروف کو اچھی طرح یاد ہے کہ اجتماع ماچھی گوٹھ کے لیے روانگی سے چند یوم قبل راقم نے لاہور میں مولانا اصلاحی سے ملاقات کی اور جب یہ معلوم ہوا کہ مولانا ظفر احمد انصاری نے اجتماعِ ارکان سے قبل اپنی ایک مصالحتی کوشش کے ضمن میں مولانا سے کچھ وعدے لے لیے ہیں تو راقم نے ان سے صاف عرض کیا کہ: ''مولانا! اب حالات جہاں تک پہنچ گئے ہیں ان کا تقاضا تو یہ ہے کہ آپ ماچھی گوٹھ کے اجتماع میں مولانا مودودی پر عدم اعتماد کی قرارداد لے کر کھڑے ہوں!'' اس پر مولانا نے گہرے تاثر کے ساتھ فرمایا: ''یہ ممکن نہیں ہے' اس لیے کہ یہ جماعت سوائے مولانا مودودی کے اور کسی شخص کی امارت میں چل ہی نہیں سکتی!'' جس پر میری زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے کہ: ''پھر آپ نے جماعت کے دستور میں جمہوریت کے تقاضوں کو سمونے کی سعی لاحاصل کیوں کی تھی؟'' اور اس پر مولانا خاموش ہو کر رہ گئے!

یہ صورتِ حال ماچھی گوٹھ کے اجتماعِ ارکان میں اس وقت اپنے نقطۂ عروج (Climax) کو پہنچ گئی تھی جب مولانا مودودی نے بھرے اجتماع میں اپنی قرارداد میں مولانا اصلاحی کے تجویز کردہ اضافے کے ''نہلے'' پر اپنے اضافۂ مزید کا ''دہلا'' دے مارا تھا'

اور گویا مولانا اصلاحی کو برسر عام دعوتِ مبارزت دیدی تھی‘ اس پر ہم اپنی حالیہ تحریر میں جو اسی شمارے میں شائع ہو رہی ہے اپنا یہ تاثر بیان کر چکے ہیں کہ اگر اس کی ''صریح بزدلی'' سے کم تر کوئی توجیہہ ممکن ہے تو صرف یہ کہ اس غیر متوقع اور اچانک حملے سے مولانا اصلاحی بھونچکا ہو کر رہ گئے تھوں‘ اور انکی قوتِ فیصلہ عارضی طور پر مفلوج ہو گئی ہو!

چنانچہ ع ''ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات!'' کے مصداق مولانا اصلاحی کو اس وقت کے تذبذب یا کم ہمتی اور بزدلی کی بھرپور سزا بھی جلد ہی مل گئی۔ اس لیے کہ ماچی گوٹھ کی فتح عظیم کے بعد مولانا مودودی کی خود اعتمادی میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ کوٹ شیر سنگھ کے اجتماعِ شوریٰ میں انہوں نے کمال اعتماد کے ساتھ اپنا پورا فلسفہ تنظیم و جماعت اور تصورِ قیادت و امارت کھول کر بیان کر دیا اور اس طرح گویا مولانا اصلاحی کو دوبارہ ایک کھلی دعوتِ مبارزت دیدی۔ جس کے جواب میں مولانا کو راہِ فرار اختیار کرتے ہی بنی۔ یہی وجہ ہے کہ جنوری ۵۸ء میں جماعت کی رکنیت سے مستعفی ہو جانے کے بعد جو خط و کتابت مولانا اصلاحی اور مولانا مودودی کے مابین ہوئی اس میں مولانا مودودی کا پلڑا بہت بھاری نظر آتا ہے اور وہ مولانا اصلاحی کو بار بار دلیل اور منطق کے میدان میں مقابلے کی دعوت دیتے دکھائی دیتے ہیں‘ جبکہ مولانا اصلاحی گریز اور فرار کی راہ اختیار کرنے پر مجبور نظر آتے ہیں۔ اس لیے کہ ماچھی گوٹھ کے بعد سے جماعت کی زمین اور آسمان سب بدل گئے تھے اور نئے حالات میں مولانا اصلاحی کے لیے مولانا مودودی کے سامنے آنا قطعاً ناممکن تھا! ----- اس کیفیت کا تقابل اگر اس وقت کی صورتِ حال سے کیا جائے جب مولانا اصلاحی نے مولانا مودودی کے جائزہ کمیٹی کے خلاف الزام نامے کا جواب تحریر کیا تھا تو ع ''بہ بیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا!'' کے مصداق زمین اور آسمان کا فرق نظر آتا ہے! **فاعتبروا یا اولی الابصار!**

مولانا اصلاحی سے ایک شکایت اور بھی ہے‘ اور وہ یہ کہ انہوں نے آج تک اقامت دین کے لیے قائم ہونے والی جماعت کے تنظیمی ڈھانچے اور اس میں جمہوریت اور

شورائیت کے تقاضوں کے ضمن میں اپنے تصورات کو کبھی تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے مجلس شوریٰ میں تو یقیناً اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا ہوگا۔ اور اس کے حق میں دلائل بھی دیئے ہوں گے (بلکہ مولانا کے ایک خط سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے میں کسی موقع پر دوسرے اصحابِ علم و فضل سے بھی رجوع کیا گیا تھا) تب ہی وہ پیچ در پیچ فارمولا طے پایا ہوگا جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ لیکن جماعت کے عام ارکان کے سامنے ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت کبھی نہ آ سکی۔ حالانکہ اس فارمولے کے دستورِ جماعت میں ثبت ہو جانے کے بعد اس کے حق میں کسی وضاحتی تحریر کی اشاعت ہرگز قابل اعتراض نہ ہوتی۔ پھر اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ جماعت میں شامل ہوتے ہوئے اس بحث کو پبلک میں چھیڑنا ادنیٰ درجہ ہی میں سہی، بہرحال نامناسب تھا، تب بی اس کا کیا جواب ہے کہ جماعت سے علیحدگی کے بعد بتیس سالوں کے دوران بھی مولانا نے اس موضوع پر ایک حرف تک سپرد قلم نہیں کیا کہ آئندہ کام کرنے والوں ہی کے لیے رہنمائی کا سامان فراہم ہو جاتا۔ اس کی بھی کم از کم ہمارے نزدیک دو کے سوا کوئی تیسری توجیہہ ممکن نہیں ہے، یعنی یا تو ان کے نزدیک فریضۂ اقامت دین کی سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں رہی، یا انہیں اس کی ادائیگی کے لیے قائم ہونے والی جماعت کے ضمن میں اپنے اُن نظریات اور تصورات پر اعتماد نہیں رہا جن کی بنیاد پر انہوں نے سالہا سال تک مولانا مودودی کے ساتھ وہ کشتی جاری رکھی جسے خود انہوں نے ''گربہ کشتن'' کی کوشش سے تعبیر کیا۔ ان میں سے مؤخر الذکر توجیہہ کے خلاف تو ہماری اپنی گواہی موجود ہے کہ کم از کم ۱۹۷۲ء تک تو مولانا اپنے جمہوری شورائی تصورات پر اس حد تک عازم اور جازم تھے کہ جب اُس سال مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور قائم ہوئی اور اس میں اُس کے صدر مؤسس کو ویٹو کا حق تفویض کیا گیا تو مولانا نے احتجاج کے طور پر ''میثاق'' کی پیشانی پر سے ''زیر سرپرستی مولانا امین احسن اصلاحی'' کے الفاظ ہٹوا دیئے۔ اور یہ الفاظ بھی فرمائے کہ ''اسی مسئلے پر تو میں نے مولانا مودودی سے جنگ کی تھی!''

بنابریں صرف مقدم الذکر توجیہہ باقی رہ جاتی ہے لیکن اسے تسلیم کرنے سے بھی ذہن اس لیے انکاری ہے کہ صرف اقامت دین کی اجتماعی جدوجہد ہی کے لیے تو مولانا اصلاحی

نے سرائے میر' اعظم گڑھ سے دار الاسلام' پٹھان کوٹ ہجرت کی تھی جبکہ علمی اور تعلیمی سرگرمیوں کے ضمن میں تو وہاں مدرسۃ الاصلاح اور دائرۂ حمیدیہ ایسے ادارے بھی موجود تھے' اور ان کا اپنا ماہنامہ ''الاصلاح'' بھی جاری تھا۔ مزید برآں مولانا مودودی کی اختیار کردہ اصطلاح ''قیامِ حکومت الٰہیہ'' کی جگہ ''اقامت دین'' کی اصطلاح کو تو انہوں نے ہی رواج دیا تھا' اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی معرکۃ الآراء کتاب ''دعوتِ دین اور اس کا طریق کار'' آج تک شائع ہو رہی ہے جس کے دوسرے اور اہم ترین باب ''تبلیغ کس لیے؟'' کے آخر میں اُس کی پوری بحث کے خلاصے اور لب لباب کے طور پر یہ زوردار الفاظ تا حال موجود ہیں:

''اس پوری تفصیل کا خلاصہ یہ ہے:

(ا): آنحضرت ﷺ پر تمام دنیا میں قیامت تک کے لیے تبلیغ دین کی جو ذمہ داری ڈالی گئی تھی اس کی طرف نبی کریم ﷺ نے رہنمائی فرما کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی تکمیل کا کام اپنی امت کے سپرد فرمایا' تاکہ یہ امت ہر ''ملک'' ہر قوم اور ہر زبان میں قیامت تک اس دین کی تبلیغ کرتی رہے۔

(ب): اس تبلیغ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ شرط مقرر ہے کہ یہ دل سے کی جائے' زبان سے کی جائے' عمل سے کی جائے' بلاتقسیم وتفریق' پورے دین کی کی جائے' بے خوف لومۃ لائم اور بے رورعایت کی جائے اور اگر ضرورت داعی ہو تو جان دے کر کی جائے۔

(ب): اس جماعتی فرض کی ادائیگی کا باضابطہ ادارہ خلافت کا ادارہ تھا اور جب تک یہ ادارہ موجود تھا ہر مسلمان اس فرض کی ذمہ داریوں سے سبکدوش تھا۔

(د): اس ادارہ کے منتشر ہو جانے کے بعد اس فرض کی ذمہ داری امت کے تمام افراد پر ان کے درجہ اور استعداد کے لحاظ سے تقسیم ہو گئی۔

(ھ): اب اس فرض کی مسئولیت اور ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے لیے دو ہی راہیں مسلمانوں کے لیے باقی رہ گئی ہیں! یا تو اس ادارہ کو قائم کریں یا کم از کم اس کو قائم کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائیں۔

(و): اگر مسلمان ان میں سے کوئی بات نہ کریں تو وہ اس فرضِ رسالت کو ادا نہ

کرنے کے مجرم ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے سپرد کیا گیا ہے اور صرف اپنی ہی غلط کاریوں کا وبال اپنے سر نہ لیں گے، بلکہ خلق کی گمراہی کا وبال بھی ان کے سر آئے گا۔" (صفحات ۴۶-۴۷)

الغرض، مولانا اصلاحی کا موقف پہلے کیا تھا اور اب کیا ہے؟ یہ ع "اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا!" اور ہمیں یہ باتیں لکھتے ہوئے اگرچہ قلبی اذیت محسوس ہو رہی ہے تاہم یہ سب کچھ لکھ اس لیے دیا ہے کہ ابھی ماشاء اللہ مولانا اصلاحی بقید حیات ہیں اور بحمد اللہ سوائے ایک حاسۂ سماعت کے ان کے جملہ ذہنی قویٰ سلامت ہی نہیں پوری طرح چاق و چوبند ہیں، لہٰذا اب بھی وقت ہے کہ مولانا محمد منظور نعمانی کی طرح مولانا بھی وضاحت کے ساتھ لکھ دیں کہ وہ جن تصورات کے تحت جماعت میں شامل ہوئے تھے ان میں سے کن کن سے نظری و فکری طور پر رجوع کر چکے ہیں اور کن کن پر علمی اور ذہنی طور پر قائم ہیں، خواہ کسی سبب سے عملاً کاربند نہ ہوں تا کہ مستقبل کے مؤرخ کو بھی صحیح فیصلہ کرنے میں مدد ملے اور آئندہ نسلوں کو بھی رہنمائی کا سامان حاصل ہو!!

مولانا مودودی مرحوم نے جو تقریر اولاً ماچھی گوٹھ میں "مجلس نمائندگان" کے سامنے اور بعد میں کوٹ شیر سنگھ میں مجلس شوریٰ کے اجلاس میں کی تھی اس کے مرکزی خیال یعنی ایک انقلابی جماعت میں قائد اور امیر کی حیثیت کے ضمن میں اُن کی رائے سے ہم اپنا کامل اتفاق ظاہر کر چکے ہیں۔ لیکن اس مرکزی خیال کے دائیں اور بائیں اس میں دو باتیں ایسی بھی ہیں جن سے ہمیں نہ صرف یہ کہ شدید اختلاف ہے، بلکہ فتنہ کی بُو بھی آتی ہے۔ لیکن اس وقت اُن پر مفصل بحث نہیں کی جا سکتی صرف اجمالی اشارہ ہی کیا جا سکتا ہے۔

ان میں سے ایک کا تعلق جماعت میں اختلافِ رائے کے حق اور اظہارِ رائے کی آزادی سے ہے جس کی پُر زور نفی مولانا نے اپنے مخصوص طرزِ نگارش اور خطابی انداز کو بھرپور طور پر بروئے کار لا کر اس طرح کی ہے کہ ایک عام قاری یا سامع فوری طور پر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن اگر ذرا بنظر غائر دیکھا جائے تو اس سے عقل اور نقل دونوں

تقاضے بری طرح پامال ہوتے نظر آتے ہیں اس لیے کہ یہ فہم عام (Common Sense) اور فطرتِ انسانی کے بھی خلاف ہے' اور قرآن وسنت کے اُن نصوص کے بھی منافی ہے جن میں مشاورتِ باہمی کی پُرزور تاکید کی گئی ہے۔

اور دوسرا معاملہ قائم اور امیر کی شخصیت کو ع ''پیراں نمے پرند و مریداں مے پرانند!'' کے مصداق اور مولانا کے اپنے الفاظ کے مطابق خود بنانے اور دوسروں سے بنوانے' کا ہے تاکہ اُس کی عظمت کا نقش قلوب واذہان پر قائم ہو جائے اور اس کی گہری محبت اور عقیدت دلوں میں رچ بس جائے' اور اس سلسلے میں مولانا جب تحریک کی کامیابی کی شرائط کے ضمن میں ''ایک شخصیت کے جادو'' کی اہمیت کو نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ ''اس جادو کو فروغ دینے'' کا بھی ذکر کرتے ہیں' تو اس سے شخصیت پرستی کے فتنے کے لیے نہ صرف یہ کہ دروازہ چوپٹ کھل جاتا ہے بلکہ اس کے جواز کا ایک پورا فلسفہ بھی سامنے آجاتا ہے! یہ فلسفہ مولانا کے بعض دوسرے قریبی رفقاء (بالخصوص جناب نعیم صدیقی) کے ذریعے تو بہت پہلے سے فروغ پا رہا تھا' چنانچہ 'نقض غزل' کے اب سے تیئس سال قبل کے تحریر کردہ حصے میں اس پر مفصل کلام موجود ہے (ملاحظہ فرمائیں باب سوم میں ''شخصیت گری'' کے زیر عنوان متعلقہ بحث) تاہم خود مولانا کے اپنے الفاظ میں اس کی پُرزور وکالت اسی تقریر یا تحریر کے ذریعے سامنے آئی ہے۔

بہر حال ہمارے نزدیک مولانا کے فلسفۂ تحریک کے یہ دو پہلو قائد تحریک کے اختیارات کے بارے میں ان کی رائے کے ساتھ شامل ہو کر ایک بالکل فاشسٹ جماعت کا نقشہ سامنے لاتے ہیں اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کے بارے میں ان کے بعض ناقدین اور معاندین کا یہ الزام بھی بے بنیاد نہ تھا کہ اُن کا مزاج فسطائی ہے' اور یہ اطلاع بھی غلط نہ تھی کہ انہوں نے خیری برادران سے بھرپور تاثر قبول کیا تھا جن کے ذہن اور فکر کی ساری اُٹھان نازی جرمنی میں ہوئی تھی!

بہر حال ہم مولانا کے فلسفۂ تحریک کے ان دونوں پہلوؤں سے کامل براءت کے ساتھ ساتھ اپنے اس یقین کامل کا اظہار کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلام کا عطا کردہ نظامِ

بیعت متذکرہ بالا دونوں لعنتوں کے بغیر تحریک کے جملہ تقاضے بہ احسن وجوہ پورا کرسکتا ہے اوراس میں مشاورتِ باہمی کی روح کو بھی بہ تمام وکمال سمویا جاسکتا ہے اوراختلافِ رائے کے حق اوراظہارِرائے کی آزادی پر بھی کسی قدغن کی ضرورت نہیں پڑتی۔ چنانچہ بحمداللہ تنظیم اسلامی کی صورت میں ہمارا یہ یقین واذعان ایک واقعی تجربے کی صورت میں سامنے آرہا ہے اور ہم اس پر صدقِ دل سے اللہ کا شکرادا کرتے ہوئے کہ:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدَانَا لِھٰذَا وَ مَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْ لَا اَنْ ھَدَانَا اللّٰہُ"

آئندہ کے لیے دعا کرتے ہیں:

"رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا وَ ھَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً اِنَّکَ اَنْتَ الْوَھَّابُ!"

اٰمِیْن یَا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ!!

'نقض غزل' پر ردّ عمل کا جائزہ

(تذکرہ وتبصرہ' ماہنامہ 'میثاق' جون ۹۰ء)

سالِ رواں کے جنوری اور مارچ کے شماروں میں 'نقض غزل' کی اشاعت پر حسب توقع شدید مخالفانہ' مخلصانہ و ناصحانہ اور تائیدی و وضاحتی' ہر نوع کا ردّ عمل موصول ہوا۔ آج کی صحبت میں اسی کے بارے میں کچھ عرض کرنا پیش نظر ہے۔

قارئینِ ''میثاق'' کو یاد ہوگا کہ 'نقض غزل' کی اشاعت کا زوردار داعیہ جنوری ۸۹ء میں جدہ میں بعض احباب سے گفتگو کے نتیجے میں پیدا ہوا تھا۔ جدہ کے ڈاکٹر فرحت علی برنی اور طائف کے ڈاکٹر شجاعت علی برنی سے ہونے والی اُس گفتگو کا مفصل تذکرہ اولاً ''میثاق'' فروری ۸۹ء میں ہوا تھا (صفحات ۹۲ تا ۹۵)۔ اور پھر اس کا حوالہ جنوری ۹۰ء کی اشاعت میں دیا جا چکا ہے (صفحات ۱۱ تا ۱۲)۔ اس گفتگو میں راقم الحروف کے سامنے اچانک یہ حقیقت بڑی شدت کے ساتھ آئی تھی کہ جہاں تک جماعت اسلامی پاکستان کے موجودہ طریق کار سے میرے اور تنظیم اسلامی کے اختلاف کا تعلق ہے وہ تو میری تالیف ''تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ'' کے ذریعے پوری وضاحت کے ساتھ لوگوں کے سامنے آچکا ہے۔ لیکن جہاں تک جماعت سے علیحدگی کا تعلق ہے اس کے اصل سبب کے بارے میں عوام تو درکنار قریبی مخلصین اور احباب بھی بالکل اندھیرے میں ہیں اور اس کے لیے لازم ہے کہ ''نقض غزل'' کو مکمل کر کے شائع کر دیا جائے۔

بالکل اسی نوع کا شدید احساس اِن سطور کی تحریر سے ٹھیک ایک ماہ قبل رمضان المبارک کی ایک شام کو ہوا۔ جب بعد افطار دعوتِ طعام میں جماعت اسلامی لاہور کے بعض نمایاں ارکان سے بشمول سید اسعد گیلانی صاحب ملاقات اور گفتگو کا موقع ملا۔ اس موقع پر

محترم گیلانی صاحب نے بڑے گہرے تاثر کے ساتھ فرمایا کہ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جماعت اسلامی اور تنظیم اسلامی میں سوائے ایک ملکی انتخابات میں حصہ لینے یا نہ لینے کے اور کیا فرق ہے! جس پر میں نے عرض کیا کہ'' یہ فرق معمولی نہیں بہت بڑا ہے! بلکہ اس موقع پر میری زبان سے کچھ مناسب الفاظ بھی نکل گئے تھے جن پر گہرا تأسف تو مجھے اسی وقت لاحق ہوگیا تھا لیکن فی الفور معذرت کرنے سے اندیشہ تھا کہ کہیں ''عذرِ گناہ بدتر از گناہ'' والا معاملہ نہ بن جائے' لہٰذا میں نے سکوت مناسب سمجھا' بعد میں بھی کئی بار خیال آیا کہ فون پر معذرت کرلوں لیکن اس میں بھی یہ احتمال نظر آیا کہ اس طرح ''جہر بالسوء'' کے بارِ دگر اعادہ کی صورت نہ بن جائے۔ بہرصورت اب میں بغیر ان نامناسب الفاظ کو نقل کئے گیلانی صاحب سے علی رؤوس الاشہاد معذرت کرتا ہوں ع ''گر قبول افتد زہے عزّ و شرف!)۔اس پر گیلانی صاحب نے فرمایا کہ ''انتخابات کا مسئلہ خواہ اپنی جگہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو آخر ہے تو صرف تدبیر ہی کا معاملہ!'' جس پر میں نے عرض کیا کہ: ''آپ کی بات بلکل درست ہے' اور میں ہرگز اس اختلاف کی بنا پر جماعت سے علیحدہ نہ ہوتا بشرطیکہ جماعت میں اختلافِ رائے اور اس کے اظہار کے لیے راستے کھلے رکھے جاتے!'' گیلانی صاحب نے جواباً ارشاد فرمایا کہ ''جماعت میں اختلافِ رائے کی آزادی تو موجود ہے!'' تب میں نے عرض کیا کہ ''مجھے اس بات کا جواب دیں کہ آیا ماچھی گوٹھ میں طے ہوا تھا یا نہیں کہ جماعت اسلامی کی طے شدہ پالیسی سے اختلاف رکھنے والے لوگ جماعت میں رہ تو سکتے ہیں لیکن (i) نہ بذریعہ تحریر اپنی رائے کا اظہار کر سکتے ہیں۔ (ii) نہ نجی گفتگوؤں میں اپنی رائے پیش کر سکتے ہیں۔ (iii) نہ ہی مقامی' حلقہ جاتی اجتماعاتِ ارکان میں اظہار خیال کر سکتے ہیں----- بلکہ صرف اور صرف کُل پاکستان اجماعِ ارکان ہی میں گفتگو کر سکتے ہیں! اب آپ مجھے یہ بتایئے کہ اولاً ایسا اجتماع کئی کئی سال بعد منعقد ہوتا ہے' پھر اس میں کئی ہزار افراد شریک ہوتے ہیں اور ارکان کے خصوصی اجتماع کے لیے بہت مختصر وقت ہی رکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ حالیہ کُل پاکستان اجتماع میں آپ نے صرف ایک مختصر نشست ارکان کے لیے مخصوص رکھی تھی' تو اس صورت میں اختلافِ رائے کا اظہار کیسے ممکن ہے؟'' اس پر محترم

گیلانی صاحب نے تو سکوت اختیار فرمایا لیکن حاضرین میں سے ایک سنیئر رکن جماعت نے مجھ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ’’صَدَقْتَ!‘‘۔ میں نے محترم گیلانی صاحب سے یہ بھی دریافت کیا کہ: ’’آپ ہی کے اُس انٹرویو سے جو ہفت روزہ ’’ندا‘‘ میں شائع ہوا ہے‘ مجھے یہ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر محمد امین صاحب کو جماعت سے نکالا گیا ہے‘ تو کیا آپ یہ بتانا پسند فرمائیں گے کہ ان کا ’جرم‘ کیا تھا؟‘‘ اس پر جب انہوں نے یہ تسلیم کرلیا کہ اُن کا قصور صرف یہ تھا کہ انہوں نے جماعت کی پالیسی کے بارے میں ایک سوال نامہ مرتب کر کے بعض ارکانِ جماعت کو ارسال کیا تھا تو میں نے عرض کیا کہ پھر بتایئے کہ جماعت میں اختلافی رائے کے پنپنے کا کونسا موقع ہے؟ اس پر جو خاموشی جملہ حاضرین پر طاری ہوئی اُس سے اُن کی شرافت اور متانت کا تو بہرا تاثر قلب نے قبول کیا لیکن اس ملاقات اور گفتگو سے راقم الحروف کو مزید انشراح حاصل ہوا کہ ’’نقض غزل‘‘ کی اشاعت نہایت ضروری اور لازمی تھی۔

میرے لیے ’’نقض غزل‘‘ کی اشاعت کے ضمن میں سب سے زیادہ اطمینان بخش بات یہ سامنے آئی کہ میرے بعض نہایت قریبی اور دیرینہ رفقاءِ کار نے صراحتاً تسلیم کیا کہ ’’آپ کے جماعت اسلامی سے پالیسی کے اختلاف کے بارے میں تو ہمارا ذہن بھی بالکل واضح تھا‘ اور ہمیں اس پر پورا شرحِ صدر بھی حاصل تھا‘ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جماعت سے علیحدگی اختیار کرنے کے فیصلہ پر خود ہمیں پورا انشراح حاصل نہ تھا‘ اور اس معاملے میں قلب و ذہن میں ایک دبی اور چھپی ہوئی سی خلش موجود تھی جو کبھی دُور نہ ہوسکتی اگر ’’نقض غزل‘‘ کی تکمیل اور یکجا اشاعت نہ ہوتی!‘‘

مزید برآں ذاتی طور پر میرے لیے اس سے کہیں بڑھ کر اطمینان بخش امر یہ ہے کہ ’’كُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ‘‘ (القمر:۳) کے مطابق اس کی اشاعت کی صورت میں من جانب اللہ پیدا ہوئی‘ یعنی یہ کہ تحریک اسلامی کی قیادت و امارت کے فلسفے کے موضوع پر مولانا مودودی مرحوم کی وہ تقریر جس کو میں ؏ ’’جسے میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں!‘‘ کے

مصداق سالہا سال سے تلاش کرتا رہا تھا وہ اچانک از خود ہفت روزہ ''آئین'' کے صفحات پر جلوہ گر ہو گئی جس سے جماعت اسلامی پاکستان کی تاریخ کے ۵۷-۵۶ء والے گمشدہ باب کے ضمن میں بعض سوالات جو خود راقم کے ذہن کے سامنے حل طلب موجود تھے ایک دم حل ہو گئے۔ اور اس طرح راقم ''نقضِ غزل'' کی تکمیل پورے اطمینانِ قلب اور انشراحِ صدر کے ساتھ کر سکا' اور بحمد اللہ راقم کو پورا اطمینان ہے کہ اگرچہ فی الوقت اس کی اشاعت بعض حضرات کو ناگوار گزری ہے لیکن ان شاء اللہ تحریک اقامت دین اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کی سعی و جہد کے وسیع تر تقاضوں اور مصلحتوں کے اعتبار سے اس کا منظر عام پر آنا نہایت مفید ثابت ہو گا۔ واللہ اعلم!!

اور اب آیئے ''ردِّ عمل'' کے جائزہ کی جانب!

ا۔ اس سلسلے میں شدید ترین ردعمل ان حضرات کا ہے جنہوں نے اپنی ناراضگی کے اظہار کے طور پر ''میثاق'' کی خریداری منقطع کر دی ہے' اگرچہ ایسے حضرات کی تعداد میری توقع سے بہت کم رہی تاہم ان کے جذبات کی نمائندگی ایبٹ آباد کے قاضی عبدالقدوس صاحب کے درج ذیل خط سے ہو جاتی ہے:

محترم ڈاکٹر صاحب

اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ گزشتہ دو تین ماہ سے ''میثاق'' میں ان واقعات کا تجزیہ کیا جا رہا ہے جسے آپ ''نقضِ غزل'' کے عنوان کے تحت بالالتزام شائع فرما رہے ہیں۔ عام قاری کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ آپ ''جماعت اسلامی'' کے رکن کیوں بنے' اور کن حالات اور وجوہات کی بناء پر آپ نے اس جماعت سے علیحدگی اختیار کی۔

میرا مقصد حیات تو ''خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا کَدَرَ'' ہے اچھی بات جہاں سے ملے اسے اپنایا جائے اور مکروہات سے اجتناب کیا جائے۔

ٹیلی وژن پر آپ کے دروسِ قرآن سن کر آپ کا ہمنوا بنا لیکن ''میثاق'' کے

''نقضِ غزل'' نے آپ کی حق گوئی کو واضح کر دیا۔مولانا مرحوم سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اسلام کے لیے جو کچھ کیا اس کا جواب وہ خود اپنے خالق حقیقی کے سامنے پیش ہو کر دیں گے۔رحلت کے بعد ان کے افعال پر تنقید کسی طرح بھی جائز نہیں۔کیا یہ کم ہے کہ وہ قرآن سیکھنے والوں کے لیے ''تفہیم القرآن'' کی صورت میں ایک اعلیٰ پایہ کی تفسیر اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔قرآن ہمیں ''وَاعْتَصِمُوْ بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا'' کی تلقین کرتا ہے اور امارت کے شوق میں علیحدہ جماعت بنانے سے منع کرتا ہے۔ لیکن آپ نے ''وَلَا تَفَرَّقُوْا'' سے بچنے کے لیے ''نقضِ غزل'' کے پردہ کے پیچھے پناہ لینے کی کوشش کی ہے۔

اس لیے میں بامر مجبوری درخواست کرتا ہوں کہ آئندہ مجھے ''میثاق'' کی خریداری سے معذور جان کر رسالہ ارسال نہ کیا جائے۔

ایک بار پھر اس اقدام کے لیے معذرت خواہاں ہوں۔فقط والسلام

عبدالقدوس

خریداری نمبر M-C-PK-FP-ATD-0014

قاضی صاحب موصوف اور ان کے ہم خیال حضرات سے ہمیں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ انکی رائے صائب اور فیصلہ مناسب ہے اس لیے کہ فی الواقع ''میثاق'' صرف علمی و اصلاحی یا محض دعوتی و تبلیغی جریدہ نہیں ہے' بلکہ ایک انقلابی تحریک کا ترجمان ہے اور اس تحریک کے مقتضیات اس کے لیے ہمیشہ مقدم رہتے ہیں۔ بنا بریں ایسے حضرات کا ''میثاق'' سے قطع تعلق کر لینا بالکل درست ہے جو اس تحریک سے کوئی دلچسپی یا ذہنی و قلبی مناسبت نہ رکھتے ہوں۔

۲۔ دوسرا کسی قدر نرم اور اصلاً ناصحانہ اور مخلصانہ ردّعمل جدہ' سعودی عرب سے جناب غلام فرید خاں صاحب کی جانب سے موصول ہوا ہے۔موصوف اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص (بی کام' سی پی آئی اور ایف سی آئی آئی لندن) ہیں۔اور انہی کے مانند خیالات و احساسات بعض دوسرے حضرات کی جانب سے بھی ظاہر ہوئے ہیں لہٰذا ان کا خط بھی من و عن شائع کیا جا رہا

ہے۔خان صاحب موصوف رقم طراز ہیں:

محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

اسلام علیکم۔میرا تعلق ایک دیندار خاندان سے ہےاور خود بھی دین اسلامی کی تعلیمات کی کسی حد تک معلومات رکھتا ہوں اور مزید علم وعمل کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ماحول بھی بفضلہٖ تعالیٰ تعلیم یافتہ اور اسلام کے دلدادہ افراد کا ہی رہا لہٰذا جب آپ کی دعوت کی گونج کان میں پڑی تو اُدھر بھی متوجہ ہوا۔دیگر دینی رسائل کا مطالعہ رہتا ہی تھا،آپ کا میثاق اور حکمت قرآن بھی سالانہ بنیاد پر لگوائے' جن کا مطالعہ بھی کرتا ہوں۔ابھی میثاق جنوری ۱۹۹۰ء کے مطالعہ سے فارغ ہوا ہوں اور درحقیقت یہ خط بھی جنوری کا میثاق پڑھنے کے بعد مجبوراً آپ کی خدمت میں ارسال کررہاہوں۔

ڈاکٹر صاحب!اللہ سبحانہ' وتعالیٰ نے آپ کو بڑی خوبیوں سے نوازا ہے۔فن خطابت میں فی الوقت آپ کا ثانی کوئی نہیں پھراس خداداد صلاحیت کے ساتھ ساتھ آپ کو بہترین استاد بھی میسر آئے۔خود بقول آپ کے مولانا مودودی مرحوم جیسے مفسر قرآن کا قرب آپ کو زمانۂ طالب علمی میں ہی مل گیا تھا جس نے آپ کی صلاحیتوں کو بے مثال جلا بخشی اور آپ کو کان سے نکال کر چمکدار ہیرا بنادیا۔

یقیناً مولانا مودودی مرحوم کے کئی دوسرے شاگردوں نے بھی اپنی اپنی جگہ بڑا نام پیدا کیا انھوں نے بھی جنھوں نے بالکل دنیا ہی کو اپنے مستقبل کے لیے پسند کرلیا اور انھوں نے بھی جنھوں نے آخرت کو ترجیح دی۔اول الذکر میں ...... صاحب اور......صاحب کی مثال ہےاور آخر الذکر میں امین احسن اصلاحی اور عبد الغفار حسن صاحب جو اپنے اپنے طریقہ سے دین کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ مولانا مودودی مرحوم کو جو مقام اور مرتبہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بخشا وہ اظہر من الشّمس ہے کہ ان کو عالم اسلام کا سب سے بڑا اور سب سے پہلا ایوارڈ یعنی فیصل ایوارڈ ملا۔ نہ صرف انہیں بلکہ ان کے شاگرد ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب اور ابھی حال ہی میں پروفیسر ڈاکٹر خورشید احمد صاحب کو بھی فیصل ایوارڈ سے نوازا گیا۔چند ماہ پیشتر اسلامی ڈویلپمنٹ بینک نے اپنے پندرہ سال مکمل ہونے پر معاشیات کے میدان

میں ۴۲ ممبر ممالک میں جس شخص کا انتخاب کیا وہ بھی پروفیسر خورشید احمد صاحب ہی تھے۔

مذکورہ بالا انتہائی اہم شخصیات نے کسی نہ کسی درجہ میں مولانا مودودی مرحوم سے اکتسابِ علم کیا یا ان کی صحب میں رہے‘ ان میں کئی نے اصولی اختلاف کی بنا پر اپنی راہیں بھی جدا کرلیں اور اپنے اختلاف کا برملا اظہار بھی کیا لیکن اس کے بعد یہ حضرات اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ امین احسن اصلاحی صاحب نے تصنیف و تالیف کی طرف توجہ دی اور ’’تدبر القرآن‘‘ جیسی تفسیر اور ’’تزکیہ نفس‘‘ جیسی اعلیٰ درجہ کی کتب لکھیں جو رہتی دنیا تک امت کو فائدہ پہنچاتی رہیں گی۔......صاحب نے اپنے لیے نئی راہ کا انتخاب کیا اور اس پر رواں دواں ہیں۔ خوب دنیا کمائی۔ اس طرح......صاحب بھی شروع شروع میں مولانا مودودی پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کر کے اپنی منزل کی طرف چل پڑے۔

بفضلہٖ تعالیٰ آپ نے بھی اپنے لیے خیر کا راستہ اختیار کیا لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اس کارِ خیر کے پیچھے کچھ مقابلہ بازی کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ خیال یہ تھا کہ پختگی عمر اور کثرتِ مطالعہ کے ساتھ ساتھ طبیعت میں نرمی اور ٹھہراؤ آتا جائے گا لیکن افسوس کہ آپ کے بہی خواہوں کی توقع پوری ہوتی نظر نہیں آتی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمر کی پختگی کے ساتھ ساتھ یہ جذبہ بھی مزید پختہ ہو رہا ہے۔ قابل احترام جناب ڈاکٹر صاحب آپ کو شاید خود اندازہ نہ ہو (عام طور پر آدمی اپنی کمزوری سے واقف نہیں ہوتا) کہ آپ مولانا مودودی مرحوم و مغفور کی مخالفت اور اس کے نتیجہ میں جماعت اسلامی کی مخالفت میں اخلاق کی کن کن حدود کو پھلانگ چکے ہیں۔ آپ نے مولانا مودودی مرحوم پر علمی سرقہ تک کا الزام بار بار لگایا ہے جبکہ آپ خود جو کچھ بھی فرماتے ہیں وہ ’’تفہیم القرآن‘‘ یا ’’تدبر القرآن‘‘ میں کم از کم ۹۰ فی صد ضروری مل جاتا ہے۔ البتہ لفظ ’’میں‘‘ کی تکرار اور فن خطابت آپ کا اپنا ہوتا ہے۔ دریں حالات میں سمجھتا ہوں کہ میثاق میں سوائے اس کے کہ آپ کے جذبۂ مخالفت کی تسکین ہو ایک اتحادِ ملی کے حامی‘ صلح پسند اور اکابرین ملت کی عزت کرنے والے شخص کے لیے کچھ زیادہ نہیں۔ میرے خیال میں یہ بہتر ہوگا کہ اس قسم کا خاص شمارہ کم از کم مجھے تو نہ بھیجا جائے تاکہ ذہنی اذیت سے محفوظ رہوں البتہ آپ

کے لیے میں ہمیشہ دعائے خیر کرتا رہوں گا۔ جو اکابرین ملت فوت ہو چکے ہیں وہ اپنے مالک و آقا کے پاس پہنچ چکے ہیں۔ اور اللہ ہی ان کے بارے میں بہتر جانتا ہے۔ ہم بھی ان کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ والسلام علیکم و رحمت اللہ وبرکاتہ

نیازمند غلام فرید خان

JED-063

ہمیں غلام فرید خاں صاحب کے ایک ایک لفظ سے اُن کے خلوص اور اخلاص اور نصح و خیر خواہی کا جذبہ جھلکتا محسوس ہوا ہے' اور اگر ایک آدھ جگہ تلخی کا اظہار ہوا ہے تو اُس سے بھی کسی عناد یا بغض کی بُو نہیں آتی۔ مزید برآں جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے' خان صاحب موصوف کا یہ خط بھی بہت سے حضرات کے جذبات اور احساسات کی نمائندگی کرتا ہے۔ بنابریں افادۂ عام کے لیے بعض وضاحتیں ضروری ہیں۔ امید ہے کہ خان صاحب موصوف اور ان کے طرز پر سوچنے والے حضرات ان گزارشات پر اپنے آپ کو ہماری جگہ متصور کرتے ہوئے ہمدردانہ انداز میں غور فرمائیں گے۔

راقم الحروف نے حال ہی میں ایک معروف صاحب علم و قلم سے گفتگو کے دوران اپنے بارے میں یہ ''اعتراف'' کیا کہ میرا ذہن اُس ''تصورِ فرائض دینی'' پر م متحجّر (Fossilised) ہو گیا ہے جو مجھے ابتداءً تحریک اسلامی کے اساسی لٹریچر یعنی مولانا مودودی مرحوم اور مولانا اصلاحی صاحب کی تصانیف کے ذریعے حاصل ہوا' اور بعد ازاں اس کی پوری اور نہایت تاکیدی توثیق کتابِ الٰہی اور سنت و سیرتِ رسول ﷺ کے مطالعے کے ذریعے حاصل ہوگئی۔ بنابریں میری مجبوری یہ ہے کہ میں دین کی کسی جزوی خدمت اور محض علمی و تعلیمی یا صرف تبلیغی و اصلاحی کام پر مطمئن نہیں ہوسکتا۔

میں اپنے اس فکر کے ہاتھوں اس درجہ 'مجبور' ہوں کہ جن اکابر کا ذکر آپ بطور ''اسوہ حسنہ'' کر رہے ہیں' ان کی شخصی قدر و منزلت' اور ان کی علمی یا تدریسی خدمات کے اعتراف کے باوجود میں نہ صرف یہ کہ ان کی پوزیشن کو کسی درجہ میں قابل رشک نہیں سمجھتا' بلکہ واقعہ یہ

ہے کہ میرے نزدیک اُن کے طرزِ عمل کو غیر منطقی اور نا قابل فہم ہی نہیں فراریت اور شکست خوردگی کا مظہر قرار دینا بھی غلط نہ ہوگا۔

یہ حضرات جماعت اسلامی میں شامل نہ ہوئے ہوتے تو بات اور تھی' اس صورت میں وہ جو کام پہلے سے کر رہے تھے انہیں ہی جاری رکھتے تو کسی اعتراض کی گنجائش نہ ہوتی لیکن صورتِ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے سترہ سترہ سال ایک تحریک کے ساتھ نمایاں طور پر وابستگی کی صورت میں بسر کئے' سینکڑوں بلکہ ہزاروں لوگوں کو اس تحریک کی دعوت سے متعارف کرایا چنانچہ بہت سے لوگ انہی کے زیر اثر اور انہی کی وساطت سے جماعت میں شامل ہوئے۔ اس کے بعد اگر انہوں نے کسی سبب سے جماعت سے علیحدگی اختیار کی تھی تو ان کے لیے عقلی اور منطقی طور پر مندرجہ ذیل دو راستوں میں سے کوئی ایک راستہ اختیار کرنا لازمی تھا:

ا۔ اگر اُن کے خیال میں اس تحریک کی اساسی دعوت و نصب العین ہی میں ع ''مری تعمیر میں مضمر تھی اک صورت خرابی کی!'' کے مصداق کجی تھی' گویا اُس کا بنیادی فکر ہی غلط تھا تو انہیں صاف اعتراف کرنا چاہیے تھا کہ سترہ سال قبل جب انہوں نے مولانا مودودی مرحوم کی رفاقت اختیار کی تھی تو خود انہوں نے شدید علمی اور فکری ٹھوکر کھائی تھی اور وہ محض ایک شخص کی انشا پردازی سے اس درجہ مرعوب ہو گئے تھے کہ فکری اعتبار سے زہر ہلاہل کو قند سمجھ کر نوشِ جان کر بیٹھے۔ اس اعتراف کے ساتھ لازم تھا کہ وہ جماعت کے اساسی فکر کی زہرناکی کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اس متبادل فکر کو بھی پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دیتے جس پر اب انہیں انشراحِ صدر حاصل ہوا ہے۔ اور پھر اُس کے مطابق عملی جدوجہد میں بالفعل مصروف ہو جاتے۔

۲۔ اور اگر اُن کے نزدیک جماعت کا تحریکی کر بھی بحیثیت مجموعی صحیح تھا اور اس کا ہدف بھی اصلاً درست تھا' تو ان کے لیے لازم تھا کہ معین طور پر یہ بتاتے کہ آیا جماعت کے طریق کار میں کوئی کجی آ گئی ہے' یا اس کے فلسفۂ تنظیم میں گمراہی کے جراثیم پیدا ہو گئے ہیں جن کے باعث اُن کی جماعت سے علیحدگی نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہو گئی ہے۔ اس صورت میں بھی لازم تھا کہ وہ اپنے اس اختلاف کو معین طور پر بیان کرنے

کے بعد اسی سابق نصب العین اور اساسی فکر کے مطابق صحیح طریق کار اور صحت مند اصولِ تنظیم اختیار کر کے اجتماعی جدوجہد کو جاری رکھتے!

ان دونوں میں سے کوئی بھی صورت اختیار نہ کر سکنے کے باعث جو نقصان اِن حضرات کو ذاتی طور پر پہنچا' اس صورت میں بھی کہ اُن کی حیثیت عرفی کو دھکا لگا' اور اس اعتبار سے بھی کہ ان کی خداداد صلاحیتیں اور توانائیاں سکڑ کر رہ گئیں (یہ الفاظ خود مولانا امین احسن اصلاحی کے ہیں جو انہوں نے جماعت سے علیحدگی کے دس سال بعد ۱۹۶۷ء میں اجتماع رحیم یار خاں میں ایک نئی اسلامی تنظیم کے قیام کے فیصلے کے موقع پر کہے تھے۔ (جس کا تفصیلی اقتباس اسی اشاعت میں کسی دوسری جگہ دیا جا رہا ہے)) ۔اُس پر مستزاد اور زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ ان کا وہ موقف بھی کمزور اور نا قابل اعتبار ہو گیا جو اپنی جگہ نہایت قوی اور مدلل تھا۔ اس لیے کہ جماعت اسلامی کے عام ارکان اور کارکنان کا یہ الزام ان پر درست طور پر چسپاں ہو گیا کہ اگر یہ لوگ مخلص تھے اور ان کا موقف درست تھا تو انہوں نے جماعت سے علیحدہ ہو کر اس کے مطابق اجتماعی جدوجہد کیوں نہ کی؟

قصہ مختصر یہ کہ راقم الحروف اولاً اپنے فکر کے ''**متحجّر**'' ہو جانے کے ہاتھوں 'مجبور' ہے' ثانیاً ع ''میں ہوں اپنی شکست کی آواز'' کی صورت اختیار کر کے زندہ رہنے کے 'حوصلے' سے محروم ہونے کے باعث 'معذور' ہے بنابریں اُس کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ حسب سابق اقامت دین کی اجتماعی جدوجہد کے لیے اپنا تن من دھن لگائے رکھے! اور چونکہ اُس نے نہ صرف یہ کہ عبادتِ ربّ کے تقاضوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ شہادتِ حق اور اقامت دین کے لیے اجتماعی جدوجہد کی فرضیت اور لزوم کا سبق ابتداءً تحریک جماعت اسلامی ہی سے سیکھا تھا بلکہ عمر عزیز کے دس سال بھی اس کے ساتھ بھرپور عملی وابستگی کی صورت میں گزارے تھے۔ لہٰذا اس کے لیے لازم تھا کہ معین طور پر واضح کرے کہ: (۱) اس کے نزدیک جماعت کے اساسی فکر میں کوئی کمی یا خامی تھی یا نہیں اور تھی تو کیا؟ (۲) جماعت کے طریق کار میں کوئی غلطی دَر آئی ہے تو کونسی؟ (۳) اس کے طریق تنظیم میں کوئی قابل اصلاح پہلو ہے یا نہیں اور ہے تو کونسا؟ چنانچہ میں یہ کام مجبوراً اور تحریک کے منطقی تقاضوں

کے شدید دباؤ کے تحت کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ تو عالم الغیب والشہادۃ ہے ہی' مجھے قریب سے جاننے والا ہر شخص جانتا ہے کہ یہ نہ میرا کوئی پسندیدہ مشغلہ ہے' نہ وقت گزاری کا بہانہ' بلکہ میرے عین مقصدِ حیات کا تقاضا ہے جسے میں ادا نہ کروں تو گویا اپنی معنوی موت کے وارنٹ پر خود دستخط ثبت کر دوں گا۔ اس لیے کہ میرے پاس ؎

ماہم بہ لاغ و لابہ تسلا شویم کاش

ناداں زبزمِ دوست چہ خوشنود می رود!

کے مصداق اپنے ضمیر کو تھپکیاں دے دے کر سلا دینے کا کوئی بہانہ موجود نہیں ہے!!

کاش کہ میرے ناصح اور خیر خواہ حضرات ع ''وزدرونِ من نہ جُست اسرارِ من'' پر عمل پیرا ہونے کے بجائے میرے معاملے پر ہمدردانہ غور کر سکیں!

محترم غلام فرید خاں صاحب کے خط میں ایک بات البتہ مغالطہ آمیز ہے جس کی وضاحت ضروری ہے' اور وہ یہ کہ میں نے کبھی مولانا مودودی مرحوم پر علمی سرقہ کا الزام عائد نہیں کیا۔ ویسے بھی علم اور حکمت کسی کی میراث نہیں ہیں۔ اور اس میدان میں سب جانتے ہیں کہ چراغ سے چراغ روشن ہوتا چلا آیا ہے۔ مولانا مودودی مرحوم کے بارے میں میرا یہ احساس ضرور رہا ہے اور اسے میں نے بعض مواقع پر بیان بھی کیا ہے کہ انہوں نے اپنے اساسی فکر کے ضمن میں جن اکابر سے کسب فیض کیا اُن کے ذِکر اور شکر کا حق ادا نہیں کیا۔ رہا خود میرے اپنے فکر میں مولانا کے خیالات کا انعکاس تو اس کا اعلان واعتراف تو میں نے ہمیشہ ڈنکے کی چوٹ کیا ہے' یہاں تک کہ یہ الفاظ بھی تحریر کئے ہیں کہ ''میں نے جماعت اسلامی کی گود میں آنکھ کھولی ہے اور جس طرح ایک بچہ سب کچھ اپنی ماں سے سیکھتا ہے اسی طرح میں نے ان حضرات (مولانا مودودی مرحوم اور مولانا امین احسن اصلاحی) کی آنکھوں سے دیکھنا' ان کے کانوں سے سننا' ان کے دماغوں سے سوچنا اور ان کی زبانوں سے بولنا سیکھا ہے'' (تحریک جماعت اسلامی صفحہ ۱۴۱) ع ''پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں!''۔

۳۔ مندرجہ بالا دونوں خطوط کے بالکل برعکس' اور مولانا مودودی مرحوم اور جماعت اسلامی کے ساتھ انتہائی نفرت و عناد کا مظہر ردعمل رحیم یار خاں کے جناب ارشاد احمد علوی کے خط میں سامنے آیا ہے' ان کے خط میں مندرجہ بالا دو خطوط میں سے پہلے خط کے مانند تیزی اور تندی بھی ہے' اور دوسرے خط کے انداز میں (اگرچہ بالکل متضاد نقطۂ نظر سے) نصیحت اور فہمائش بھی!! واضح رہے کہ علوی صاحب بھی جماعت اسلامی کے سابق ارکان میں سے ہیں' اور ان کا یہ خط بھی ایک پورے مکتب فکر کی نمائندگی کرتا ہے:

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

۲۰ سال بعد آپ پھر ''غزل سرا'' ہوئے۔ باسی کڑھی میں ابال آیا۔ اب بے وقت کی راگنی سے فائدہ؟ بر وقت آپ لوگوں نے اپنا فرض ادا نہ کیا۔ جو لوگ راز ہائے درونِ پردہ سے واقف تھے ان پر لازم تھا کہ وہ جماعت کے مخلصین کو صحیح صورتِ حال سے آگاہ کر دیں۔ مگر اُس وقت آپ نے' حکیم اشرف صاحب نے اور دیگر نے بے خبروں کو بے خبر رکھنا ہی مناسب سمجھا۔ آپ نے ہمت کی ''نقض غزل'' کی قسطیں شروع کیں مگر کوئی ''بزرجمہر'' اسی طرح آپ کے آڑے آ گیا جیسے آپ شیخ جمیل الرحمٰن اور مولانا وصی مظہر ندوی کے آڑے آ گئے تھے۔ آپ لوگوں نے بعض حکیموں کے ''صدری نسخوں'' کی طرح اس اجتماعی امانت کو بھی اپنے سینہ میں دفن رکھا۔ اب جوش دکھانے کا فائدہ؟

جن شرمناک تفصیلات اور افسوسناک حقائق سے آپ واقف ہیں' اس کے بعد تو آدمی کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ ع ''جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں'' مگر آپ کا حال ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آپ ہر وقت اسی گم کردہ راہ قافلہ میں شامل ہونے کے لیے بے چین رہتے ہیں۔ کئی بار آپ اظہار کر چکے ہیں اور ابھی گزشتہ دنوں پھر یہ بات دہرائی کہ آپ ساتھیوں سمیت جماعت میں شامل ہونے کے لیے تیار ہیں۔ بس ذرا طریق کار کو بدل لیں۔

محترم! طریق کار کا اختلاف کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے۔ اصل چیز بنیادی عقائد اور دینی فکر ہے۔ ان کی فکر ٹیڑھی ہے۔ یہ الحاد کا شکار ہیں۔ یہ لوگ خدا کے دین کو سیاسی عینک سے دیکھتے ہیں اور ہر بات کا سیاسی مفہوم نکالتے ہیں۔

''حکمت عملی'' کے خود ساختہ اصول کے تحت دین حق میں ترمیم و تنسیخ کی جرأت کرتے ہیں۔اور رسولِ خدا ﷺ کے سوا کسی کو تنقید سے بالاتر نہیں سمجھتے۔ چنانچہ تمام خادمانِ دین' بزرگان' اسلاف حتیٰ کہ صحابہ کرامؓ اور انتہاء یہ کہ انبیاءؑ عظام سب کو تنقید کا نشانہ بنایا۔صرف ''رسولِؐ خدا'' کو معاف رکھا۔ اس کے علاوہ صرف مودودی صاحب کی ذات کو ''چھوٹی موٹی'' بنایا ہوا ہے۔ان پر نہ صرف یہ کہ تنقید نہیں کرتے بلکہ تنقید برداشت بھی نہیں کرتے۔شاید ''حضرت'' کو بھی ''رسولِؐ خدا'' سمجھتے ہوں۔اس دینی فکر کے ہوتے ہوئے طریق کار کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔

صحابہ کرامؓ پر کذابوں' دجالوں اور رافضیوں کے لگائے ہوئے تمام بہتانات کی تائید کر کے اور خود بھی دو چار بہتان جڑ کر مودودی صاحب نے اپنی اصلیت ظاہر کر دی۔ اس کے بعد بھی کوئی صاحب ایمان شخص مودودی صاحب یا ان کے اندھے مقلدین کے بارے میں کوئی حسن ظن رکھتا ہے تو وہ خود بھی مشکوک ہے اور یہی آپ کی وہ خامی ہے جس نے آپ کی تمام تر صلاحیتوں اور دینی خدمات کے باوجود آپ کو مشکوک بنا رکھا ہے۔آپ ابھی تک ''بُت مودودی'' کے پجاری ہیں۔ آپ کی دینی بصیرت کیا ہے کہ آپ اس شخصیت کو تا حال نہیں پہچان سکے۔اگر تمام حقائق کے باوجود آپ اس گمراہ جماعت کا حصہ بننا چاہتے ہیں تو بسم اللہ کیجئے۔دیر کیا ہے ؏ ''پہنچے گی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر ہے'' (تصرف کے لیے معذرت)۔

آپ ایسے باخبر شخص کے لیے تو ضروری تھا کہ پوری جرأت کے ساتھ اس لائن سے اظہار برأت کر دیتا۔کم از کم درجہ یہ تھا کہ سو فی صد نظر انداز کر کے پوری یکسوئی کے ساتھ دین حق کی خدمت کرتے رہیں۔مگر آپ بہانہ بہانہ سے مودودی صاحب کی ذات اور ان کی جماعت کا تذکرہ ضرور کرتے ہیں۔ اپنا اخلاص' نیازمندی اور خدمات گنواتے ہیں۔ میرے محترم! آپ الٹے بھی لٹک جائیں تو وہ کبھی نہیں مانیں گے الاّ یہ کہ آپ بھی ان کی طرح اندھے مقلد بن جائیں۔

صحیح العقیدہ مسلمانوں کو آپ سے خطرہ یہ رہتا ہے کہ جس طرح آپ کے پیرو مرشد مودودی صاحب نے خالص دین کے نام پر قوم کا مکھن جمع کیا اور اسے شیعیت کے قدموں میں لے جا کر ڈال دیا اب آپ بھی بچا کھچا مکھن اپنے گرد دین کے نام پر جمع کر کے مودودیت کے قدموں میں لے جا کر ڈال دیں گے۔ کاش!

آپ اس دلدل سے نکل سکتے۔ یکسو ہو جاتے۔ صحابہ کرام پر بہتانات لگانے والوں سے ذرہ بھر بھی دلچسپی نہ رکھتے۔ خدا کے لیے محترم! اپنے آپ کو سنبھالیں۔ ''اُسی عطار کے لونڈے'' سے دوا لینے کا خیال ترک کر دیں جس کے سبب ''بیمار'' پڑے ہیں۔ اللہ تعالیٰ توفیق سے نوازیں۔ آمین

والسلام آپ کا خیر خواہ

ارشاد احمد علوی

محترم ارشاد احمد علوی اور ان کے ہم خیال حضرات کی خدمت میں کچھ گزارشات پیش کرنے کے بارے میں کچھ سوچتے ہوئے اچانک ذہن اس بات کی طرف منتقل ہوا کہ تقریباً ایک ماہ پیشتر پشاور سے خیبر میڈیکل کالج کی ایک طالبہ کا خط موصول ہوا تھا جس میں انہوں نے مولانا مودودی مرحوم اور تفہیم القرآن کے بارے میں بعض علماء کرام کی آراء کے حوالے سے اپنے لیے رہنمائی چاہی تھی۔

آں عزیزہ کو جو جواب راقم نے ارسال کیا تھا' مناسب محسوس ہوتا ہے کہ اس مقام پر اسی کو من وعن درج کر دیا جائے ----- وھو ھٰذا:-

''آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ مولانا مودودی مرحوم کی شخصیت کے دو پہلو تھے: ایک یہ کہ وہ ایک عالم' مفکر اور مصنف تھے' اور ان کی علمی آراء اور نظریات میں صحیح چیزیں بھی ہیں اور غلط بھی۔ چنانچہ جہاں انہوں نے اسلام کے سماجی اور سیاسی اور کسی حد تک معاشی نظام کی وضاحت میں بہت وقیع خدمات سرانجام دیں' وہاں انبیاء کرامؑ اور صحابہ کرامؓ کے تذکرہ میں اُن کا قلم عام طور پر بھی بے باک ہو جاتا ہے' اور بالخصوص ان کی تصنیف ''خلافت وملوکیت'' تو بہت ہی گمراہ کن کتاب ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ ایک تحریک کے داعی تھے اور انہوں نے اقامت دین کی جدوجہد اور غلبہ دین کے لیے جہاد کی فرضیت کو خوب سمجھا اور سمجھایا۔ میری ان سے اصل دلچسپی اسی پہلو سے ہے۔ اور میں اپنی دعوت اور تحریک کا تعلق ان ہی کی دعوت اور تحریک کے ساتھ جوڑتا ہوں۔ البتہ مجھے صدمہ ہے کہ انہوں نے ۴۷ء میں قیامِ پاکستان کے بعد اپنے ہی اصولی موقف سے انحراف اختیار کر لیا! یہاں یہ بات بھی واضح ہو جائے تو اچھا ہے کہ ہمارے قدیم مذہبی نظامِ تعلیم سے وابستہ علماءِ کرام کی

اکثریت فریضۂ اقامت دین کی اہمیت سے غافل ہے۔ چنانچہ انہیں مولانا مودودی مرحوم کی برائیاں تو نظر آتی ہیں، خوبیاں بالکل نظر نہیں آتیں۔

بہر حال آپ کی طلب صادق ہے۔ اللہ تعالیٰ سورۂ عنکبوت کی آخری آیت میں وارد شدہ پختہ وعدے کے مطابق آپ کو ضرور ہدایت دے گا۔ تفہیم القرآن آپ ضرور پڑھیں لیکن اس کے ساتھ حضرت شیخ الہندؒ کا ترجمہ اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے حواشی بھی لازماً مطالعہ میں رکھیں۔ اس سے تفہیم کے ممکنہ مضر اثرات کا ازالہ ہو جائے گا۔ البتہ دین کا تحریکی تصور آپ کو تفہیم کے علاوہ کسی اور تفسیر سے نہیں ملے گا''۔

اسی تسلسل میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایسی شخصیت کا 'ردّعمل' بھی سامنے آجائے جسے حلقہ دیوبند کے اکابر علماء کے ساتھ صرف محبت اور عقیدت ہی کا نہیں قریبی تعلق اور ذاتی روابط کا شرف بھی حاصل ہے۔ ان کے مختصر لیکن نہایت معنی خیز ''ردعمل'' کی اہمیت واضح نہیں ہوگی اگر ان کا ذاتی تعارف سامنے نہ آجائے، جو حسنِ اتفاق سے خود اُن کے اپنے ہاتھ لکھا ہوا موجود ہے۔ یہ اُن کے اُس طویل مکتوب میں شامل تھا جو ''میثاق'' کی جنوری ۸۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ جو حسب ذیل ہے:

''دہلی کا رہنے والا ہوں۔ ولادت ۱۹۲۸ء میں ہوئی۔ ننہیال ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے خاندان سے متعلق ہے۔ والد صاحب حضرت شیخ الہندؒ سے نسبت رکھتے تھے۔ خلافت کے زمانہ سے پریکٹس چھوڑ کر تجارت اور انکم ٹیکس کے مقدمات کی پیروی تک محدود رہ گئے تھے۔ نہایت دین دار اور متقی بزرگ تے۔ حج سے فراغت کے ایک سال بعد ۱۹۴۵ء میں وفات پا گئے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی وفات کے بعد حضرت تھانویؒ سے تعلق بڑھا لیکن بیعت نہ ہوئے اور آخر میں مولوی محمد الیاس صاحبؒ بانی جماعت تبلیغ سے عشق کی حد تک تعلق تھا۔ ہم تین بڑے بھائی حافظ ہوئے اور عربی، فارسی کے عالم بھی۔ ساتھ ہی ضرورتِ وقت کے پیش نظر انگریزی تعلیم سے بھی بے بہرہ نہ رہے۔ یہ شاید اس کا اثر تھا کہ سابق وزیر و وائس چانسلر ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی کے تعلیمی دَور میں دہلی میں میرے والد

صاحب ہی ان کے سرپرست ونگران تھے۔ میں نے دورۂ حدیث حضرت مفتی اعظم محمد کفایت اللہ صاحبؒ اور شیخ الاسلام مولوی سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کے زیر سایہ مکمل کیا، تفسیر میں مولوی محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ میرے استاد تھے۔ درسِ نظامی میں ان حضرات کے علاوہ مولوی اشفاق حسین صاحب کاندھلویؒ اور مولوی شریف اللہ صاحبؒ (یہ دونوں حضرات مولوی ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اور مولوی اخلاق حسین صاحب قاسمی کے بھی استاد تھے) بھی شامل تھے۔ قاسمی صاحب مجھ سے نسبتاً سنیئر تھے وہ میرے بڑے بھائی صاحب کے ساتھ کے ہیں۔ میں نے حفظ قرآن کے بعد تجوید اور پھر سبعہ قرأت وغیرہ کی بھی تکمیل کی۔ میری علمی، دینی اور ذہنی تربیت مولوی محمد کفایت اللہ صاحبؒ اور مولوی قاری محمد طیب صاحبؒ (بعد میں یہ دونوں حضرات رشتہ میں میرے سمدھی بھی بنے) مولوی سید حسین احمد صاحبؒ مدنی جو میرے شیخ اور مشفق استاد بھی تھے، مولوی محمد الیاس صاحبؒ ، مولوی ابو الکلام آزاد صاحب، مولوی احمد سعید صاحب، مولوی حفظ الرحمٰن صاحبؒ سیوہاروی اور قطب وقت حضرت مولوی عبدالقادر صاحبؒ رائپوری جیسے اکابر کی نگرانی میں ہوئی۔ حاشا یہ خودستائی نہیں بلکہ تحدیث نعمت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ ان سب کی ہی خصوصی محبتیں، شفقتیں اور قربتیں مجھے نصیب رہیں۔ **فللّٰہ الحمد علیٰ ذٰلك!**''

اس ''طویل'' تعارف کے بعد 'نقض غزل' پر موصوف کا 'مختصر' تبصرہ ملاحظہ ہو:

بلی ماراں، دہلی نمبر 6

ہفتہ ۳/رمضان المبارک ۱۴۱۰ھ ۳۱/مارچ ۱۹۹۰ء

محترم المقام زید مجدکم!

السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ **متعنا اللّٰہ بطول بقائکم**

مزاج سامی!

شعبان کی آخری تاریخوں میں دہلی واپس لوٹنے پر ''میثاق'' نظرنواز ہوا۔ تین ماہ کے پرچے پیش نظر رہے۔ ''حکمت قرآن'' کا صرف مارچ کا ہی شمارا ملا۔ جنوری و فروری کے پرچے نہیں ملے۔ ''نقض غزل'' بلا استیعاب پڑھا۔ اس ترشی نے تو

جماعت اسلامی کا تمام ہی نشہ اتار دیا۔ گویا بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا۔ میں نے بالمشافہ بھی عرض کیا تھا آپ ڈاکٹر نہ بنتے تو اچھے بیرسٹر بنتے۔ صغریٰ کبریٰ کی بساط کس سلیقہ سے جماتے ہیں، پھر نتائج پر سر نہ دھنا جائے تو کیا کیا جائے؟

ایں کار از تو مأید و مرداں چنیں کنند

تنظیم اسلامی کے سلسلے میں آپ کا ویٹو کا حق ہمیشہ دل میں کھٹکتا تھا، ''نقض غزل'' پڑھنے سے کل طور پر شرحِ صدر ہو گیا اور آپ کی مصلحت دل میں اتر گئی اور آپ کی پیش بینی کا اور بھی سکہ جم گیا۔ شاید ذوق کا شعر ہے ؎

نگہ نہیں حرف دل نشیں تھا، دہن کی تنگی سے تنگ ہو کر
جو نکلا آنکھوں کے راستے سے تو دل میں اترا خدنگ ہو کر

نیاز مند
اختر ہاشمی

==========================

اور اب آیئے بعض ایسے امور کی جانب جن میں کسی غلطی کی تصحیح یا کسی واقعہ کی تردید، یا بعض ذاتی وضاحتیں شامل ہیں۔

۱۔ ان میں سے ایک تصحیح زبانی موصول ہوی۔ چنانچہ بھائی اللہ بخش سیال صاحب نے بتایا کہ وہ ترکستانی قاری صاحب جنہوں نے ماچھی گوٹھ کے اجتماعِ ارکان میں میرے خلاف سب سے پہلے احتجاج کیا تھا فوت نہیں ہوئے بلکہ بحمد اللہ بقید حیات ہیں۔ دراصل وہ اجتماعِ ماچھی گوٹھ کے فوراً بعد (غالباً سردار محمد اجمل خاں لغاری مرحوم سے ناراض ہو کر) رحیم آباد سے نقل مکانی کر گئے تھے۔ غالباً اسی سے میرے ذہن میں تاثر پیدا ہوا کہ شاید ان کا 'انتقال' ہو گیا ہے۔ بہر حال میں اُن کا تذکرہ اچھے ہی الفاظ میں کیا تھا۔ اور اب قارئین ''میثاق'' کو یہ اطلاع دیتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ موصوف واپس رحیم آباد تشریف لا کر حسب سابق بچوں کو قرآن مجید پڑھانے کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔

۲۔ دوسری مختصر وضاحت کراچی کے جناب محمد اختشام الدین صاحب کی جانب سے

موصول ہوئی ہے جو درج ذیل ہے:

محترمی ومکرمی ڈاکٹر صاحب السلام علیکم

امید ہے کہ آپ بخیر وعافیت ہوں گے۔ مارچ کا میثاق نظر سے گزرا۔ صفحہ ۹۴ پر میرا نام آپ نے اُن حضرات میں شامل تحریر فرمایا ہے جو اختلاف کی بنا پر جماعت اسلامی سے علیحدہ ہوئے۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ میں چونکہ سرکاری ملازم تھا اور جماعت نے فیصلہ کیا تھا کہ سرکاری ملازمین کو رکن جماعت نہیں رکھا جائے گا اس بنا پر مجھے جماعت سے مستعفی ہونا پڑا۔ امید ہے کہ آپ ریکارڈ درست فرمالیں گے اور آئندہ ماہ کے میثاق میں اس کی تصحیح شائع فرمادیں گے۔ شکریہ

محمد احتشام الدین

سابق رکن جماعت اسلامی پاکستان

اس سلسلے میں اتنی ''وضاحت'' ہماری جانب سے بھی ضروری ہے کہ کراچی میں ۵۹-۵۸ء کے دوران راقم نے موصوف کو ہمیشہ ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی مرحوم کے حلقے میں کسی نئی تعمیر و تنظیم کے ضمن میں ہونے والے مشوروں میں شریک دیکھا تھا جس کی بنا پر یہ گمان ہوا کہ جماعت کی پالیسی کے ضمن میں ان کا موقف بھی وہی ہے جو دوسرے علیحدہ ہونے والے لوگوں کا ہے۔ لطف یہ ہے کہ اپنے اس خط میں بھی انہوں نے ایک واقعاتی تصحیح تو کی ہے لیکن اس اہم اور بنیادی امر کی تردید نہیں کی!!

۳۔ تیسری قدرے طوالت طلب وضاحت یا تصحیح جدہ، سعودی عرب سے جناب صبا حسنی صاحب کی جانب سے موصول ہوئی ہے' اُن کا گرامی نامہ بھی مِن وعَن شائع کیا جا رہا ہے:

محترمی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب! السلام علیکم

جس ''میثاق'' کا شدت سے انتظار تھا کل ہی موصول ہوا۔ ''نقض غزل'' کی جہاں بہت سی باتوں سے مجھے اتفاق نہیں وہیں ایک بات تو ایسی ہے جو بالکل خلافِ واقعہ ہے۔ میں اس طرف متوجہ کرانا ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ نے ص ۳۹ پر ''حقیقی عزائم'' کے تحت جو واقعہ چودھری غلام محمد صاحب مرحوم کی طرف منسوب کیا

ہے چودھری صاحب نے میرے استفسار پر اس کی حلفیہ تردید کی تھی۔ امید ہے آپ اسے بھی اپنے رسالہ میں شائع فرمائیں گے۔

بات یوں ہوئی کہ یہی واقعہ ۱۹۶۶ء کے ''میثاق'' میں بھی چھپا تھا۔ ''میثاق'' کا شروع سے میں خریدار رہا ہوں۔ میں نے جب پڑھا تو یہ بات مجھے انہونی سی محسوس ہوئی۔ طبیعت مضطرب ہوئی' میں کراچی کے دفتر جامعت پہنچا تا کہ اس کی تحقیق کروں۔ چودھری صاحب موجود تھے۔ اُن کے پہلو میں کرسی پر جناب صادق حسین صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ میں نے چودھری صاحب کے سامنے ''میثاق'' رکھتے ہوئے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ پڑھنے کے بعد چودھری صاحب نے دراز سے قرآن مجید نکالا اور اس پر ہاتھ رکھ کر کہا: ''صبا صاحب یہ بالکل جھوٹ ہے۔ ان لوگوں کو ذرا خدا کا خوف نہیں۔ مخالفت میں اندے ہو گئے ہیں''۔ میں نے کہا کہ پھر اس کی تردید اخبار میں آنی چاہیے تو فرمایا: ''کس کس بات کی تردید کی جائے۔ اس جیسی نہ جانے کتنی باتیں ہیں۔ صبر سے کام لیجئے اور اللہ کے حوالے کر کے مثبت کام میں لگے رہیئے''۔

یہ بات میں خدا کو شاہد گردانتے ہوئے بیان کر رہا ہوں۔ ہوسکتا ہے الفاظ میں ردّ و بدل ہو مگر مفہوم بالکل یہی تھا۔ مجھے آج تک وہ منظر اور چودھری صاحب کا انداز یاد ہے جیسے ابھی کل کی بات ہو۔ میں ان کی ہدایت کے مطابق اسے نظر انداز کر گیا تھا لیکن آپ نے ان باتوں کا پھر اعادہ کیا ہے جس سے ساری بھولی بسری باتیں ذہن میں تازہ ہو گئیں اور اس وقت کے تاثرات اور اضطرابی کیفیت پھر عود کر آئی۔ کاش آپ ان سب کو دفن کر کے اپنے مثبت کاموں میں لگے رہتے اور بنائے کہنہ کو ویران کرنے میں قوت ضائع کرنے کی بجائے تعمیر نو پر صَرف کرتے تو مفید ہوتا۔

خیر اندیش

صبا حسنی

ص۔ب۔ ۷۴۳۶۔ جدہ

اس ضمن میں کسی قال واقول کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ چوہدری

غلام محمد مرحوم عرصہ ہوا کہ فوت ہو چکے' اب ان کے بارے میں کچھ عرض کرنا مناسب نہیں' ویسے بھی معاملہ اصلاً ان کے اور مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کے مابین تھا اور ہم نے ان ہی کی روایت کے حوالے سے درجِ ''میثاق'' کیا تھا۔ اور وہ بحمد اللہ بقید حیات ہیں۔ اب اگر وہ مناسب سمجھیں اور ''احقاقِ حق'' اور ''ابطالِ باطل'' کی ذمہ داری اداء کرنا ضروری خیال فرمائیں تو ''میثاق'' کے صفحات حاضر ہیں۔ اور اگرچہ ان کی جانب سے اب تک کا سکوت توثیق ہی کے مترادف ہے تاہم اگر وہ اس واقعے کی تردید کر دیں تو خدا گواہ ہے کہ سب سے زیادہ خوشی ہمیں ہوگی۔

البتہ ذاتی وضاحت کے ضمن میں عرض ہے کہ اس واقعے کی بروقت تصحیح یا تردید کرنے سے احتراز کر کے چوہدری صاحب مرحوم نے بھی غلطی کی تھی اور خود صبا حسنی صاحب نے بھی۔ اس لیے کہ ہمارا یہ طرزِ عمل ان دونوں حضرات کی نگاہوں سے مخفی نہیں ہو سکتا کہ ۶۷-۶۶ء میں جب ''نقض غزل'' کی اشاعت جاری تھی ایک تصحیح سید صدیق الحسن گیلانی مرحوم کی جانب سے موصول ہوئی تی جسے ہم نے بتمام وکمال شائع کر دیا تھا حالانکہ وہ معاملہ چنداں اہم نہ تھا' تو اگر اُس وقت یہ تصحیح یا تردید بھی موصول ہو جاتی تو کیوں شائع نہ ہوتی۔ جبکہ یہ معاملہ نہایت اہم اور فیصلہ کن حیثیت کا حامل تھا۔ چنانچہ ہم اپنی اس صفائی کے ثبوت میں ''میثاق'' بابت جون ۶۷ء سے گیلانی صاحب مرحوم کا خط اور اس پر اپنا تبصرہ من وعن نقل کر رہے ہیں:

> محترم صدیق الحسن گیلانی' سابق امیر جماعت اسلامی حلقہ راولپنڈی وحال انچارج شعبہ پارلیمانی امور مرکز جماعت اسلامی' اچھرہ' تحریر فرماتے ہیں:
>
> ''آپ نے ''میثاق'' میں ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا ہے جس میں آپ نے دس بارہ سال پہلے کے کچھ واقعات بیان فرمائے ہیں۔ دسمبر ۱۹۶۶ء کے ''میثاق'' میں صفحہ ۳۸ پر میرا ذکر آیا ہے اور آپ نے لکھا ہے کہ ملک سعید صاحب کو بی معطل کرنے کا ارادہ کیا گیا تھا۔ لیکن ملک صاحب بہت ہوشیار آدمی تھے۔ میرا ارادہ بھانپ کر پہلے ہی پریس کانفرنس کر کے مستعفی ہو گئے۔ اور جماعت پر سنگین الزامات لگائے۔ اصل واقعات یوں ہیں کہ میں نے ملک سعید صاحب کی رکنیت

بہت پہلے معطل کر دی تھی۔ حکیم عبدالرحیم اشرف وغیرہ کے معاملات بہت بعد میں پیش آئے ہیں۔ رکنیت سے معطّلی کا فیصلہ اور چارج شیٹ ملک صاحب کی خدمت میں بھی ارسال کر دی تھی اور مرکزی دفتر کو بھی بھیج دی گئی تھی۔ محترم امیر جماعت نے مولانا عبدالغفار حسن صاحب اور محمد باقر خاں مرحوم پر مشتمل ایک ٹربیونل مقرر کر دیا تھا اس ٹربیونل نے چارج شیٹ کی ایک نقل ملک صاحب کو دوبارہ دی اور چند روز کی مہلت دے کر تاریخ مقرر کر دی تاکہ ملک صاحب چارج شیٹ کا جواب دے سکیں۔ جس تاریخ کو انہیں ٹربیونل کے سامنے پیش ہو کر جواب دہی کرنا تھی اسی روز انہوں نے پریس کانفرنس کر کے جماعت سے تعلق منقطع کر دیا۔

آپ کو اگر ایڈمنسٹریشن کا کچھ تجربہ ہوا ہو تو آپ کو معلوم ہو گا کہ بہت سی ضابطہ کی کارروائیاں ہر ایڈمنسٹریشن چلانے والے آدمی کو کرنا پڑتی ہیں اور بسا اوقات اپنے دوستوں کے خلاف بھی کرنا پڑتی ہیں۔ ضابطہ کی کارروائیوں میں ذاتی رجحانات اور خیالات' دوستی اور مخالفت کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ کارروائیاں علی الاعلان تمام کارکنوں کے سامنے ہوتی ہیں اور نظم بالا کو بی ان پر غور کرنا ہوتا ہے۔ اگر بے جا کارروائی ہو تو خود کارروائی کرے والا بھی مطعون ہوتا ہے۔ ایسی کارروائیوں کو بدنیتی پر مبنی قرار دینا میری ناقص رائے میں بہت بڑی زیادتی ہے بلکہ ظلم عظیم ہے۔ میں نے ہمیشہ ضابطے کی ہر کارروائی اپنے ایمان وضمیر کے مطابق کی ہے اور کبھی اپنے ذاتی رجحان کو کسی کارروائی کی بنا نہیں بنایا۔ یہ ملک صاحب کی صوابدید تھی کہ انہوں نے ٹربیونل کے سامنے پیش ہونے سے گریز کیا اور مستعفی ہو گئے۔

''پ۔ ن: ملک صاحب کو ذاتی طور پر مجھ سے یا مجھے ان سے کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ ہم دونوں نے قومی اسمبلی کا الیکشن مارشل لاء کے دَور میں ۱۹۶۲ء میں لڑا تھا اور دوستانہ ماحول میں الیکشن کے کام کئے۔ مجھے صرف ۴۶ ووٹ ملے تھے اور انہیں صرف ۹ ووٹ مل سکے۔ شاید اس لیے کہ وہ الیکشن کو ناجائز سمجھ کر کام کر رہے تھے اور ناجائز ذرائع بھی اسی لیے استعمال کر رہے تھے''۔

مندرجہ بالا وضاحت اگرچہ زیادہ تر ایک اجمال کی تفصیل کی نوعیت کی ہے تاہم قارئین ''میثاق'' کی خدمت میں پیش ہے تاکہ وہ ''نقض غزل'' کے متعلقہ مقام کی 'تصحیح' فرما لیں۔ رہی نیک نیتی اور بدنیتی کی بحث تو اس معاملے میں ع ''ہم

اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی'' کی صورت بن جائے گی۔ جہاں ''حکمت عملی'' کے خوش نما الفاظ کے پردے میں "End Justifies Means" کے نظریئے کو جوں کا توں اپنا لیا گیا ہو وہاں ''نیت'' کے مسئلے پر گفتگو محض وقت کا ضیاع ہے۔

''پس نوشت'' میں گیلانی صاحب نے بلا ضرورت و بے محل ملک سعید صاحب پر کیچڑ اچھال کر دل کی بھڑاس نکالنے کی جو کوشش فرمائی ہے وہ کسی طرح داعیانِ ''اقامت دین'' کے شایانِ شان نہیں۔ اس سلسلے میں اگر کوئی وضاحت ملک صاحب کرنا چاہیں تو ''میثاق'' کے صفحات حاضر ہیں۔

بہرحال ہم نے جناب صباحسنی کی یہ تصحیح یا تردید بھی شائع کردی ہے اگرچہ وہ دنیا کے ہر قاعدہ وقانون کے اعتبار سے 'Time-Barred' ہے۔

۴۔ آخری ''طویل'' اور ''دلچسپ'' وضاحت جناب مصطفیٰ صادق صاحب کی جانب سے اس اصرار کے ساتھ موصول ہوئی ہے کہ اسے ضرور شائع کردیا جائے۔ چنانچہ ان کی مکمل تحریر بھی ہدیہ قائین کی جارہی ہے:

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

''میثاق'' کے شمارہ مارچ ۱۹۹۰ء میں اجتماع ماچھی گوٹھ میں میری تقریر کے حوالے سے جو باتیں آپ نے شائع کی ہیں مجھے ان کی اشاعت پر اس لحاظ سے سخت صدمہ ہوا کہ میں آج تک ان باتوں کو اس انداز میں شائع کرنا یا شائع کرانا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اس موضوع پر آپ سے میری گفتگو ہوئی تی' اس میں بھی میں نے یہ گزارش کی تھی کہ اجتماع ماچھی گوٹھ سے واپسی کے بعد اُس وقت تک کے قیم جماعت اسلامی محترم میاں طفیل محمد صاحب نے مجھ سے اپنی اس تقریر کا مکمل متن طلب کیا تھا اس لیے کہ وہ اسے (ان کے خط کے مطابق) اجتماع کی رُوداد میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ میں نے میاں صاحب کے اس خط کے جواب میں خود حاضر ہو کر ان سے عرض کیا تھا کہ میری یہ تقریر صرف ارکانِ جماعت

کے اجتماع کے لیے تھی اس کا روداد میں شامل کرانا میں مناسب نہیں سمجھتا۔ میاں صاحب سے اپنی اس گفتگو کا ذکر میں نے آپ سے بھی بطور خاص کیا تھا۔

اس کے بعد آپ نے ٹیلی فون پر مجھ سے کہا تھا کہ آپ کی تقریر مَیں اپنے مضمون میں شامل کرنا چاہتا ہوں لیکن میں چونکہ ملاقات کے دوران اس کے Notes نہیں لے سکا اس لیے آپ اسے مرتب کر کے بھجوا دیں۔ اس پر بھی میں نے آپ سے یہ گزارش کی تھی کہ میں اپنی اس تقریر کی اشاعت کے حق میں نہیں ہوں۔ اس پر آپ نے بے تکلفانہ انداز میں استفہامیہ طور پر کہا تھا کہ آپ میری اس سلسلہ میں مدد نہیں کریں گے؟ میں نے جواباً عرض کیا تھا کہ آپ اس موضوع پر اب تک اکیلے ہی کام کرتے آئے ہیں اور یہی شاید مناسب بھی ہے۔ پھر آپ نے آخری جملہ یہ کہا کہ ''چلئے پھر آپ کم از کم اپنے طور پر اپنی معلومات کو اور اُس دَور سے متعلق واقعات کو مرتب کر کے شائع ضرور کرائیں تا کہ ماضی کے تجربات آئندہ کام کرنے والوں کے لیے مفید ثابت ہو سکیں''۔ اس پر ہماری گفتگو ختم ہو گئی۔

''میثاق'' کے تازہ شمارہ میں مجھ سے جو باتیں آپ نے منسوب کی ہیں وہ معنی اور مہوم کے اعتبار سے اگر چہ درست ہیں لیکن ایک تو فی الحقیقت یہ جماعت کے داخلی معاملات تھے اور دوسرے میں یہ پہلو بھی واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ماچھی گوٹھ میں میری تقریر کسی خاص فرد یا افراد کے خلاف محض الزامی نوعیت کی باتوں پر مشتمل نہیں تھی۔ اس کے برعکس میں نے تو ان تمہیدی کلمات سے اپنی تقریر کا آغاز کیا تاھ کہ ماضی میں انتخابی سرگرمیوں کے دوران اگر کچھ غلطیاں اور لغزشیں وقوع پذیر ہوئی ہیں تو یہ ہم سب کی مشترکہ ذمہ داری تھی، تاہم ذمہ داری جب تقسیم کی جائے گی تو جماعت کے مرکزی عہدیداروں اور دوسرے اہم مناصب پر فائز اصحاب عام ارکانِ جماعت کے مقابلے میں جواب دہی کے نقطۂ نظر سے زیادہ ذمہ دار قرار پائیں گے۔ اپنی اس تقریر میں، میں نے بلاشبہ انتخابی معرکہ آرائی میں جماعت کے کارکنوں کی ایسی سرگرمیوں کا ذکر کیا تھا جو جماعت کی طے کردہ پالیسی کے یکسر منافی تھیں لیکن ان امور کی نشان دہی کا مقصد (جو میں نے اپنی تقریر میں واضح بھی کر دیا تھا) صرف اور صرف یہ تھا کہ آئندہ انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کرنے کے لیے ماضی کے تجربات اور واقعات کو ضرور پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اپنے اس موقف کی

وضاحت کے لیے میں نے محترم امیر جماعت سے انتہائی ادب واحترام کے ساتھ مخاطب ہوتے ہوئے یہ گزارش بھی کی تھی کہ ''پنجاب اور بہاولپور کے انتخابات کے مقابلے میں ملک بھر کے انتخابات کی مثال بالکل ایسی ہے کہ آپ نے پہلے ہمیں چھوٹے بڑے ندی نالوں کو عبور کرنے کا حکم دیا جنہیں عبور کرتے وقت ہم کیچڑ میں لت پت ہو گئے اب ہمیں ایک وسیع اور گہرے سمندر میں کود جانے کا حکم دیا گیا تو خود ہی غور فرمالیں کہ اس مہم جوئی میں کارکنوں پر کیا بیتے گی اور اس امتحان میں ہم کس حد تک سرخرو ہو سکیں گے؟

اس تقریر کو اگرچہ بعض شرکاءِ جماعت نے سخت ناپسند کیا لیکن جیسا کہ آپ خود لکھ چکے ہیں ارکانِ جماعت کی ایک معقول تعداد نے میری تائید بھی کی۔ اس سب کچھ کے باوجود میں ذہناً ان واقعات کی اشاعت کے لیے اپنے آپ کو کبھی آمادہ نہیں کر پایا۔ یہی میں نے آپ سے بھی عرض کیا تھا۔ ہوسکتا ہے میری یہ بات آپ کے ذہن سے محو ہوگئی ہو' تاہم اب آپ سے میری بصد ادب یہ درخواست ہے کہ ''میثاق'' کی آئندہ اشاعت میں میرا یہ عریضہ شائع کر دیں اور اس کے ساتھ ہی آپ کی خدمت میں' میں یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ ''میثاق'' کے محولہ بالا مضمون میں مجھ سے جو باتیں منسوب کی گئی ہیں براہِ کرم انہیں اپنی زیر تالیف کتاب میں شامل نہ کریں۔

شکریہ، والسلام

مصطفیٰ صادق

اس ''وضاحت'' کے بارے میں ہم یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ آپ کی فراہم کردہ معلومات کے ضمن میں مصطفیٰ صادق صاحب کا یہ فرمانا کہ انہوں نے راقم کو ان کی اشاعت سے روک دیا تھا اگر بعد کی اختراع نہیں تو یقیناً ایسے ''معہودِ ذہنی'' کی حیثیت رکھتا ہے جو ان کے ذہن میں ہو تو ہو زبان پر ہرگز نہیں آیا! میں طفیل محمد صاحب سے اپنی گفتگو کا ذکر انہوں نے بطورِ واقعہ ضرور کیا تھا' اور میری اس گزارش سے بھی کہ مناسب ہے کہ ہر شخص اپنی مفصل سرگزشت لکھ کر تاریخ کا قرض ادا کر دے انہوں نے نہ صرف یہ کہ اتفاق کیا تھا بلکہ اس ضمن میں بعض دوسرے حضرات کے اصرار کا بھی تذکرہ فرمایا تھا۔ تاہم انہوں نے خود میرے یہاں تشریف لا کر جس انشراح کے ساتھ تفاصیل بیان کی تھیں (جن پر میں ان کا شکریہ علی

الاعلان ادا کر چکا ہوں) قطع نظر اس ''واقعے'' کے کہ انہوں نے مجھے ان کی اشاعت سے ہرگز نہیں روکا' سوال یہ ہے کہ اگر فی الواقع اُن کی اشاعت مطلوب نہ تھی تو انہوں نے انہیں بیان کس لیے کیا تھا؟

بہر حال راقم الحروف کے اطمینان کے لیے یہ کافی ہے کہ بحمد اللہ انہوں نے یہ وضاحت فرما دی ہے کہ ''مجھ سے جو باتیں آپ نے منسوب کی ہیں وہ معنی اور مفہوم کے اعتبار سے''----- ''درست ہیں!'' جس کے لیے میں اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

باقی اس ''وضاحت'' میں ''دلچسپی'' کا پہلو یہ ہے کہ انہوں نے ''جماعت کے داخلی معاملات'' اور ان کے ضمن میں ناپسندیدہ تفصیلات کی اشاعت کو اپنے نزدیک سخت مکروہ قرار دیتے ہوئے اپنے ''واجب الاشاعت'' خط میں بعض مزید تفصیلات کا اضافہ فرما دیا ہے! اب ع ''کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا!''۔

ہم اپنے خیال کے مطابق ''نقضِ غزل'' کے ردِّ عمل پر گفتگو مکمل کر چکے تھے کہ اچانک یاد آیا کہ ہمارے ناصحین' محبین اور مخلص ناقدین میں سے ایک اور اہم شخصیت کا خط بھی سات سمندر پار سے آیا ہوا ہے۔ ہماری مراد جناب شمیم احمد صدیقی صاحب سے ہے جو تحریک اسلامی کے ساتھ نہایت قدیمی اور گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ موصوف کا آبائی تعلق سرزمین لکھنؤ سے ہے۔ وہاں سے وہ مشرقی پاکستان منتقل ہوئے جہاں وہ جماعت اسلامی کے نہایت سرگرم اور صف اول کے کارکنوں میں شامل رہے۔ ۱۹۷۱-۷۰ء کے حوادث سے دل برداشتہ ہو کر امریکہ ''ہجرت'' کر لی۔ اب نیویارک میں مقیم ہیں اور وہاں مقامی طور پر امریکی نژاد مسلمانوں میں وہاں کے مقامی ماحول اور مخصوص مزاج کے مطابق تحریک اسلامی کا ایک نیا قافلہ تشکیل دینے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ جماعت اسلامی کی تحریک سے گہری قلبی و ذہنی وابستگی اور مولانا مودودی مرحوم کی ذات سے شدید محبت و عقیدت کے ساتھ ساتھ راقم الحروف سے بھی ذہنی مناسبت اور دلی محبت رکھتے ہیں۔ ان کی شدید خواہش ہے کہ کسی طرح جماعت اسلامی اور تنظیم اسلامی کے مابین خلیج پاٹ دی جائے اور یہ دونوں

تنظیمیں اول تو باہم مدغم ہو کر ورنہ کم از کم یک جان دو قالب ہو کر فریضۂ اقامت دین کے لیے شانہ بشانہ جدوجہد کریں۔ گزشتہ سال ڈٹرائٹ (میشی گن-امریکہ) میں تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام جو سات روزہ تربیت کیمپ منعقد ہوا تھا اس میں وہ از اول تا آخر شریک رہے تھے اور اس میں جو اختتامی تقریر راقم نے کی تھی اسے بے حد سراہا تھا۔ پاکستان کے بھی انہوں نے بعض سفر اسی ارادے سے کئے کہ جماعت اسلامی کے قائدین' جن میں سے اکثر کے ساتھ ان کی دیرینہ شناسائی ہے' سے ملاقات کر کے جماعت اور تنظیم کے مابین فاصلوں کو کم کرنے کی کوشش کریں-----اگرچہ اس میں انہیں کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

صدیقی صاحب کے لیے ''نقضِ غزل'' جس صدمہ کا باعث بنا ہوگا ہمیں اُس کا پورا اندازہ ہے' اس لیے کہ اس سے ایک جانب قلبی محبت و عقیدت کو ٹھیس پہنچی ہو گی تو دوسری جانب اُس خواہش کے ضمن میں بھی کہ ہمارے اور جماعت اسلامی کے مابین بُعد و فصل کم ہو' کم از کم وقتی طور پر ع ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!'' کی سی کیفیت پیدا ہوئی ہوگی۔ چنانچہ ان کا ایک بہت مفصل خط برادرم قمر سعید صاحب کے نام موصول ہوا جس کے دو اقتباسات درج ذیل ہیں:

۱۔ ''نقضِ غزل' دین کی کوئی اچھی خدمت نہیں ہے۔ اس سے دلوں میں اور بُعد پیدا ہوگا' تلخیاں ابھر کر کشمکش حیات میں مزید زہر گھول دیں گی اور اس سے دین کی راہ اور کھوٹی ہو گی۔ اگر مولانا مرحوم نے بقول ڈاکٹر صاحب کے کچھ غلطیاں کی تھیں تو وہ اب تاریخ کا حصہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا کام تاریخ سازی ہے' تاریخ کا لکھنا نہیں ہے۔ غلط یا صحیح ہونے کا فیصلہ مستقبل کا مؤرخ کرے گا' جس کے پاس ذاتی پسند و ناپسند جیسی کوئی چیز نہ ہو گی' اس کے ہاں جذبات کی آمیزش نہ ہو گی۔ اُس وقت تاریخ اپنا بے لاگ تبصرہ دے گی اور پھر آنے والی نسلیں مولانا مرحوم اور ڈاکٹر صاحب دونوں کے تاریخ میں پیش کردہ کردار پر رائے زنی کریں گی''۔

۲۔ ''میں نے اپنے پچھلے خطوط میں بھی ڈاکٹر صاحب سے یہ مؤدبانہ عرض کیا تھا اور اب پھر عرض کر رہا ہوں کہ آپ صرف مثبت انداز میں اقامت دین کی جدوجہد میں لگے رہیں۔ آپ کا اخلاص' آپ کی دینی خدمات اور آپ کی جانفروشانہ

کوششیں حق کے مثبت کارکنوں کو کھینچ کھینچ کر آپ کے کارواں کی گرد ِراہ بنا دیں گی۔ آپ کا کارواں چلتا رہے گا' لوگ ملتے رہیں گے۔ اگر منزل سر کر لی تو فبہا' اور اگر شہادت علی الناس کی ذمہ داریاں پوری کرتے ہوئے شہید راہ ہو گئے تو عین کامیابی! پھر اس قافلہ کی قیادت کچھ اور لوگ آگے بڑھ کر سنبھال لیں گے۔ دوسروں پر انگشت نمائی کرنا ایک داعی کا شیوہ نہیں۔ دوسروں کا چراغ بجھا کر اپنا چراغ جلانے میں دنیا میں کوئی کامیاب نہیں ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی پوزیشن تو اس سے بہت سوا ہے۔ ان کا کام تو عقابوں کے نشیمن پر کمندیں ڈالنا ہے' نہ کہ گرے ہوئے پرندوں پر ٹھونگیں مارنا۔ یہ ان کے رتبہ سے بہت فروتر کام ہے۔ ان کی آواز تو مکہ و مدینہ میں گونج رہی ہے' اور اب تو ساتوں سمندر پار اقصائے عالم میں ہر سُو پھیل چکی ہے۔ ان کے سوچنے کا انداز عالمی ہے' نہ کہ مقامی۔ وہ اپنی اَن تھک کوششوں سے تحریک اسلامی کے قافلے کو ایک آفاقیت کا روپ دے چکے ہیں۔ دوسری طرف مولانا مرحوم کا اپنا ایک مقام ہے جس کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ وہ ایک فکر کے حامل تھے۔ انہوں نے ایک تحریک چلائی' ایک کارواں تیار کیا اور آگے چل پڑے۔ وہ اپنا کام پورا کر کے مالک حقیقی کے پاس پہنچ گئے۔ اب ہم ان کے کاموں میں کیڑے ڈالنے کے لیے نہیں' بلکہ ان کے چھوڑے ہوئے کام کو آگے بڑھانے کے لیے آگے بڑھے ہیں۔ اگر ان کی چلائی ہوئی تحریک بقول ڈاکٹر صاحب کے اب گم کردہ راہ ہو گئی ہے تو آپ اس راہ پر گامزن ہو کر اسے مہمیز لگائیں۔ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ وہ کب فرصت دیتا ہے کہ آپ پیچھے مڑ کر دیکھیں' پلٹ پلٹ کر ماضی میں گم رہیں۔ ایک بار ماچھی گوٹھ کے اجتماع میں تجزیہ کر کے ڈاکٹر صاحب نے اپنا فرض پورا کر دیا اب بار بار نشتر زنی کرنے سے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ وہ اپنا وقت ضائع کریں گے اور دوسروں کے منہ کے مزوں کو کڑوا اور کسیلا کر دیں گے..................شیطان تو چاہتا ہی یہ ہے کہ وہ اس طرح حق کی راہ کھوٹی کر کے حق کے شہ سواروں کو آپس ہی کی چشمک زنی میں الجھا دے' تاکہ اپنے حیرت بداماں رہیں' غیر تماشا دیکھتے رہیں اور وہ پوری بازی جیت کر یا الٹ کر چلتا بنے''۔

صدیقی صاحب کی نصیحت و فہمائش کے ضمن میں ہمارا موقف کسی حد تک دوسرے

خطوط کے سلسلے میں جو گزارشات پیش کی جا چکی ہیں اُن میں بیان ہو چکا ہے' تاہم تین نکات کی جانب مزید توجہ منعطف کرانی ضروری ہے۔

ایک یہ کہ مستقبل کے مؤرخ پر آسمان سے وحی تو ہرگز نازل نہیں ہوگی اور اگر اُسے اپنی تحقیق و تفتیش کے لیے ضروری مواد حاصل نہ ہو سکا تو وہ صحیح فیصلے تک کیسے پہنچے گا؟ ادھر ۵۷-۱۹۵۶ء کے حوادث و واقعات سے متعلق ریکارڈ کو جماعت اسلامی نے ایسے دفن کیا ہے کہ ایک طرف اُس رپورٹ کو صفحۂ ہستی سے نابود کر دیا جو جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ کی نامزد کردہ جائزہ کمیٹی نے ایک سال کی محنت و مشقت سے تیار کی تھی جس پر جائزہ کمیٹی کے ارکان کی توانائیوں اور اوقات کے صرفِ کثیر کے علاوہ جماعت اسلامی کے بیت المال کا بھی زرِ کثیر صَرف ہوا ہوگا۔ پھر ماچھی گوٹھ کی اختلافی تقاریر کو نسیاً منسیاً کرنے کے لیے جماعت کی رُودادوں کی اشاعت کا سلسلہ ہی ختم کر دیا گیا۔ حد یہ ہے کہ خود مولانا مودودی مرحوم نے تحریک اسلامی کی قیادت اور امارت کے سلسلے میں اپنے ذہن کو جس تقریر میں کھول کر بیان کیا تھا اسے بھی ایسے غائب کیا کہ میں سالہا سال کی تلاش کے باوجود اس تک رسائی حاصل نہ کر سکا' اور وہ سامنے آئی بھی تو ایک خالص خدائی بدبیر' اور ایک مخلص اور پُر جوش لیکن ناسمجھ کارکن کی ''غلطی'' کے نتیجے میں۔

راقم کے بارے میں صدیقی صاحب کا یہ فرمانا کہ میرا کام تاریخ نگاری نہیں صد فی صد درست ہے (اگرچہ مجھ ایسے ناچیز اور نااہل کے لیے ''تاریخ سازی'' کے لفظ کا استعمال محض اُن کے حسن ظن کا مظہر ہے) خود راقم نے بھی اگر ''نقض غزل'' کے ضمن میں ''تاریخ کا حق ادا کرنے'' کا ذکر کیا ہے تو ثانوی اعتبار سے۔ راقم کو اصل تشویش اس امر کی لاحق تھی کہ ان حوادث کے اصل اسباب کے متعین نہ ہونے کا نہایت مضر نتیجہ یہ نکل سکتا ہے (جو بالفعل بہت سے لوگوں کے رویہ میں ظاہر ہو بھی چکا ہے) کہ نہ صرف یہ کہ تحریک اسلامی کے اصول و مبادی اور اساسی نظریات کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہو جائیں بلکہ اقامت دین کی جدوجہد ہی کی جانب سے مایوسی اور بددلی پیدا ہو جائے۔ جبکہ اس کے برعکس اگر متعین کر دیا جائے کہ غلطی کیا اور کب ہوئی تو باقی سارے اصول و مبادی اور کُل

صغریٰ کبریٰ شکوک وشبہات کی زد میں آنے سے بچ جاتے ہیں! **وھُوَ المطلوب**!!

دوسرے یہ کہ صدیقی صاحب غور فرمائیں کہ کیا دنیا میں کبھی کوئی مثبت کام تنقید کا ناگزیر مگر ناخوشگوار فریضہ سرانجام دیئے بغیر ہوا ہے؟ گویا کیا قرآنی اصطلاح میں ''احقاقِ حق'' اور ''ابطالِ باطل'' لازم وملزوم نہیں ہیں؟ کیا قرآن میں پہلے مشرکین اور پھر اہل کتاب اور منافقین پر شدید تنقید بلاضرورت کی گئی ہے؟ کیا خود مولانا مودودی مرحوم نے کانگریس کے ہم نوا علماء پر شدید تنقید نہیں کی تھی؟ درآنحالیکہ ان کی دینی تعلیم وتربیت اُن ہی کے حلقے میں ہوئی تھی اور انہوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز بھی جمعیت علماء ہند کے جریدے ''**الجمعیّت**'' کے حلقہٗ ادارت سے وابستگی ہی کے ذریعے کیا تھا۔ پھر کیا انہوں نے متحدہ قومیت کے خلاف مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے مؤثر اور مدلل اثبات کے باوجود ''مسلم قوم پرستی'' کو اُسی طرح کا بُت قرار دے کر اس پر اسی شدت سے سنگ باری نہ کی تھی جیسی کہ علامہ اقبال مرحوم نے ''**وطنیّت**'' کے بت پر کی تھی

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

قصہ مختصر عالم واقعہ میں ''صرف مثبت'' کام کی کوئی مثال ہو تو ضرور پیش کریں۔

صدیقی صاحب اور ان کے ہم خیال لوگ ذرا غور فرمائیں تو یہ حقیقت بالکل واضح اور مبرہن نظر آئے گی کہ محض مثبت کام تو صرف انفرادی نیکی اور پارسائی کے ضمن میں ہوسکتا ہے' اس سے بڑھ کر آپ دعوتِ حق اور تبلیغ دین کی بات کریں گے' تو کم از کم پاک و ہند کے ماحول میں یا تو آپ کو تبلیغی جماعت میں شامل ہونا ہوگا ورنہ اس سے اپنے نظری اور عملی فرق وامتیاز کو واضح کرنا ہوگا۔ اسی طرح اگر آپ یہاں اقامت دین اور غلبہ ٔدین حق کی بات کریں گے تو بھی دو ہی صورتیں ممکن ہیں یعنی یا آپ جماعت اسلامی میں شامل ہو جائیں! ورنہ پھر اس سے اپنے اختلاف کو پوری وضاحت اور شدومد کے ساتھ بیان کریں! اور اگر کسی نیک اور مرنجان مرنج آدمی کو یہ ''منفی'' کام برا لگے تو اس کے لیے واحد راہ یہ ہے کہ دعوت و اقامت دین کی جدوجہد سے کنارہ کش ہو کر اول تو کلیۃً انفرادی نیکی اور پارسائی کے دامن

میں پناہ لے لے' ورنہ زیادہ سے زیادہ کسی علمی مشغلے یا محض تعلیمی و تدریسی خدمت میں مصروف ہو جائے' اور راقم کا اصل ''جرم'' یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس پر مطمئن نہیں کر سکا۔ اس لیے کہ سر سید احمد خان مرحوم کے الفاظ ''قرآنے کہ من دارم'' کے مصداق مَیں جس قرآن سے واقف ہوں وہ تو شہادت علی الناس کو امت مسلمہ کا اجتماعی فریضہ' اقامت دین کی جدو جہد کو فرض عین' اور ان دونوں فرائض کی ادائیگی کے لیے جہاد فی سبیل اللہ کو ایمانِ حقیقی کا رکن لازم قرار دیتا ہے' لٰہذا ہمارے لیے تو صورت وہی ہے کہ ؎

جز دار اگر کوئی مفر ہو تو بتاؤ
ناچار گنہگار سوئے دار چلے ہیں!

تیسرے یہ کہ صدیقی صاحب ماچھی گوٹھ میں پیش کردہ ''تجزیئے'' کو کسی حد تک مناسب اور ضروری قرار دے رہے ہیں' لیکن اول تو فی الواقع اسے ماچھی گوٹھ میں پیش ہونے ہی نہیں دیا گیا' پھر اسے اس وقت اس سے بھی زیادہ ناپسند قرار دیا گیا تھا جیسا کہ آج صدیقی صاحب کو ''نقض غزل'' ناپسند ہوا ہے' یہاں تک کہ جب دس سال بعد اس کی اشاعت ہوئی تو راقم کے ایک نہایت قریبی اور مخلص دوست' پرائمری کے زمانے سے کلاس فیلو' یکے از مؤسسین مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور اور انجمن کے نمایاں اور مستقل معاون نے اسے سخت ناپسند کیا تھا۔ اور باصرار یہ پیشکش کی تھی کہ ''پوری کتاب میں یکمشت خرید لیتا ہوں' گویا تمہاری کُل لاگت مع نفع کے تمہیں مل جائے گی۔ لیکن خدارا اِس کتاب کو عام نہ کرو!!'' پھر جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے' اس کے ذریعے مقدمے کا صرف ایک حصہ سامنے آیا تھا' یعنی یہ کہ میرا جماعت کی موجودہ پالیسی سے اختلاف کیا ہے؟ مقدمے کا دوسرا اور اہم تر حصہ یعنی یہ کہ میں نے جماعت سے علیحدگی کیوں اختیار کی؟ ابھی تک پردۂ خفا میں تھا۔ اس کا کوئی ذکر ''تحریک جماعت اسلامی'' میں موجود نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ تو جماعت کی رکنیت سے مستعفی ہونے سے چھ ماہ قبل ضبط تحریر میں آئی تھی' اور جیسے کہ اس تحریر کے بالکل آغاز میں بیان ہو چکا ہے اس سوال کے تشفی بخش جواب کے لیے ''نقض غزل'' کی اشاعت ناگزیر تھی۔

رہا جماعت اسلامی کے ساتھ اتحاد و اتفاق یا کم از کم تعاون و تناصر کی فضا پیدا کرنے کا معاملہ جس کی خواہش مختلف گوشوں سے اس سے قبل بھی سامنے آتی رہی ہے' اور ان دنوں کچھ زیادہ ہی شدومد کی صورت اختیار کر گئی ہے تو واقعہ یہ ہے کہ شاید پوری دنیا میں اس کا راقم الحروف سے بڑھ کر خواہش مند کوئی نہ ہو۔ لہٰذا جب بات چل ہی نکلی ہے تو مناسب ہے کہ اس معاملے سے متعلق بعض حقائق و واقعات بھی اپنے بہی خواہوں کے سامنے رکھ دیئے جائیں۔

جہاں تک اتحاد اور ادغام کا تعلق ہے اگرچہ وہ بظاہر احوال ع ''حلول و اتحاد ایں جا محال است!'' کا مصداقِ کامل نظر آتا ہے لیکن میری یہ پیشکش تمام واقفانِ حال کے علم میں ہے (اور کئی سال سے ہے) کہ اگر جماعت انتخابی سیاست کے میدان سے کنارہ کشی اختیار کر لے تو میں اور میرے رفقاء فوراً جماعت میں شامل ہو جائیں گے۔ اس میں' میں یہ تخفیف مزید کیئے دیتا ہوں کہ اگر جماعت کو انتخابات سے ہمیشہ کے لیے کنارہ کشی بہت شاق محسوس ہو' اور گویا کہ اس کے مترادف نظر آئے کہ جماعت اپنی چالیس سالہ پالیسی کے غلط ہونے کا اقرار کر لے' تو میں اُس تجویز کو قبول کرنے کے لیے بھی تیار ہوں جو حال ہی میں ڈاکٹر محمد امین صاحب (جنہیں جماعت سے خارج کر دیا گیا) نے پیش کی ہے یعنی یہ کہ جماعت آئندہ پچیس سال کے لیے ہی یہ طے کر لے کہ وہ ملکی انتخابات میں حصہ نہیں لے گی۔ البتہ اس صورت میں جماعت کے تنظیمی ڈھانچے میں ایسی تبدیلی لانی ضروری ہوگی جس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ اظہار رائے پر کوئی قدغن نہ رہے اور اختلاف رائے کے راستے (Channels) معین صورت میں کھول دیئے جائیں' بلکہ اختلافی آراء کے پنپنے اور پروان چڑھنے کے امکانات بھی موجود ہوں (اس ضمن میں قارئین اگر اس نظام العمل کا مطالعہ کریں جو ہم نے تنظیم اسلامی کے لیے اختیار کیا ہے تو اندازہ ہو جائے گا کہ ہم نے بیعت کے نظام میں بھی اِن دونوں باتوں کا کس قدر اہتمام کیا ہے۔ یہ نظام العمل مئی ۱۹۹۰ء کے ''میثاق'' میں شائع کیا جا چکا ہے) اور اگرچہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ اس شرط کا پورا ہونا اللہ کی قدرت سے بعید نہ ہوتے ہوئے بھی' موجودہ حالات میں کم از کم بظاہر احوال ناممکنات میں

شامل ہے، تاہم ہماری پیشکش قائم ہے۔

ع ''کہ عنقا را بلند است آشیانہ!'' کے مصداق اس مقام سے نیچے اتر کر جہاں تک باہمی تعاون کا تعلق ہے، ہم اس کے لیے بھی ہمیشہ تیار رہے ہیں اور ریکارڈ پر ایسے متعدد واقعات موجود ہیں کہ اس ضمن میں ہماری بار بار کی پیشکشوں کو سختی کے ساتھ ردّ کیا گیا۔ مثلاً:

۱۔ ۱۹۷۳ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی سالانہ قرآن کانفرنسوں کا سلسلہ شروع ہوا تو راقم خود چل ک نعیم صدیقی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور انہیں اس میں شرکت کی دعوت دی۔ انہوں نے فرمایا کہ آپ کے ساتھ تو ہمارا شدید اختلاف ہے۔ میں نے عرض کیا کہ کیا خان عبدالولی خان صاحب سے آپ کا کامل اتفاق ہے؟ پھر اگر آپ سیاسی پلیٹ فارم پر ولی خان اور اصغر خان کے ساتھ بیٹھ سکتے ہیں تو قرآنی پلیٹ فارم پر میرے ساتھ کیوں تشریف نہیں رکھ سکتے؟ انہوں نے فرمایا کہ میں جانتا تھا کہ آپ یہ دلیل دیں گے۔ تاہم آپ کی کانفرنس میں میری شرکت ناممکن ہے! اس کے بعد بھی مسلسل دو سال تک راقم دعوت نامہ ارسال کرتا رہا، اور اس کا سلسلہ اُس وقت بند کیا جب اُن کی جانب سے ایک تلخ خط موصول ہوا کہ جب ہم نے آپ کو واضح طور پر بتا دیا ہے کہ ہم شرکت نہیں کر سکتے تو آپ خواہ مخواہ ہمیں دعوت نامے کیوں ارسال کرتے ہیں۔

۲۔ اسی طرح کی ایک دعوت تنظیم اسلامی کی ایک تربیت گاہ کے سلسلے میں جناب اسعد گیلانی صاحب کو دی گئی تو انہوں نے فی الفور آمادگی ظاہر فرما دی۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وقت کے امیر جماعت نے انہیں منع فرما دیا!!

۳۔ ۱۹۸۲ء میں جماعت اسلامی نے تعلیم قرآن کانفرنس منعقد کی اور اس میں میاں طفیل محمد صاحب نے دعوتِ عام دی کہ ''ہمیں قرآن کی بنیاد پر جمع ہو جانا چاہیے'' تو راقم نے فوری طور پر پیشکش کی کہ اگر آپ کے سامنے اشتراکِ عمل اور تعاونِ باہمی کا کوئی پروگرام ہے تو واضح فرمائیں اس کے لیے سب سے پہلے میں اور میری تنظیم لبیک کہتی ہے۔ جس کے جواب میں مشترکہ لائحہ عمل اور اس کے حدود و خطوط معین کرنے کی بجائے گول مول نصیحت کے ساتھ ہمارے دست تعاون کو جھٹک دیا گیا (اس سلسلے

میں جو خط راقم نے لکھا تھا اور اس کا جو جواب میاں صاحب کی جانب سے موصول ہوا' دونوں شامل اشاعت کئے جا رہے ہیں)۔

۴۔ اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے سالانہ اجتماعات کئی سال سے پنجاب یونیورسٹی کے نئے کیمپس میں منعقد ہوتے ہیں اور ان میں جماعت اسلامی کے زعماء کے علاوہ دیگر علماء یا دانشور حضرات کو بھی دعوتِ خطاب دی جاتی ہے' لیکن اس کے باوجود کہ راقم کیمپس کا قریب ترین پڑوسی بھی ہے' اور جمعیت کا سابق ناظم اعلیٰ بھی' آج تک اُسے ان اجتماعات میں شرکت کی دعوت نہیں دی گئی۔

جمعیت کے اس طرز عمل کے مقابلے میں راقم الحروف کی روش ہمیشہ یہ رہی کہ جب بھی کسی کالج میں منعقد ہونے والی کسی محدود تقریب میں دعوتِ خطاب دی گئی سر کے بل حاضر ہوتا رہا' اور کبھی اسے اپنی ''انا'' یا Prestige کا مسئلہ نہیں بنایا کہ جب آپ اپنے بڑے اجتماعات میں مجھے مدعو نہیں کرتے تو میں ان چھوٹے چھوٹے اجتماعات میں کیوں آؤں؟

۵۔ یہی معاملہ حال ہی میں لاہور میں پیش آیا کہ جب مرکز کے اہتمام میں ایک ''عظیم الشان'' بین الاقوامی کشمیر کانفرنس ''الحمراء'' میں منعقد کی گئی تو اس میں شرکت کی دعوت مجھے نہیں دی گئی۔ اس کے باوجود جب لاہور کی جماعت نے ''ہفتۂ انسدادِ منکرات'' کے سلسلے میں ایک سیمینار جناح ہال میں منعقد کیا اور اس میں مجھے بلایا تو میں بلا چون و چرا حاضر ہو گیا۔

۶۔ ستم بالائے ستم یہ کہ جماعت کا جو کُل پاکستان اجتماع چند ماہ پیشتر مینارِ پاکستان کے سائے میں منعقد ہوا تھا اس کے بارے میں جماعت کے بعد قریبی لوگوں سے معلوم ہوا کہ یہ مشہور کیا گیا ہے کہ ''انہیں (یعنی راقم کو) بھی دعوتِ خطاب دی گئی تھی لیکن وہ خود نہیں آئے' اور ان سے اپنا سٹال لگانے کو بھی کہا گیا تھا لیکن انہوں نے خود نہیں لگایا'' جبکہ واقعہ یہ ہے کہ میرے نام صرف وہ دعوت نامہ موصول ہوا تھا جو عام سامعین کو رسماً بھیجا جاتا ہے۔ اس میں کسی تقریر یا خطاب کا کوئی ذکر تک نہ تھا۔ اور سٹال کے ضمن میں جب ہم نے خود رابطہ کیا تھا تو بتایا گیا تھا کہ ساری جگہ پہلے ہی

الاٹ ہو چکی ہے اور اب کسی سٹال کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

اب محبین اور مخلصین خود غور فرمائیں کہ کمی ہماری جانب سے ہے یا دوسری جانب سے!

اور جب بات اس حد تک پہنچ ہی گئی ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ''تکملہ'' کے طور پر چند اور باتیں بھی' طوالت کے خوف سے باوجود گوش گزار کر دی جائیں۔

راقم الحروف اپنی دعوت اور تحریک کے اعتبار سے مولانا مودودی مرحوم اور جماعِ اسلامی کو اپنے معنوی ''والدین'' سمجھتا ہے۔ چنانچہ راقم نے بارہا صراحتاً عرض کیا ہے اپنی دانست میں راقم جس تحریک اور دعوت کے تسلسل کو قائم رکھنے کی کوشش کر رہا ہے اس کی اس بیسویں صدی عیسوی میں پہلی کڑی کی حیثیت حاصل ہے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور ان کی حزب اللہ کو' اور دوسری کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں ان کے معنوی جانشین مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم اور ان کی قائم کردہ جماعت اسلامی ----- اگرچہ میری تحریک کا سلسلۂ نسب مولانا آزاد مرحوم ک زندگی کے بھی صرف آٹھ سالوں سے جڑتا ہے یعنی ۱۹۱۲ء تا ۱۹۲۰ء اور مولانا مودودی مرحوم کی تحریک کے بھی صرف آٹھ ہی سالوں سے متعلق ہے یعنی ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۷ء۔ اسی طرح جماعت اسلامی کے بارے میں ۱۹۶۶ء کی تحریر کا یہ اقتباس تو اسی تحریر میں آ چکا ہے کہ جیسے ایک بچہ سب کچھ اپنی ماں سے سیکھتا ہے اسی طرح میں نے اکابرین جماعت سے دیکھنا' سننا' سوچنا اور بولنا سیکھا ہے۔ اس کے علاوہ میں نے اپنے ان ہی جذبات کا اظہار کے لیے ایک موقع پر علامہ اقبال مرحوم کی مشہور نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' کے اس شعر کو ذریعہ بنایا تھا کہ ؎

تخم جس کا تو ہماری کشت جاں میں بو گئی
شرکت غم سے وہ الفت اور محکم ہو گئی!

جس پر بعض احباب بالخصوص مکہ مکرمہ سے زبیر عمر صدیقی صاحب کا بڑا جذبات ردِّ عمل موصول ہوا تھا۔

تاہم از روئے قرآن والدین کا حق ادب و احترام اور حسن سلوک اور مصاحبت

معروف ہی کا ہے' ان کی اطاعت یا اتباع ہر حال میں لازم نہیں (سورۂ بنی اسرائیل آیات ۲۳ تا ۲۵' سورۂ عنکبوت آیت ۸' سورۂ لقمان آیات ۱۴ تا ۱۵) چنانچہ کسی معاملے کی نوعیت کی مناسبت سے ان سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے' اور حکم عدولی بھی کی جا سکتی ہے' اور عدل و انصاف کی بات ان کے خلاف پڑ رہی ہو تو بھی ڈنکے کی چوٹ کہنا ضروری ہے (سورۂ نساء آیت ۱۳۵)۔ چنانچہ میں نے مولانا مودودی مرحوم کے دینی فکر میں جو کمی نظر آئی اس کی بھرپور نشان دہی کی (اسلام کی نشاۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام'' نامی کتابچے میں ''تعبیر کی کوتاہی'' کے عنوان سے بحث اور ''عظمت صوم'' نامی تحریر میں ''اسلام کا روحانی نظام'' کے موضوع پر مولانا مرحوم کے نظریئے کی نفی) اسی طرح قیام پاکستان کے بعد کی مجموعی پالیسی میں جو کجی نظر آئی اس پر بھی مبسوط مقالہ لکھا (''تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی جائزہ'')۔ پھر ۱۹۵۶-۵۷ء کے بحرانی دَور کے جو اقدامات تباہ کن محسوس ہوئے ان پر بھی گرفت کی ''خلافت وملوکیت'' نامی کتاب میں بعض نہایت جلیل القدر صحابہؓ پر جو جارحانہ تنقید وارد ہوئی اُس سے بھی اعلانِ برأت اور اظہارِ بیزاری کیا' اور بالآخر تحریک اور تنظیم کی قیادت و امارت کے تصور کے ضمن میں جو غلطی نظر آئی اُس کی بھی نشان دہی کر دی۔ لیکن بحمداللہ آج تک نہ ان کی ذات پر کوئی حملہ کیا اور نہ ان کی نجی اور گھریلو زندگی کو کبھی موضوعِ گفتگو بنایا' بلکہ ایک خاص دَور میں مقدم الذکر امور کے ضمن میں بھی اگر لہجہ تیز اور زبان سخت ہو گئی تھی تو اس پر بھی علیٰ رؤس الاشہاد معذرت کر لی!

تاہم چونکہ والدین سے خواہ کتنا بھی اختلاف کیوں نہ ہو جائے' رہتے تو وہ والدین ہی ہیں' اور ان کی احسان مندی کا جذبہ ہر سلیم الفطرت انسان میں بہرحال برقرار رہنا چاہیئے' لہٰذا میں نے بھی جماعت سے علیحدگی کے بعد کے تینتیس سالوں میں سے صرف ایک آٹھ سالہ دَور (۶۲ء تا ۱۹۷۰ء) کے علاوہ نہ اس سے قبل کے پانچ سالوں کے دوران اپنے قلب میں اس جذبہ واحساس کی کوئی کمی محسوس کی' نہ ہی بعد کے بیس سالوں کے دوران ان میں کمی کا کوئی شائبہ محسوس کیا! فالحمد للہ علیٰ ذٰلک!

عجیب اتفاق ہے کہ میرے صلبی وجسمانی والد شیخ مختار احمد مرحوم کا سن پیدائش بھی

۱۹۰۳ء تھا‘ اور میرے تحریکی و معنوی والد مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی ولادت بھی اُسی سال ہوئی تھی۔ پھر وہ دونوں ہی عرصہ ہوا کہ اس دنیا سے رخصت اور ”تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ“ کے مصداق بن چکے ہیں۔ جبکہ میری والدہ ماجدہ بھی تاحال بقید حیات ہیں اور میری معنوی ماں جماعت اسلامی بھی قائم اور موجود ہے! اور میں جیسے یہ دعا کرتا رہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ والدہ صاحبہ کا سایہ تادیر سلامت رکھے‘ ایسے ہی قلب کی گہرائیوں سے یہ دعا بھی مسلسل نکلتی رہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جماعت کے اربابِ حل وعقد کو توفیق دے کہ وہ حقائق کا صحیح ادراک کرتے ہوئے پوری جرأتِ رندانہ کے ساتھ اپنے سابقہ طریق کار کی طرف مراجعت کرلیں۔ تاکہ ع ”آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک!“ کی صورت پیدا ہوجائے۔

”وَ مَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ !!“ لہٰذا ”اِنَّمَا اَشْكُوْا بَثِّيْ وَ حُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ!!“

الغرض ----- یہ ہیں مولانا مودودی مرحوم اور جماعت اسلامی کے بارے میں میرے قلبی احساسات و جذبات جن کے اظہار میں مجھے ہرگز کوئی باک نہیں‘ خواہ اسے کوئی ارشاد احمد علوی یا اُن کے ہم خیال جماعت کی خوشامد اور ع ”میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب!“ کا مصداق قرار دیں‘ خواہ کوئی صفدر میر یا اُن کے ہم نوا ----- "Kowtowing Before The Jama'at" سے تعبیر کریں۔

تاہم اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میں جملہ اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر مولانا مودودی کی ہر بات سے متفق ہونے کا اعلان کردوں‘ یا ان کے ہر اقدام کو درست قرار دے دوں‘ یا ان کو معاذ اللہ تنقید سے بالاتر سمجھنے لگوں۔ ان سے میرے علمی اختلافات بے شمار ہیں‘ یہاں تک کہ ان کے بعض نظریات و خیالات کو میں گمراہی سے تعبیر کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتا!

مزید برآں جس طرح والدین معناً ایک وحدت ہوتے ہوئے بھی اپنا اپنا جداگانہ مقام رکھتے ہیں چنانچہ حدیث نبوی ؐ کی رو سے والدہ کا حق والد پر تین درجہ فائق ہے‘ اسی طرح مولانا مودودی اور جماعت اسلامی خواہ ایک اعتبار سے ایک حیاتیاتی اکائی اور وحدت

ہوں اپنی اپنی جداگانہ حیثیت بھی رکھتی ہیں' بالخصوص اب جبکہ مولانا مودودی مرحوم کی وفات پر دس سال سے زیادہ کا عرصہ بیت چکا ہے ان کے علمی نظریات اور ذاتی خیالات کا کوئی لازمی تعلق جماعت اسلامی کے ساتھ نہیں ہے (چنانچہ اصولاً تو اس کا واضح فیصلہ اور برملا اعلان بھی ۱۹۵۶ء میں کر دیا گیا تھا)۔ لہٰذا واقعہ یہ ہے کہ ''جماعت اسلامی'' سے میرا اختلاف صرف ''طریق کار'' کا ہے' اور میں دیکھ رہا ہوں کہ جماعت کے تمام سوچنے سمجھنے والے لوگ ''وَ جَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ'' (النمل: ۱۴) کے مصداق خواہ برملا تسلیم کرنے میں جھجک محسوس کرتے ہوں' دل سے قائل ہو چکے ہیں کہ انتخابات کے ذریعے اقامت دین کی منزل کی جانب کوئی پیش قدمی ممکن نہیں ہے! (بلکہ سننے میں آیا ہے کہ جماعت کے موجودہ امیر قاضی حسین احمد صاحب نے تو بعض اجتماعات میں اس کا برملا اعلان بھی کر دیا ہے۔ اگرچہ اگر ہماری اطلاعات صحیح ہیں تو اس کے متبادل کے طور پر جس راستے کی وہ نشان دہی کر رہے ہیں وہ ایک خطرناک داؤ کے مترادف ہے!! جس کے ضمن میں نصح و اخلاص کا حق راقم نے اپنی اس تقریر کے بین السطور میں ادا کر دیا ہے جو جماعت کے حالیہ سیمینار میں ہوئی تھی۔ (۱))

''میثاق'' کا یہ شمارہ بھی جنوری اور مارچ کے شماروں کے مانند ''نقض غزل'' ہی کے سلسلے کی کڑی بن گیا ہے ----- اگرچہ یہ کڑی ہے اور آئندہ ان صفحات میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں آئے گا۔ بلکہ ''نقض غزل'' کو کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے گا۔ تاہم ''نقض غزل'' کے اس تکملہ کے ساتھ بطور ضمیمہ راقم کا جماعت کی رکنیت سے ''استعفاء'' شائع کیا جا رہا ہے جو ۲۶/اپریل ۱۹۵۷ء مطابق ۲۹/رمضان المبارک ۱۳۷۶ھ کو بحالت

---

(۱) جماعت اسلامی کے زیر اہتمام یہ سیمینار انسدادِ منکرات کی مہم' کے سلسلے میں مئی ۱۹۹۰ء میں جناح ہال لاہور میں ہوا تھا، جس میں محترم ڈاکٹر صاحب کو بھی اظہار خیال کی دعوت دی گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے خطاب کا موضوع تھا: ''انسدادِ منکرات اور اسوۂ رسول ﷺ''۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ خطاب جون ۱۹۹۰ء کے ''میثاق'' میں شائع ہوا تھا۔

صوم واعتکاف لکھا گیا تھا جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ آج سے ثلث صدی قبل جب راقم نے جماعت سے علیحدگی اختیار کی تھی تو اس وقت اس کے جذبات واحساسات کیا تھے! اور یہ کہ اگر میں یہ کہتا رہا کہ ؎

تخم جس کا تو ہماری کشت جاں میں بو گئی
شرکت غم سے یہ الفت اور محکم ہو گئی

اور عملاً اس شعر کی تصویر بنا رہا کہ ؎

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا !

تو ''وَ مَا اَنَا مِنَ الْمُتَکَلِّفِیْنَ'' کے مصداق اس میں نہ کوئی تصنع ہے نہ تکلف بلکہ یہ میرے فکر ونظر کی حقیقی ترجمانی اور میرے جذبہ واحساس کا واقعی انعکاس ہے! ع ''کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے!''

تنظیم اسلامی کی تاسیس اول کے موقع پر اکتوبر ۱۹۶۷ء کے 'میثاق' کی پشت پر شائع شدہ

مولانا امین احسن اصلاحی کی تقریر کے ایک اقتباس کا عکس!

Monthly "MEESAAQ" Lahore

Vol. 14	SEPTEMBER-OCTOBER 1967	No. 3-4

عزیز ساتھیو!

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے آپ نے ایک جماعتی نظم کے قیام کی قرارداد پر اتفاق کر لیا۔ میں اس پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کام کے لیے عزم و ہمت عطا فرمائے اور ہر قدم پر ہماری دست گیری اور رہنمائی فرمائے۔

میں اس موقع پر آپ کے سامنے یہ اعتراف کرتا ہوں کہ ہر چند اس کی ضرورت اور اہمیت مجھ پر واضح تھی لیکن میں دو سبب سے اس قسم کی کسی ذمہ داری سے گریز کرتا رہا۔ ایک تو یہ کہ اب میرے قویٰ ضعیف ہو رہے ہیں، کوئی بھاری بوجھ اٹھانا میرے لیے ممکن نہیں رہا۔ دوسرا یہ کہ زندگی کے آخری دَور کے لیے اپنے ذوق کے مناسب جو کام میں نے تجویز کر لیا تھا اب وقت و فرصت کا لمحہ لمحہ اسی پر صَرف کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ دوستوں کے شدید اصرار بلکہ دباؤ کے باوجود میں خود اس کے لیے پہل کرنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ دوستوں نے جب کبھی اس فریضہ کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی میں ان کے دلائل کا تو انکار نہ کر سکا لیکن اپنی کمزوریوں اور مجبوریوں پر نگاہ کر کے ان کی بات کو ٹالتا ہی رہا۔ میں یہ بھی محسوس کرتا رہا کہ اگرچہ میرے اوقات تمام تر دینی و علمی کاموں ہی میں بسر ہو رہے ہیں تاہم معاشرے سے متعلق مجھ پر جو فریضہ عائد ہوتا ہے اس میں مجھ سے کوتاہی ہو رہی ہے جس کے سبب سے نہ صرف میری بعض صلاحیتیں سکڑ رہی ہیں بلکہ اندیشہ اس بات کا ہے کہ اس پر مجھ سے مواخذہ ہو۔ ان تمام احساسات کے باوجود میں اپنے آپ کو معذور سمجھتا رہا جس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو معذور سمجھنے میں بڑا فیاض ہوتا ہے۔

بہر حال اب میں پورے شرح صدر کے ساتھ اس کام میں شریک ہوتا ہوں اور ان تمام دوستوں کا دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے اس عظیم فرض کی اہمیت کو سمجھا اور ہم سب کو اس کے سمجھانے کا اہتمام کیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی طرف سے ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

امین احسن اصلاحی

مکتوبِ گرامی جناب نعیم صدیقی

اور اس کا جواب

('میثاق' اگست ۱۹۹۰ء)

محترمی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

تازہ میثاق (جون ۱۹۹۰ء) کے ص ۳۳ پر میرا ذکر مجھے شرمسار کرنے کا باعث ہا' نجانے اور کتنے اصحاب پر کیا کیا اثرات پڑے ہوں گے۔

میں چونکہ میدانِ خلافیات سے زیادہ تر کنارے رہتا ہوں' نہ ڈائری رکھتا ہوں' نہ کسی کے متعلق یادداشتیں جمع رکھنے کی عادت ہے' اس لیے چند سال کی ایک بات اگر صحیح شکل میں سامنے نہ آئے تو اس کی وضاحت کرنے میں خاصی مشکل ہوتی ہے۔ مگر اتفاق سے وہ گفتگو ذہن میں ابھر آئی ہے اور اس کے بعض خاص جملے بھی' اس لیے آسانی ہوگئی ہے کہ تاریخ کے ریکارڈ کو درست رکھا جائے۔

یہ درست کہ آپ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی سالانہ کانفرنسوں کے سلسلے میں کسی وقت مجھ سے اچھرہ میں گھر پر ملے تھے مگر جو گفتگو ہوئی اس کی رپورٹنگ میں ایسی شکل سامنے آتی ہے کہ آپ تو بڑے جذبۂ اتحاد و تعاون سے آئے تھے مگر آپ کو جواب دیا گیا کہ آپ سے ہمارا شدید اختلاف ہے' اس لیے ''میری شرکت ناممکن ہے'' (بالفاظ ڈاکٹر صاحب) حالانکہ بات اختلاف کی نہ تھی بلکہ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ صورت تو عجیب سی ہو گی کہ آپ کی طرف سے ایک جانب تو محاذِ مخالفت گرم ہو اور دوسری جانب مجالس اور کانفرنسو میں ہم ایک دوسرے سے تعاون بھی چاہیں۔ اسی کے ساتھ میں نے کہا کہ میں کوئی تنہا فرد نہیں ہوں کہ جدھر چاہوں چل پڑوں' میں ایک جماعتی نظم کا پابند ہوں' میرے لیے یہ فیصلہ کرنا بطورِ خود مشکل ہے کہ میں کہاں جاؤں اور کہاں نہ جاؤں۔ تب آپ نے فرمایا کہ اچھا میں امیر جماعت سے اجازت لے دیتا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ کوئی پیچیدگی پیدا نہ

کیجیے۔فرض کیجیے میں کسی نہ کسی طرح آپ کے پلیٹ فارم پر پہنچ جاتا ہوں‘ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پورے پاکستان میں اکابر سے لے کر متفقین تک یہ سوال یا شبہ اٹھ کھڑا ہوگا کہ میں وہاں کیوں گیا جہاں سے ناوک اندازی بخلافِ جماعت ہو رہی ہے۔ میں کس کس کو خطوں میں اور زبانی طور پر جواب دیتا پھروں گا۔تب آپ نے فرمایا کہ پھر کوئی تدبیر بتائیے کہ اس صورتِ حالات کو درست کیا جا سکے۔ میں نے عرض کیا کہ سارے قضیے کے حل کے لیے ایک فقرہ کافی ہے جو آپ کی طرف سے شائع ہو جائے۔آپ نے دریافت فرمایا کہ آپ ذرا وہ فقرہ مجھے لکھ دیں یا لکھا دیں (یا بتا دیں)۔مگر دراصل میں نے اپنا منشا تو آپ تک سری یا اشاراتی طریق سے پہنچا دیا تھا۔ جب آپ سمجھ نہیں رہے تے اور سمجھ گئے تھے تو اسے اختیار نہیں کرنا چاہتے تھے تو میرا دماغ اتنا کھوکھلا نہیں کہ میں کوئی جملہ لکھ کر آپ سے واضح طور پر ’’نہ‘‘ سنوں۔جس طرح آپ مجھ سے ’’نہ‘‘ نہیں سننا چاہتے تھے‘ اسی طرح میں بھی ایسی ٹھوکر سے بچنا چاہتا تھا‘ چنانچہ میں نے آپ کو یہ جواب دیا کہ:

’’ڈاکٹر صاحب! آپ بہت ذہین ہیں‘ سوچنے‘ لکھنے اور بولنے پر قادر ہیں‘ آپ اس کے محتاج نہیں ہیں کہ کوئی دوسرا آدمی آپ کو جملہ مرتب کر کے دے‘‘۔

سیدھی سی بات ہے کہ آدمی جھگڑا ختم کرنا چاہتا ہو یا کسی نزاع وتصادم کی دلدل سے نکلنا چاہتا ہوں تو اس کا ذہن اسے ضروری الفاظ اور جملے فراہم کر دیتا ہے۔مگر ارادہ نیت کچھ اور ہو اور باہر سے لوگ جملے ٹھونسنا چاہیں تو بے کار ہے۔

آپ کے یہ الفاظ کہ ’’قرآنی پلیٹ فارم پر میرے ساتھ کیوں تشریف نہیں رکھ سکتے‘‘ بڑے خوب ہیں۔آپ قرآن کی بلندی سے فائدہ اٹھا کر خود بھی بلند ہو جاتے ہیں اور قارئین میں بھی بڑی جذباتی لہر اپنے حق میں پیدا کر لیتے ہیں۔اندازِ بیان کی یہ مہارتیں----- اہل سیاست میں اور طرح ہوتی ہیں اور اہل مذہب میں اور طرح کام کرتی ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ ہمارے پاس نظام اسلامی اور اقامت دین کا پلیٹ فارم ہ اور ہم طاغوتی اور لادینی قوتوں سے نبرد آزما ہیں۔اکوڑہ خٹک کے بزرگ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاتھ میں شریعت بل ہے‘ مولانا منظور احمد چنیوٹی فرماتے ہیں کہ ہمارے ہاتھ میں ختم نبوت کا

جھنڈا ہے۔ قادری صاحب کے پاس محبت رسالت کا پلیٹ فارم ہے' ایک پلیٹ فارم شہادتِ حسینؓ کا بھی ہے۔ سب اپنے ہیں مگر اصل سوال رویوں کا ہوتا ہے کہ کس کا رویہ کس سے کیا ہے۔ آپ نے قرآن کانفرنس تو کئی بار کر ڈالی مگر آپ سے یہ رویہ نہ چُھٹا اور آپ نے ہمارے خلاف جو کھیل شروع کیا وہ ختم نہ ہو سکا۔ آپ ایک ایک ریکارڈ یا ٹیپ کو بار بار اپنے قارئین کو سنواتے ہیں۔ قرآن آپ کو یہ نہیں سکھا سکا کہ آپ غلبۂ دین یا فروغِ دین یا اقامت دین کے لیے اگر دوسرے سرگرم کار دوستوں سے تعاون نہیں کر سکتے تو بلا وجہ تصادم نہ کریں۔ کوئی وضاحت ایک بار' دو بار کرنی ضروری تھی تو وہ ہو گئی۔ للہ آپ فاشزم' سیکولرازم' نظریۂ ارتقا' بے خدا جمہوریت' سودی نظام' کمیونزم' مغرب میں خاندانی زندگی کا انتشار (اور ان ساری بلاؤں کا عکس اپنے ہاں موجود ہے) وغیرہ موضوعات پر کام کرتے اور نوجوانوں سے کراتے۔ اسلامی قوانین و اخلاق کے ضابطے مرتب کراتے۔ اور نہیں تو قدیم اور جدید تر مستشرقین کی شرانگیزیوں پر توجہ صَرف کرتے' صلیبی مشنریوں کی سیاسی یلغار کا جائزہ لیتے۔

معلوم نہیں آپ نے یہ کس قرآن میں پڑھ لیا ہے کہ سارا انقلابِ اسلامی مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی کے خلاف دماغ اور زبان اور قلم کی قوتیں کھپا دینے سے رونما ہو جائے گا۔ بار بار تمہید میں تعریف' متن میں مخالفت اور بین السطور پر نہ جانے کیا کیا پیش کر کے آپ جو نامۂ اعمال بنا رہے ہیں وہ آخرت میں کیا نتیجہ دے گا بلکہ عین اس دنیا میں کیا؟

یہ تو بس کربلا کی سی داستان ہے کہ دوہراتے رہئے ماتم کرتے رہئے اور شامِ غم مناتے رہئے۔ آپ کا جی اس میں خوش ہے تو خوش رہے۔ آپ کا ایمان اس سے تازہ ہوتا ہے تو بار بار خوب اچھی طرح تازہ کیجئے اور آپ کے اخلاق میں علو آتا ہے اور آپ کی جماعت جادۂ انقلاب کو اس مشغلے کی وجہ سے جلد رطے کر سکتی ہے تو مبارک!

آپ اپنے معاملات' اپنے افکار اور اپنے رویوں کا خود بہت اچھا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ ہماری کیا مجال کہ بے وجہ دخل دیں۔

نیاز کیش

نعیم صدیقی (۱۴/۶/۹۰)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور

۱۸/ جولائی ۱۹۹۰ء

محترمی ومکرمی جناب نعیم صدیقی صاحب

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

گرامی نامہ محررہ ۱۴ جون ہمارے دفتر میں ۲۰ جون کو موصول ہو گیا تھا لیکن میرے مطالعے میں اپنے غیر ملکی سفر سے واپسی پر عید الاضحیٰ کے بعد آیا۔ آپ میرے بزرگوں میں سے ہیں، اور آپ کا غیظ وغضب اور تلخی وترشی سب میرے لئے ع ''کہ ہرچہ ساقی ما ریخت عین الطاف است!'' کے حکم میں ہے! بلکہ مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ کو بقول خود ''شرماسار'' اور میرے نزدیک کبیدہ خاطر ہونا پڑا۔ بہرحال آپ نے اتنے طویل خط کے لکھنے میں جو زحمت گوارا کی اس پر ممنون ہوں!

خط پڑھ کر سب سے پہلا اثر تو مجھ پر یہ ہوا کہ اپنے وہ الفاظ یاد آ گئے جو میں نے پورے تینتیس (۳۳) سال قبل رکنیت جماعت سے استعفےٰ کی تحریر کے آخر میں درج کئے تھے۔ استعفےٰ کی طویل تحریر کے حسب ذیل اقتباس کے خط کشیدہ الفاظ آپ کے خط پر میرے تاثر کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں:

> ''......اس دس سال کے عرصہ میں میری پوری دنیا جماعت ہی کے چھوٹے سے حلقہ میں محدود رہی ہے۔ تعلقات اور دوستیاں، محبتیں اور الفتیں حتیٰ کہ رشتے داریاں تک اسی حلقہ میں محدود رہیں۔ بیٹھا اٹھنا بھی اسی میں رہا اور ہنسنا بولنا بھی اسی میں رہا۔ اب دفعتۃً اس حلقہ سے انکلتے ہوئے دل ودماغ سخت صدمہ محسوس کر رہے ہیں۔ کتنے ہی بزرگوں سے مجھے والہانہ عقیدت ہے اور کتنے ہی ساتھیوں سے بے پناہ محبت ہے۔ جب میں سوچتا ہوں آج کے بعد شاید میرے بزرگ میری عقیدت

کی قدر نہ کریں اور میرے دوست میری محبت پر اعتماد نہ کریں تو دل اندر سے پکڑا سا جاتا ہے۔ پھر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جماعت کے بہت سے بزرگ مجھ سے بزرگانہ شفقت کا اور کتنے ہی ارکان و متفق مجھ سے حقیقی محبت کا تعلق رکھتے ہیں۔ جب سوچتا ہوں کہ آج اپنے اس اقدام سے میں نہ معلوم کتنوں کے جذبات کو مجروح کروں گا تو اپنے ہی آپ میں ایک ندامت کا احساس بھی ہوتا ہے لیکن اس سب کے باوجود اس اقدام پر مجبوراً اس لئے آمادہ ہو گیا ہوں کہ اب اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا''۔

ماخوذ از ''سرافگندیم'' صفحہ ۱۲۴

اس کے ساتھ ہی آٹھ دس سال قبل کے بعض واقعات کی فلم بھی شعور کی سکرین پر چلنے لگی۔ مثلاً ۱۹۴۸ء کی ایک شام کا واقعہ کہ جب گوال منڈی میں دفتر کوثر سے ملحق چھت پر جماعت اسلامی لاہور کے ایک اجتماع کے دوران نمازِ مغرب کا وقت آ گیا اور مولانا مودودی مرحوم اور بعض دوسرے اکابر جماعت سمیت سب لوگ قریب کی ایک تنگ سی گلی میں واقع مسجد میں نماز کے لیے گئے تو راستے میں میرے بڑے بھائی اظہار احمد صاحب نے آپ سے میرا تعارف کرایا اور یہ الفاظ کہے کہ ''اسے آپ سے بری محبت ہے'' تو آپ بڑی شفقت اور محبت کے ساتھ گفتگو کرتے رہے۔ یا مثلاً یہ کہ دسمبر ۱۹۵۱ء کے آخری دس ایام اور ۱۹۵۲ء کے موسم گرما کی تعطیلات کے پندرہ ایام کے دوران اسلامی جمعیت طلبہ کی تربیت گاہوں میں (جن میں' میں بحیثیت ناظم شریک تھا) آپ نے لٹریچر کا مطالعہ کرایا تو آپ سے بہت دلچسپ گفتگوئیں رہتی تھیں اور میں آپ کی شفقت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ کو خاصا زچ کیا کرتا تھا' یا مثلاً آپ کی بے شمار تقریریں جو میں نے دس سال کے عرصے میں سنیں اور جن کی بنا پر میری یہ رائے بنی کہ آپ نے اپنی تقریر میں مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی دونوں کے طرز خطاب کی خوبیوں کو جمع کر لیا ہے' یا مثلاً آپ کی بہت سی تحریریں جو میں نے پڑھیں بالخصوص وہ ''اشارات'' جو آپ نے مولانا مرحوم کی نظر بندی کے دوران تحریر فرمائے اور ان میں سے خاص طور پر وہ جن میں نظم جماعت کے تقاضوں' اور بالخصوص تنقید کے آداب و شرائط کی وضاحت فرمائی تھی' وقس علیٰ ہذا۔

اور اس کے ساتھ ساتھ آپ کے وہ بہت سے اشعار بھی کانوں میں رس گھولنے لگے جو میری لوحِ قلب پر نقش ہیں اور جن میں سے بعض میرے دروس وخطابات میں بارہا بے اختیار زبان پر آتے رہے ہیں: مثلاً

اے آندھیو سنبھل کے چلو اس دیار میں
امید کے چراغ جلائے ہوئے ہیں ہم!

یا آپ کی شاہکار نظم ''اٹھارہ سال'' اور خاص طور پر اس کا یہ ''دلدوز'' شعر کہ

وہ بد نصیب جو گر جائے اپنی آنکھوں سے
تم اپنی آنکھ پہ کیسے اسے بٹھاؤ گی!

......اسی طرح آپ کی شہدائے بالاکوٹ کے بارے میں نظم اور خصوصاً اس کا یہ بند

ہیں بالاکوٹ کی مٹی کے ذرے' ہماری آرزوؤں کے مزارات
ہیں ہر ذرے کی پیشانی پہ منقوش' ہمارے عزم کے خونیں نشانات!

وغیرہ وغیرہ!

آپ کی اس تصویر کے پس منظر میں جس کا تانا بانا متذکرہ بالا تاثرات سے قائم ہوا تھا جب میں نے آپ کے خط کے مندرجات پر غور کیا تو حیرت ہوئی کہ آپ نے اپنی اس تحریر میں میرے بیان کردہ واقعے کی پوری توثیق فرمائی' اور اس کے ضمن میں میری کسی بات کی نفی نہیں کی' تو پھر ریکارڈ کی وہ ''کجی'' کونسی تی جس کو آپ نے ''درست'' کرنے کی کوشش کی؟ میں آپ کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ آپ ن نہ صرف یہ کہ ''درست'' ریکارڈ کو ''درست'' ہی رکھا اور اس میں کوئی کجی پیدا نہ کی' بلکہ میرے اجمالی خاکے میں تفصیل کا مزید رنگ بھر کر میری بات کو مزید واضح اور میری ''حجت'' کو مزید محکم کر دیا! فجزاکم اللہ احسن الجزاء! میری حیرت اس بنا پر دو چند ہو جاتی ہے کہ اگرچہ میرے علم میں ہے کہ آپ کی صحت بالعموم اچھی نہیں رہتی' تاہم آپ ابھی بحمد اللہ اُس ''ارذل العمر'' کو نہیں پہنچے جس میں قوائے ذہنی مضمحل ہو جاتے ہیں' چنانچہ آپ کا حافظہ بھی ماشاءاللہ ابھی اس قدر قوی ہے کہ سترہ سال قبل کا مکالمہ آپ کو تفصیلاً یاد ہے۔ اندریں حالات آپ کی جانب سے اتنی غیر منطقی تحریر' یعنی چہ؟

۲۲ر جولائی

مصروفیات کے ہجوم اور فرصت کی کمی کے باعث آج چار روز بعد دوبارہ قلم ہاتھ میں لے سکا ہوں۔ اور اس دعا کے ساتھ بات دوبارہ شروع کر رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو میری معروضات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

خدارا ذرا غور فرمائیے کہ:

۱۔ آپ تسلیم فرماتے ہیں کہ قرآن کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ لے کر میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوا (یعنی ۷۳ء کی بات ہے جب ہم پہلی بار یہ کانفرنس منعقد کر رہے تھے)۔

۲۔ آپ نے اس کی بھی نفی نہیں فرمائی کہ اس کے بعد بھی یہ دعوت نامہ مسلسل آپ کی خدمت میں ارسال کیا جاتا رہا‘ تا آنکہ آپ نے اس پر تحریری طور پر اظہارِ ناراضگی فرمایا۔

۳۔ آپ نے اس کی بھی نفی نہیں فرمائی کہ آپ کے ابتدائی انکار اور اس کے ضمن میں یہ دلیل پیش کرے پر کہ تم مسلسل جماعت پر تنقید کر رہے ہو‘ میں نے عرض کیا تھا کہ کیا ولی خان‘ اصغر خان‘ مولانا نورانی وغیرہم جماعت پر شدید اور دل آزار تنقیدیں نہیں کرتے؟ تو اگر آپ سیاسی پلیٹ فارم پر اُن کے ساتھ جمع ہو سکتے ہیں تو قرآنی پلیٹ فارم پر میرے ساتھ کیوں نہیں بیٹھ سکتے؟ جس پر آپ نے زچ ہو کر فرمایا: ''کہ میں جانتا تھا کہ آپ یہی دلیل پیش کریں گے!'' تاہم جوابی دلیل کوئی پیش نہ کی!

اس سلسلے میں پندرہ سال بعد کی صورت حال بھی یہ ہے کہ خان عبدالولی خان صاحب نے جہادِ افغانستان کو فساد فی الارض اور جماعت اسلامی کو امریکہ کا ایجنٹ قرار دیا۔ اس کے بعد بھی جماعت آئی جے آئی کے ناتے سی او پی (COP) میں اُن کی حلیف ہے----- آج سے پینتیس چھتیس سال قبل کی یہ بات بھی آپ کو یقیناً یاد ہوگی کہ مولانا امین احسن اصلاحی برملا فرمایا کرتے تھے (جبکہ ابھی وہ خود جماعت میں شامل تھے) کہ ''اہل مذہب ہمیں (یعنی جماعت کو) بہروپئے سمجھتے ہیں‘ اور اہل سیاست کے نزدیک ہم چغد ہیں!!'' اس کے باوجود مسلسل تعاون اہل مذہب سے بھی رہا اور

اہل سیاست سے بھی! تو پھر اس پوری زمین پر اس آسمان کے نیچے کیا کُل کا کُل بیر اور بغض میرے ہی لیے رہ گیا ہے؟

۴۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزا دے کہ آپ نے یاد دلا دیا کہ میں نے تو آ کی شرکت کے لیے اجازت حاصل کرنے کے لیے امیر جماعت کے پاس حاضر ہونے کا ارادہ بھی ظاہر کیا۔ گویا میں نے تو اپنی حد تک ع ''میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا!'' پر عمل کر کے آپ پر حجت قائم کر دی لیکن آپ نے خود ہی اپنے خلاف مزید حجت قبول کر لی۔ ورنہ اگر آپ مجھے نہ روکتے اور انکار امیر جماعت کی طرف سے ہوتا تو کم از کم آپ پر یہ الزام نہ آتا۔ جیسا کہ بعد میں سید اسعد گیلانی صاحب کے معاملے میں ہوا کہ انہوں نے ہماری ایک تربیت گاہ میں شرکت پر آمادگی ظاہر فرما دی تھی' یہ دوسری بات ہے کہ میاں طفیل محمد صاحب نے منع فرما دیا----!

۵۔ اللہ آپ کو مزید جزا عطا فرمائے کہ آپ نے میرے حق میں' اور اپنے خلاف حجت بالائے حجت پیش فرما دی کہ میں نے تو آپ سے ع ''سپر انداختیم اگر جنگ است!'' پر عمل پیرا ہونے کے لیے آپ سے یہ بھی دریافت کیا کہ بتائیے میری جانب سے کس تحریر پر آپ مطمئن ہو سکتے ہیں؟ لیکن آپ نے اس سے بھی انکار کیا۔ مجھے اس سے ہرگز انکار نہیں ہے کہ عین ممکن ہے کہ میں آپ کی تجویز کردہ تحریر قبول نہ کر سکتا اس لیے کہ میں صرف مخالفت برائے مخالفت یا خواہ مخواہ کی محاذ آرائی کے تاثر کو ختم کرنے والی عبارت کو تو قبول کر سکتا تھا' اپنے حق اختلاف سے دست برداری اختیار نہیں کر سکتا تھا! تاہم اول تو ضروری نہیں تھا کہ یہی صورت پیش آتی' اس لیے کہ آپ بھی میرے حق اختلاف کی تو نفی نہیں کر سکتے تھے' بصورت دیگر بھی حجت مجھ پر قائم ہوتی نہ کہ ''حجت بالائے حجت'' کے طور پر آپ پر!!

حاصل کلام یہ کہ میں اس پر تو اللہ کا شکر اور آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے سیدھے ریکارڈ کو نہ صرف یہ کہ کج نہیں کیا بلکہ مزید سیدھا کر دیا----- لیکن ''محو حیرت ہوں'' کہ آپ نے یہ خط کس مقصد سے لکھا؟ اور اس سے کیا حاصل کیا؟؟

رہی آپ کے موقف کی اصل اساس اور آپ کے خط کا وہ ''محور'' جس کے گرد پوری تحریر گھوم رہی ہے' یعنی آپ کے نزدیک میرا جماعت کے خلاف مخالفت کا ''کھیل'' اور ''تصادم'' کا رویہ تو اس کے ضمن میں بھی اختصار کے ساتھ چند باتیں پیش خدمت ہیں' ذرا تحمل سے غور فرمائیں:

اولاً -----ذرا اپنے طرز خطاب پر نظر ثانی فرمائیں-----گویا

آپ ہی اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی !

ثانیاً ----- مجھے تسلیم ہے کہ ع ''مردی و نا مردی قدمے فاصلہ دارد!'' کے مصداق اختلاف اور مخالفت کے مابین فصل و بُعد بہت کم ہے لیکن میں چیلنج کرتا ہوں کہ سوائے اس کے کہ ایک خاص دَور میں اظہار اختلاف کے پیرایہ ''بیان'' اور اس کے ضمن میں الفاظ کے انتخاب مین میری جانب سے شدت ہوئی ہے (جس کا بارہا علیٰ رؤس الاشہاد اعتراف اور اعلان کر چکا ہوں) مجھے بتایا جائے کہ:-----(i) کیا میں نے کبھی ملانا مودودی مرحوم یا اُن کے اہل خانہ' یا جماعت کے کسی بھی دوسرے رہنما یا کارکن کے ذاتی کردار یا خانگی زندگی پر کوئی حملہ کیا؟ (ii) کیا میں نے جماعت اسلامی کے خلف کسی برسر اقتدار شخصیت یا جماعت اور اس کی سیاسی میدان میں کسی حریف جماعت کے ساتھ گٹھ جوڑ کیا؟ میں محمد یاسین وٹو موجود ہیں' ان سے پوچھ لیا جائے کہ کیا سابق صدر ایوب مرحوم اور نواب کالا باغ مرحوم کی ایک مجلس میں جماعت اسلامی کی مخالفت کے لیے آلہ' کار کے طور پر استعمال کرنے کے ضمن میں جب بعض دوسری شخصیات کے ساتھ مولانا امین احسن اصلاحی اور میرا نام لیا گیا تو اس مجلس میں یہ بات نہیں کی گئی کہ ان دونوں کو دوسروں پر قیاس نہ کیا جائے! شاید لاہور ٹیلی وژن کے عملے میں کوئی صاحب گواہی دے سکیں کہ بھٹو صاحب کے زمانے میں جب جماعت کی کردار کشی کے لیے بعض علماء کرام کی خدمات حاصل کی گئیں اور اس ضمن میں جماعت کے ''سابقون الاولون'' میں سے بھی ایک صاحب سکرین پر آئے' اس وقت جب مجھ سے رابطہ قائم کیا گیا اور میری جانب سے انکار پر اصرار میں یہاں تک کہا گیا کہ آپ

اپنے دین وایمان کی رو سے جو بات صحیح سمجھتے ہیں وہی کہیں، ہم کوئی قطع و برید نہیں کریں گے بلکہ "Live Telecast" کر دیں گے تو میں نے جواباً کہا کہ میں حب علیؓ کا قائل ہوں، بغضِ معاویہؓ کا نہیں!! میں اپنا اختلاف اپنے طور پر بیان کر رہا ہوں۔ اس کو کسی دوسرے کی تقویت کا ذریعہ نہیں بنا سکتا! خدارا سوچئے کہ کیا مخالفت کا ''کھیل'' کھیلنے والوں کا طرزِ عمل یہی ہوتا ہے!!

ثالثاً ----- جس طرح نادانستہ طور پر آپ ریکارڈ کو سیدھا کرنے کی کوشش میں اپنے آپ پر الزام در الزام لیتے چلے گئے، اسی طرح، معاف فرمائیے آپ نے مجھے مشورے دیتے ہوئے بعض بہت ہلکی اور جماعت کے اصل موقف کے صریحاً خلاف باتیں ارشاد فرما دی ہیں جن پر اگر آپ خود بھی دوبارہ غور کریں تو یقیناً ندامت محسوس کریں گے۔

خدارا غور فرمائیے کہ: (i) کیا ''اقامت دین کی جدو جہد'' آپ کا Exclusive پلیٹ فارم ہے؟ جس پر کسی اور کی موجودگی آپ کو گوارا نہیں۔ اور کیا آپ بھی اس پلیٹ فارم کو اسی انداز میں صرف اپنے گروہی مفادات کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں جیسے کہ بعض دوسرے لوگ اپنے اپنے مخصوص پلیٹ فارموں کو کر رہے ہیں؟ میرے نزدیک تو نہ صرف یہ کہ یہ جماعت کے موقف کے بالکل خلاف ہے بلکہ اس خلوص اور اخلاص کے بھی منافی ہے جو ع ''محبت چوں جواں گردد رقابت از میاں خیزد!'' کا تقاضا کرتا ہے۔ (ii) مزید برآں یہ طرزِ عمل اس حدیث نبویؐ کے بھی صریحاً خلاف ہے جس میں نہایت تاکیدی انداز میں فرمایا گیا کہ: ''**لا یومن احدکم حتی یحب لاخیه ما یحب لنفسه**''۔ (iii) ذرا اپنے دل میں جھانک کر دیکھئے کہ کیا آپ واقعتاً دین کی صرف علمی خدمت یا خدمت خلق کے کاموں کو اقامت دین کی اجتماعی جدو جہد کے برابر سمجھتے ہیں؟ (''**اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ**......'')

اسی طرح کیا آپ اور تحریک اسلامی کے جملہ کارکنان، جماعت اسلامی سے علیحدگی اختیار کرنے والے جملہ اکابر (مثلاً مولانا اصلاحی، مولانا عبدالغفار حسن، مولانا عبدالرحیم اشرف، وغیرہم) پر یہ الزام عائد نہیں کرتے کہ انہوں نے جماعت سے علیحدہ ہو کر محض

جزوی، علمی یا تعلیمی و تدریسی مساعی پر کیوں اکتفا کرلیا؟ اور کیوں نہ اقامت دین کی جدو جہد کے لیے اپنے پسندیدہ طریق کار کے مطابق اجتماعی جدو جہد کی ''کٹھن'' راہ اختیار کی؟ پھر یہ کیسا طرزِ عمل ہے کہ ایک کام انہوں نے نہیں کیا تو وہ بھی مجرم اور میں کرنے کی کوشش کروں تو میں بھی مجرم؟ اور یہ کیسا استدلال ہے کہ چت بھی اپنی اور پٹ بھی اپنی۔

محسوس ایسا ہوتا ہے کہ آپ حضرات انتخابی سیاست کی بھول بھلیوں میں ع ''کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے!'' کے مصداق اتنے گم ہو چکے ہیں کہ اپنی اصل اور اساسی دعوت کو بالکل بھول گئے۔ اگر برا نہ مانیں تو ذرا مولانا مودودی مرحوم کے مشہور اور مقبول پمفلٹ ''شہادتِ حق'' کا دوبارہ مطالعہ فرمالیں۔ خصوصاً اس کے (اسلامک پبلی کیشنز کے شائع کردہ چوالیسویں ایڈیشن کے) صفحات ۲۵ تا ۲۹ کا۔ شاید کہ آپ ''وز درونِ من نہ جُست اسرارِ من'' کے جس طرح عمل کے میرے بارے میں مرتکب ہو رہے ہیں اس پر آپ کو تنبّہ حاصل ہو جائے۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز!!

فقط والسلام مع الاکرام

دعا کا طالب

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

پس نوشت:

۱۔ الحمد للہ کہ میں نے کبھی بھی ''دعوت رجوع الی القرآن'' کو اپنا مخصوص (Exelusive) پلیٹ فارم نہیں سمجھا۔ اور اس پر اپنے ''مخالفین'' تک کو شریک کر کے خود اپنے آپ پر محض تنقید ہی نہیں، طنز و استہزاء کا بھی موقع دیا۔

۲۔ میں نے مولانا مودودی مرحوم کی شہادت حق والی دعوت کو شعوری طور پر قبول کر کے اپنی زندگی کا رخ تبدیل کیا تھا اور اس کے لیے میڈیکل پریکٹس کو تو اگرچہ میں نے ۱۹۷۱ء میں ترک کیا، لیکن اصل ''پروفیشن'' کو میں نے ۱۹۵۱ء ہی میں خیر باد کہہ دیا تھا۔ ورنہ مجھے اگر صرف خدمت خلق کے ذریعے دین کا کام کرنا ہوتا، یا جماعت کی صرف پیسے سے مدد کرنی ہوتی تو میرا پروفیشن اس کا بہترین ذریعہ بن سکتا تھا۔ اسی

طرح اگر میں کوئی علمی کام کرتا تو سائیکالوجی کے میدان میں کرتا جس سے مجھے طبعی مناسبت تھی۔ لیکن میں نے دعوتِ دین، شہادت علی الناس اور اقامت دین کے لیے اجتماعی جدوجہد کی دعوت کو شعوری طور پر قبول کیا تھا، اور آج کے دن تک بحمداللہ اس پر کاربند وگامزن ہوں۔

۳۔ آپ نے اثنائے ملاقات میں میرے سامنے میرے بعض ہم عصر اور ہم عمر ساتھیوں کا بھی تذکرہ کیا تھا، تو اس ضمن میں نوٹ کر لیجیے کہ آرٹس اور Humanities کے طلبہ کے لیے تو تحریکی اور سیاسی سرگرمی ان کے پیشے کے لیے مفید اور مؤید ہوتی ہے لیکن سائنس اور ٹیکنالوجی کے طلبہ کے لیے ایسی سرگرمی اپنے پروفیشن کو چھوڑے بغیر ممکن نہیں ہوتی!

========================

(نوٹ: مولانا مودودی مرحوم کی تقریر ''شہادتِ حق'' کا محولہ بالا اقتباس اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں)

اقتباس از

شہادتِ حق

تالیف: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم

ہمارا طریقۂ کار

"-----سب سے پہلے ہم مسلمانوں کو ان کا فرض یاد دلاتے ہیں اور انہیں صاف صاف بتاتے ہیں کہ اسلام کیا ہے' اس کے تقاضے کیا ہیں' مسلمان ہونے کے معنی کیا ہیں اور مسلمان ہونے کے ساتھ کیا ذمہ داریاں آدمی پر عائد ہوتی ہیں۔

اس چیز کو جو لوگ سمجھ لیتے ہیں ان کو پھر ہم یہ بتاتے ہیں کہ اسلام کے سب تقاضے انفرادی طور پر پورے نہیں کئے جا سکتے۔ اس کے لیے مجموعی سعی ضروری ہے۔ دین کا ایک بہت ہی قلیل حصہ انفرادی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کو تم نے قائم کر بھی لیا تو نہ پورا دین ہی قائم ہوگا اور نہ اس کی شہادت ہی ادا ہو سکے گی بلکہ جب اجتماعی زندگی پر نظامِ کفر مسلط ہو تو خود انفرادی زندگی کے بھی بیشتر حصوں میں دین قائم نہ کیا جا سکے گا اور اجتماعی نظام کی گرفت روز بروز اس انفرادی اسلام کی حدود کو گھٹاتی چلی جائے گی۔ اس لیے پورے دین کو قائم کرنے اور اس کی صحیح شہادت ادا کرنے کے لیے قطعاً ناگزیر ہے کہ تمام ایسے لوگ جو مسلمان ہونے کی ذمہ داریوں کا شعور اور انہیں ادا کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں' متحد ہو جائیں اور منظّم طریقے سے دین کو عملاً قائم کرنے اور دنیا کو اس کی طرف دعوت دینے کی کوشش کریں اور ان مزاحمتوں کو راستہ سے ہٹائیں جو اقامت و دعوتِ دین کی راہ میں حائل ہوں۔

نظم جماعت

یہی وجہ ہے کہ دین میں جماعت کو لازم قرار دیا گیا ہے اور اقامت دین اور دعوتِ دین کی جدوجہد کے لیے ترتیب یہ رکھی گئی ہے کہ پہلے ایک نظم جماعت ہو پھر خدا کی راہ میں سعی و جہد کی جائے اور یہی وجہ ہے کہ جماعت کے بغیر زندگی کو جاہلیت کی زندگی اور جماعت سے علیحدہ ہو کر رہنے کو اسلام سے علیحدگی کا ہم معنی قرار دیا گیا ہے۔[1]

کام کے تین راستے

جو لوگ اس بات کو بھی سمجھ لیتے ہیں اور اس فہم سے ان کے اندر مسلمان ہونے کی ذمہ داری کا احساس اس حد تک قوی ہو جاتا ہے کہ اپنے دین کی خاطر اپنی انفرادیت اور خود پرستی

---

(۱): اشارہ ہے اس حدیث کی طرف جس میں نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

اَنَا اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ اللّٰهُ اَمَرَنِیْ بِهِنَّ اَلْجَمَاعَةُ، وَالسَّمْعُ وَ الطَّاعَةُ، وَالْهِجْرَةُ، وَالْجِهَادُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ، فَاِنَّهٗ مَنْ خَرَجَ مِنَ الْجَمَاعَةِ قِیْدَ شِبْرٍ فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْاِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهٖ اِلَّآ اَنْ یُّرَاجِعَ۔ وَ مَنْ دَعَا بِدَعْوَىٰ جَاهِلِیَّةٍ فَهُوَ مِنْ جُثَی جَهَنَّمَ۔ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ اِنْ صَامَ وَ صَلّٰی؟ قَالَ وَ اِنْ صَلّٰی وَ صَامَ وَ زَعَمَ اَنَّهٗ مُسْلِمٌ۔ (احمد و حاکم)

''میں تم کو پانچ چیزوں کا حکم دیتا ہوں جن کا حکم اللہ نے مجھے دیا ہے۔(۱) جماعت۔(۲) سمع۔(۳) طاعت۔(۴) ہجرت۔(۵) خدا کی راہ میں جہاد۔ جو شخص جماعت سے بالشت بھر بھی الگ ہوا اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے اتار پھینکا' الا یہ کہ وہ پھر جماعت کی طرف پلٹ آئے۔اور جس نے جاہلیت (یعنی افتراق و انتشار) کی دعوت دی وہی جہنمی ہے۔صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ اگر چہ وہ روزہ رکھے اور نماز پڑھے؟ فرمایا: ہاں اگر چہ وہ نماز پڑھے اور روزہ رکھے اور مسلمان ہونے کا دعویٰ کرے''۔

(۱) کارِ دین کی صحیح ترتیب یہ ہے کہ پہلے جماعت ہو اور اس کی ایسی تنظیم ہو کہ سب لوگ کسی ایک کی بات سنیں اور اس کی اطاعت کریں' پھر جیسا بھی موقع ہو اس کے لحاظ سے ہجرت اور جہاد کیا جائے۔ ◄◄ ◄◄

کو قربان کر کے جماعتی نظم کی پابندی قبول کر لیں' ان سے ہم کہتے ہیں کہ اب تمہارے سامنے تین راستے ہیں اور تمہیں پوری آزادی ہے کہ ان میں سے جس کو چاہو اختیار کرو۔ اگر تمہارا دل گواہی دے کہ ہماری دعوت' عقیدہ' نصب العین' نظام جماعت اور طریق کار سب کچھ خالص اسلامی ہے اور ہم وہی کام کرنے اُٹھے ہیں جو قرآن و حدیث کی رو سے امت مسلمہ کا اصل کام ہے تو ہمارے ساتھ آ جاؤ۔ اگر کسی وجہ سے تمہیں ہم پر اطمینان نہ ہو اور کوئی دوسری جماعت تم کو ایسی نظر آتی ہو جو خالص اسلامی نصب العین کے لیے اسلامی طریق پر کام کر رہی ہو تو اس میں شامل ہو جاؤ۔ ہم خود بھی ایسی جماعت پاتے تو اسی میں شامل ہو جاتے کیونکہ ہمیں ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ چننے کا شوق نہیں ہے۔ اور اگر تم کو نہ ہم پر اطمینان ہے نہ کسی دوسری جماعت پر تو پھر تمہیں اپنے فرض اسلامی کو ادا کرنے کے لیے خود اٹھنا چاہیے اور اسلامی طریق پر ایک ایسی جماعت بنانی چاہیے جس کا مقصد پورے دین کو قائم کرنا اور قول و عمل سے اس کی شہادت دینا ہو۔ ان تینوں صورتوں میں سے جو صورت بھی تم اختیار کرو گے انشاء اللہ حق پر ہو گے۔ ہم نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا اور نہ بسلامتی ہوش و حواس ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ صرف ہماری ہی جماعت حق پر ہے اور جو ہماری جماعت میں نہیں ہے وہ باطل پر ہے۔ ہم نے کبھی لوگوں کو اپنی جماعت کی طرف دعوت نہیں دی ہے۔ ہماری دعوت تو صرف اُس فرض کی طرف ہے جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم پر

◄◄ (۲) جماعت سے علیحدہ ہو کر رہنا گویا اسلام سے علیحدہ ہونا ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اس زندگی کی طرف واپس جا رہا ہے جو اسلام سے قبل زمانۂ جاہلیت میں عربوں کی تھی کہ ان میں کوئی کسی کی سننے والا نہ تھا۔

(۳) اسلام کے بیشتر تقاضے اور اس کے اصل مقاصد جماعت اور اجتماعی سعی ہی سے پورے ہو سکتے ہیں۔ اسی لیے حضورؐ نے جماعت سے الگ ہونے والے کو اس کی نماز اور روزے اور مسلمانی کے دعوے کے باوجود اسلام سے نکلنے والا قرار دیا۔ اسی مضمون کی شرح ہے جو حضرت عمرؓ نے اپنے اس ارشاد میں فرمائی ہے کہ لا اسلام الا جماعة. (جامع بیان العلم لابن عبدالبر)

اورآپ پر یکساں عائد ہوتا ہے۔اگرآپ اس کوادا کررہے ہیں، برحق ہیں خواہ ہمارے ساتھ مل کرکام کریں یا نہ کریں۔البتہ یہ بات کسی طرح درست نہیں ہے کہ آپ نہ خود اُٹھیں، نہ کسی اُٹھنے والے کا ساتھ دیں اورطرح طرح کے حیلے اور بہانے کرکے اقامت دین اورشہادت علی الناس کے فریضے سے جی چرائیں یا اُن کاموں میں اپنی قوتیں خرچ کریں جن سے دین کے بجائے کوئی دوسرا نظام قائم ہوتا ہواوراسلام کے بجائے کسی اور چیز کی گواہی آپ کے قول وعمل سے ملے۔معاملہ دنیا اوراس کے لوگوں سے ہوتا تو حیلوں اور بہانوں سے کام چل سکتا تھا، مگر یہاں تواس خدا کیساتھ معاملہ ہے جوعلیم بذات الصدور ہے۔اُسے کسی چال بازی سے دھوکا نہیں دیا جاسکتا۔

مختلف دینی جماعتیں

اس میں شک نہیں کہ ایک ہی مقصد اورایک ہی کام کے لیے مختلف جماعتیں بننا بظاہر غلط معلوم ہوتا ہے اوراس میں انتشار کا بھی اندیشہ ہے مگر جب نظامِ اسلامی درہم برہم ہو چکا ہواورسوال اس نظام کے چلانے کا نہیں بلکہ اس کے ازسرنو قائم کرنے کا ہوتوممکن نہیں ہے کہ ابتدا ہی میں وہ الجماعۃ وجود میں آجائے جوتمامات کوشامل ہو،جس کا التزام ہرمسلمان پر واجب ہواورجس سے علیحدہ رہنا جاہلیت اور علیحدہ ہونا ارتداد کا ہم معنی ہو۔آغاز کار میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ جگہ جگہ مختلف جماعتیں اس مقصد کے لیے بنیں اوراپنے اپنے طور پر کام کریں۔یہ سب جماعتیں بالآخر ایک ہو جائیں گی اگرنفسانیت اورافراط وتفریط سے پاک ہوں اورخلوص کے ساتھ اصل اسلامی مقصد کے لیے اسلامی طریق پرکام کریں۔حق کی راہ میں چلنے والے زیادہ دیر تک الگ نہیں رہ سکتے۔حق ان کوجمع کرکے ہی رہتا ہے کیونکہ حق کی فطرت ہی جمع وتالیف اور وحدت ویگانگت کی متقاضی ہے۔تفرقہ صرف اُس صورت میں رونما ہوتا ہے جب حق کے ساتھ کچھ نہ کچھ باطل کی آمیزش ہو یا اوپرحق کی نمائش ہواوراندر باطل کام کررہا ہو"۔

ضمیمہ

تحریک اسلامی کے قائد و امیر کے حقوق و اختیارات کے موضوع پر

مولانا مودودی مرحوم کی ایک اہم تحریر

(بشکریہ ہفت روزہ ''آئین'' لاہور)

جماعت اسلامی کے صحافتی حلقے کا ایک جریدہ ہفت روزہ ''آئین'' آج کل ماہانہ شائع ہو رہا ہے۔ اس کی اشاعت بابت ربیع الاول ۱۴۱۰ھ میں جماعت اسلامی پاکستان کے اجتماعِ ارکان منعقدہ فروری ۱۹۵۷ء بمقام ماچھی گوٹھ کا ذکر آیا ہے۔ اور اس کے ضمن میں مولانا مودودی مرحوم کی ایک تقریر شائع کی گئی ہے جو ''مبینہ طور پر'' مولانا موصوف نے ماچھی گوٹھ کے کُل پاکستان اجتماعِ ارکان میں کی تھی۔

ماچھی گوٹھ کے اجتماع پر ان سطور کی تحریر کے وقت تقریباً ثلث صدی بیت چکی ہے۔ اس عرصے کے دوران بہت سا پانی وقت کے دریا میں بہہ چکا ہے' چنانچہ نہ صرف مولانا مودودی بلکہ اجتماع کے ناظم و صدر یعنی چوہدری غلام محمد سمیت بہت سی شخصیتیں راہی ملک بقا ہو چکی ہیں (اللہ ان سب کی مغفرت فرمائے)۔ اور بہت سی باتیں طاقِ نسیان کے حوالے ہو چکی ہیں۔ بنابریں واقعات کی تفاصیل کے ضمن میں کوئی تسامح بعید از قیاس نہیں۔ تاہم جماعت اسلامی سے منسلک کسی شخص سے' بالخصوص جبکہ وہ اجتماع میں شرکت کا دعویدار بھی ہو' ایسی فاش غلطی حیرت انگیز ہے کہ ایک ایسی تقریر کو ماچھی گوٹھ کے ارکانِ جماعت کے اجتماعِ عام سے منسوب کر دیا گیا ہے جو وہاں کسی محدود اور منتخب نشست میں ہوئی ہو تو دوسری بات

ہے' جملہ ارکانِ جماعت کے کھلے اجلاسِ عام میں ہرگز نہیں ہوئی!

تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ مضمون نگار ۵۷-۵۶ء کے بحرانی دَور میں جماعت کے مرکزی دفتر میں بطور ٹائپسٹ ملازم تھے اور مولانا مودودی کی اس تقریر کا مسودہ انہوں نے خود ٹائپ کیا تھا جو اب انہیں کہیں پر ان کاغذات میں دستیاب ہو گیا ہے' چنانچہ گمان غالب یہ ہے کہ ایک تہائی صدی قبل کی پوری تفاصیل تو انہیں یاد نہیں رہیں' تاہم انہوں نے خیال کیا کہ جب ایک تقریر اس اہتمام سے لکھی ہی نہیں' ٹائپ بھی کرائی گئی تھی تو بالفعل اجتماع میں کی بھی گئی ہو گی۔ چنانچہ اس کے ساتھ کچھ سابقہ اور لاحقہ اپنے تصور کے بل پر لگا کر انہوں نے اسے آب و تاب سے شائع کر دیا۔ واللہ اعلم!!

اس ''سابقہ'' اور ''لاحقہ'' میں جو کرم فرمائی انہوں نے اُن لوگوں پر کی ہے جنہوں نے اُس موقع پر مولانا مودودی کی بعض آراء اور اقدامات سے اختلاف کیا تھا اور جو سبّ وشتم اور رکیک حملے ان کی شخصیتوں پر روا رکھے ہیں' ان سے قطع نظر' مولانا مرحوم کی اس ''تحریر'' کی اشاعت کے لیے ہم مضمون نگار کے شکر گزار ہیں۔ اس لیے کہ اس کے ذریعے تحریک اسلامی کے قائد و امیر کے حقوق و اختیارات کے ضمن میں مولانا مرحوم کا ذہن پوری طرح واضح ہو کر سامنے آ گیا ہے!

اور چونکہ یہ ایک ایسا اہم اور بنیادی مسئلہ ہے جس سے اقامت دین کی جدو جہد کرنے والی ہر جماعت اور تنظیم کو لازماً سابقہ رہتا ہے' لہٰذا ہم اسے ''من و عن'' شائع کر رہے ہیں' تاکہ اس اہم مسئلے کے بارے میں دورِ حاضر کے ایک معروف داعی اسلام اور قائد تحریک اسلامی کے تصورات سب کے سامنے آ جائیں۔

''خطاب'' مولانا مودودی مرحوم

''محترم رفقاء

میں نے اپنے ایک سے زیادہ بیانات میں آپ سے وعدہ کیا ہے کہ اس اجتماع کے موقع پر میں آپ کو یہ بتاؤں گا کہ میں جماعت کی امارت سے کیوں الگ ہونا چاہتا ہوں' اس منصب سے علیحدگی کیوں ضروری ہوگئی ہے' اور میرے خیال میں اب اس تحریک اور جماعت کے نظام کو چلانے کے لیے مناسب صورت کیا ہے۔

مجھے یہ معاملہ آپ کے سامنے ایک بڑے نازک موقع پر پیش کرنا پڑ رہا ہے۔ ایک طرف میرا یہ فرض ہے کہ معاملے کا ہر پہلو آپ کے سامنے بے کم و کاست پیش کر دوں' کیونکہ اس کے بغیر آپ کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے۔ مگر دوسری طرف مجھ پر یہ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ اسے پیش کرنے میں ہر ایسے طریقے سے اجتناب کروں جو کسی خرابی کا موجب ہو' تاکہ آپ اس پر ایک تصفیہ طلب مقدمے کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک حل طلب مسئلے کی حیثیت سے بے لاگ طور پر غور کر سکیں۔ میں اپنے بیان میں ان دونوں باتوں کو ملحوظ رکھنے کی پوری کوشش کرونگا۔ مگر اس میں میری کامیابی ایک حد تک آپ حضرات کی مدد پر بھی منحصر ہے۔ آپ میری مدد اس طرح کر سکتے ہیں کہ جن امور کو میں آپ کے سامنے اجمال کے ساتھ پیش کروں آپ ان کی تفصیل نہ مجھ سے دریافت کریں اور نہ خود ان کی کھوج میں لگ جائیں۔ میں ان کو صرف اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ آپ پوری طرح اس صورتِ حال سے باخبر ہو جائیں جو مجھے اور جماعت کو اس وقت درپیش ہے' اور اس غرض کے لیے ان کا صرف اجمالی بیان کافی ہے بشرطیکہ آپ مجھ پر یہ اعتماد کریں کہ میں آپ کے سامنے حقیقی صورتِ حال رکھ رہا ہوں۔ یہ احتیاط آپ ملحوظ نہ رکھیں گے تو ہر چیز کی تفصیل ایک مقدمہ بن جائے گی اور آپ اپنے نصب العین کے لیے آگے کچھ کام کرنے کے بجائے انہی مقدمات میں اُلجھ کر رہ جائیں گے۔

اب میں آپ کے سامنے اصل معاملہ پیش کرتا ہوں۔

آپ جانتے ہیں کہ جماعت اسلامی، جس میں آپ شامل ہوئے ہیں، صرف ایک جماعت یا انجمن نہیں ہے، بلکہ ایک تحریک کی علمبردار جماعت ہے۔ یہ بھی آپ جانتے ہیں کہ یہ جماعت جس تحریک کی علمبردار ہے وہ کوئی محدود نوعیت کی تحریک نہیں، بلکہ پورے نظام زندگی میں ہمہ گیر تغیر وانقلاب اور اصلاح وتغیر کی تحریک ہے۔ اس بات سے بھی آپ واقف ہیں کہ یہ تحریک کامیابی کی منزل پر پہنچ نہیں چکی ہے بلکہ جدوجہد اور کشمکش کے کٹھن مراحل سے گزر رہی ہے اور ابھی نہ معلوم کتنی مدت تک اسے انہی مراحل سے گزرنا ہے۔ یہ بھی آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ اس جدوجہد کا کوئی ایک محاذ نہیں بلکہ بیسیوں محاذ ہیں، اور یہ کشمکش کسی ایک طاقت سے نہیں بلکہ ان بے شمار اندرونی اور بیرونی طاقتوں سے ہے جو اسلامی نظام زندگی کے قیام میں شعوری یا غیر شعوری طور پر مزاحم ہیں۔ یہ سب حقیقتیں اگر آپ کے ذہن میں تازہ نہیں ہیں تو براہِ کرم اب تازہ کر لیجیے، کیونکہ اس کے بغیر آپ اس مسئلے کی نزاکت پوری طرح محسوس نہیں کر سکتے جسے میں آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں۔

جو جماعت اس طرح کی ایک تحریک چلا رہی ہو اس میں قیادت کا مقام اگر کسی ایک شخص کو دیا جائے تو اسے بیک وقت دو مختلف نوعیت کے کام کرنے پڑتے ہیں۔ ایک، تحریک کی رہنمائی۔ دوسرے، نظامِ جماعت کی سربراہی۔ یہ دونوں کام صرف نوعیت ہی میں ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں بلکہ ان کے تقاضے بسا اوقات ایک دوسرے کی ضد ہو جاتے ہیں اور ایک شخص کے لیے ہر حالت میں ان دونوں کو ایک ساتھ پورا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ آپ ذرا تجزیہ کر کے دیکھیں تو دونوں کا فرق اور ان کو ایک ساتھ نباہنے کی دشواری آپ کے سامنے واضح ہو جائے۔

نظامِ جماعت کو چلانا ایک انتظامی نوعیت کا کام ہے۔ وہ لامحالہ ایک دستور چاہتا ہے، خواہ وہ تحریری دستور ہو یا رواجی۔ اس کے سربراہ کی حیثیت ایک صدر انجمن، ایک ناظم یا ایک ایگزیکٹو آفیسر سے مختلف نہیں ہو سکتی۔ اس کو لازماً کچھ مقرر اختیارات دیئے جائیں گے اور کچھ حدود کا پابند کیا جائے گا۔ وہ ان حدود اور اختیارات سے تجاوز بھی نہیں کر سکتا، اور ساتھ ہی اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اگر اسے انتظام چلانا ہے تو ان حدود کے اندر کسی نہ کسی

وقت اپنے اختیارات کو استعمال بھی کرے، خواہ کسی کو گوارا ہو یا ناگوار۔ انتظام کے معاملے میں محبت کا کوئی سوال نہیں۔ وہ تو نظم کے تقاضے پورے کرنے کا طالب ہے۔ پھر جماعت کا نظام یہ چاہتا ہے کہ اس کے سب کام ایک لگے بندھے ضابطے پر چلیں۔ اس میں مشورے اور معاملات کے فیصلے کا ایک طریقہ مقرر ہو۔ اس میں نیچے سے اوپر تک تمام متعلقہ اداروں اور ان سے متعلق رکھنے والے اشخاص کے حدود اور حقوق اور اختیارات معین ہوں۔ اور اس میں ناظم اعلیٰ سے لے کر ایک ابتدائی رکن یا کارکن تک کسی کو نہ اپنی حد سے نکلنے کا حق ہو نہ دوسرے کی حد میں داخل ہونے کا۔ اس میں ہر فیصلے کے متعلق یہ سوال اُٹھایا جا سکتا ہے کہ وہ ضابطہ کے مطابق ہوا ہے یا نہیں۔ اس میں ہر حکم کے متعلق یہ بحث پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ قاعدے کے اندر ہے یا باہر۔ اس میں پیدا ہونے والی نزاعات نہ صرف جماعت کے اندر تصفیہ طلب ہو سکتی ہیں، بلکہ ملکی عدالتوں میں بھی جا سکتی ہیں اور پبلک میں بھی بحث کا موضوع بن سکتی ہیں۔ یہ سب کچھ ایک منظّم ادارے کی شکل میں کام کرنے کے قدرتی لوازم ہیں۔

علاوہ بریں اگر ایسے کسی ادارے کو جمہوری طرز پر چلنا ہو تو اس میں اختلافات کا دروازہ کھلا ہونا چاہیے۔ فروعی ہی نہیں اصولی اختلاف کی بھی گنجائش ہونی چاہیے۔ اظہار رائے ہی کی نہیں، اپنے نقطۂ نظر کے حق میں دوسروں کی رائے ہموار کرنے کی بھی آزادی ہونی چاہیے۔ اس میں پارٹیاں اور گروپ بننا جمہوریت کا فطری تقاضا ہے۔ اس میں اپوزیشن بھی ہو سکتی ہے اور سربراہ کی اپنی پارٹی بھی۔ نظم و نسق اکثریت کے ہاتھ میں بھی رہ سکتا ہے اور مخلوط بھی ہو سکتا ہے، فیصلے تقسیم آراء سے بھی ہو سکتے ہیں اور مختلف گروپوں کی مصالحت سے بھی۔ ادارے کے سربراہ کا کام بہر حال اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ جمہوری فیصلوں کو نافذ کر لے۔ جمہوریت خود یہ چاہتی ہے کہ اس میں کسی کا بی اتنا زور نہ ہو کہ وہ ایک جمہوری ادارے کو اپنی رائے کے مطابق چلائے۔ جو شخص بھی ایسا زور آور بنتا نظر آ رہا ہو، جمہوری مزاج خود بخود اس کا زور توڑنے پر مائل ہو جائے گا۔

ایک تحریک کا مزاج، خصوصاً جبکہ وہ کشمکش اور جدوجہد کے مراحل میں ہو، اس سے بالکل مختلف ہے اور اس کو چلانے کے مقتضیات کچھ دوسرے ہیں۔ تحریکیں دستوروں پر نہیں

چلا کرتیں، ضابطوں کی بندش میں نہیں جکڑی جا سکتیں۔ اختلافات، خصوصیت کے ساتھ اصولی اور نظریاتی اختلافات، ان کے لیے سم قاتل ہیں۔ اندرونی پارٹیوں اور گروپوں کا ظہور ان کے لیے پیغام موت ہے۔ ان کے اندر نزاعات کا پیدا ہونا ہی خطرناک ہے کجا کہ کوئی نزاع ایک مقدمے کی صورت اختیار کرے اور تحریک کے چلانے والے اس میں ایک دوسرے کے مقابل فریق ہوں۔ تحریک کا مزاج وحدتِ فکر، وحدتِ قلب و روح اور زیادہ سے زیادہ وحدتِ عمل چاہتا ہے۔ اس سے تعلق رکھنے والوں کے دلوں اور دماغوں اور طبیعتوں میں جتنی ہم آہنگی اور سعی و حرکت میں جتنی مطابقت ہو، اتنی ہی وہ طاقت ور ہے اور جتنا ان کے درمیان فرق ہو اتنی ہی وہ کمزور ہے۔ ایک تحریک کی ہوا اکھاڑ دینے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ اس کے دو ترجمان دو مختلف زبانوں سے بولنا شروع کر دیں، یا ایک فکر پر چلتے چلتے یکا یک اس میں دوسری فکر یا بہت سے مخلوط افکار کا رنگ جھلکنے لگے۔ تحریکوں میں اکثریت و اقلیت کا سوال پیدا ہونا سرے سے غلط ہے۔ جس تحریک میں یہ قاعدہ چلنے لگے کہ فیصلے اکثریت سے ہوں گے، یا اقلیت و اکثیرت کے درمیان سمجھوتے سے مخلوط پالیسیاں بنائی جائیں گی، اسے کوئی چیز شکست اور ناکامی سے نہیں بچا سکتی۔ کامیابی کا امکان اگر ہے تو اسی تحریک کے لیے ہے، جس کا ہر قدم پوری جماعت کے قلبی فیصلے سے اُٹھے، جس کے ہر فیصلے کو پوری جماعت ہی نہیں، اس کی فکر سے متاثر ہونے والا وسیع ترین حلقہ بھی یوں محسوس کرے کہ گویا یہ اس کے دل کی آواز اور اس کی روح کی مانگ ہے، اور جس سے تعلق رکھنے والوں کو دنیا ہر جگہ ہم رنگ، ہم زبان اور ہم مزاج پائے۔

یہ تو ہے ایک تحریک اور ایک جمہوری ادارے کے فرق کا ایک پہلو۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ایک تحریک کو چلانے والے رہنما کی حیثیت اور اس کے کام کی نوعیت ایک جمہوری ادارے کے سربراہ سے بنیادی طور پر مختلف ہوتی ہے۔ تحریک کی فطرت ایک ایگزیکٹو آفیسر نہیں چاہتی جو تحریک سے تعلق رکھنے والوں، یا ان کے نمائندوں کے فیصلے نافذ کیا کرے، بلکہ وہ ایک ایسا رہنما چاہتی ہے جو اس کی فکر کا ترجمان اور اس کے مزاج کا نمائندہ ہو، جسے تحریک کے اندر بھی اور باہر ساری دنیا میں بھی اس کا ترجمان اور نمائندہ مانا جائے۔ جس کو یہ حیثیت

حاصل ہو کہ پورے اعتماد کے ساتھ اپنی تحریک کی طرف سے بولے اور پوری تحریک اس کی آواز میں آواز ملا دے۔ اس کی جماعت میں اس کا زور کسی ضابطے اور نظام کے بل پر نہیں بلکہ اس کی فکری قیادت اور اس کے اخلاقی اثر کے بل پر ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ جماعت کے لوگوں کا تعلق کسی دباؤ سے نہیں بلکہ گہری محبت اور قلبی لگاؤ پر مبنی ہونا چاہیے۔ اس کے ماتحت جماعت کا ڈسپلن امارت کی دھونس سے نہیں بلکہ دل کی سمع و طاعت سے قائم ہونا چاہیے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس شخص کو جدوجہد اور کشمکش کے دَور میں کسی تحریک کی رہنمائی کرنی ہو وہ کبھی ان جمہوری طریقوں سے کام نہیں چلا سکتا جو صرف انتظامی اداروں کی سربراہی کے لیے موزوں ہوتے ہیں۔ اس کے کام کی نوعیت اس کمانڈر کے کام سے ملتی جلتی ہوتی ہے جو میدانِ جنگ میں فوج کی قیادت کر رہا ہو۔ وہ دیے ہوئے نقشوں پر فوج کو نہیں لڑا سکتا۔ اپنے نقشے اسے خود سوچنے اور بنانے پڑتے ہیں۔ وہ ہر وقت کونسلیں بلا کر اور ان سے پوچھ پوچھ کر کام نہیں کر سکتا۔ اس کو بسا اوقات فیصلہ کرنے کے لیے گھنٹوں اور منٹوں کی مہلت بھی نہیں ملتی۔ وہ مشورے لے بھی سکتا ہے اور اسے مشورے دیئے بھی جا سکتے ہیں، لیکن اگر تحریک اس کو چلانی ہے تو فیصلہ مشیروں کے ہاتھ میں نہیں، اس کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ اگر پہل (Initiative) اس کے اختیار میں نہ ہو تو وہ کمانڈر نہیں سپاہی ہے۔ اس کو فوج پر یہ اعتماد ہونا چاہیے کہ وہ اس کی اطاعت کرے گی اور فوج کو اس پر یہ اعتماد ہونا چاہیے کہ وہ بروقت اور صحیح فیصلہ کرے گا۔ اس کے اور فوج کے درمیان مشیر حائل نہیں ہو سکتے۔ مشترکہ کمانڈر کا حشر میدانِ جنگ میں وہ ہوا کرتا ہے جو ساجھے کی ہنڈیا کا حشر چوراہے میں ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کے اور فوج کے درمیان لگے بندھے قاعدے اور ضابطے بھی حائل نہیں ہو سکتے۔ اسے یہ بھروسہ ہونا چاہیے کہ جس وقت جس کو بھی وہ پیچھے ہٹنے کو کہے گا وہ ہٹ جائے گا اور جسے آگے بڑھنے کا حکم دے گا وہ بڑھ جائے گا۔ حالت جنگ میں اسے احکام کی وجہ بتانے پر بھی مجبور نہ ہونا چاہیے، کجا کہ اس کو ان کی جواب دہی کرنی پڑ جائے اور جنگ چھوڑ کر وہ ساری فوج مقدمہ بازی میں لگ جائے۔ فوج اگر چاہے تو کمانڈر بدل سکتی ہے، لیکن اگر اسے لڑنا اور اپنے مقصود کو پہنچنا ہے تو جسے بھی وہ کمانڈر بنائے

اس کو یہی اختیارات دینے ہوں گے' ورنہ بہتر ہے کہ وہ لڑائی کا خیال چھوڑ دے۔ اس فوج کو شکست ہی کے لیے نہیں' تباہی کے لیے بھی تیار ہو جانا چاہیے جو عین حالت مقابلہ میں اپنی مخالف طاقتوں کو خبر دے کہ اس کا کمانڈر' کمانڈر نہیں بلکہ جنرل اسٹاف کا محض ایجنٹ ہے' اور جنرل اسٹاف ایک مجلس مباحثہ (Debating Society) ہے جس میں فوجی افسر تدابیر جنگ سے گزر کر خود مقصد جنگ ہی پر دس دس پندرہ پندرہ دن مناظرہ کرتے رہتے ہیں' اور ہائی کمانڈ کے فیصلے اب فوجی افسروں کی اکثریت کے ووٹ' یا ان کے گروپوں کی مفاہمت پر موقوف ہو کر رہ گئے ہیں۔

تحریک کی قیادت اور جمہوری اداروں کی سربراہی میں ایک اور پہلو سے بھی فرق اور عظیم فرق ہے۔ جیسا کہ میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں' جمہوریت یہ نہیں چاہتی کہ اس میں کوئی بھی اتنا زورآور ہو جائے کہ اس کی رائے جمہور کی رائے کے تابع ہونے کے بجائے اس کی حاکم بن جائے۔ ایسا زور جہاں بھی پیدا ہونے لگے گا جمہوری مزاج اس کو ضرور توڑنا چاہے گا۔ ایک انگریز نے اپنی جمہوریت پسند قوم کے ذہن کی خوب ترجمانی کی ہے کہ ''ہم ہیروز کی پرستش تو کرتے ہیں مگر کسی ہیرو کی حکومت قبول نہیں کر سکتے''۔ یہ ہے جمہوریت کا مزاج۔ لیکن تحریک کے مزاج کا تقاضا اس کے بالکل برعکس ہے۔ کوئی تحریک اس کے بغیر نہیں چل سکتی کہ اس کو ایک شخصیت لے کر چلے جسے تحریک کے اندر بھی دلوں اور دماغوں پر غیر معمولی اثر حاصل ہو' اور تحریک کے گردوپیش عام پبلک میں بھی اس کے اثرات پھیلتے چلے جائیں۔ دینی تحریک ہو یا دنیوی' ایک شخصیت کے بغیر اس کا کام نہیں چلتا۔ اللہ تعالیٰ نے خود اسلامی تحریک کے لیے انبیاءؑ کی شخصیتیں سامنے لا کر رکھ دیں اور ان کا غیر معمولی وزن اپنی مشیت ہی سے نہیں' اپنے احکام سے بھی قائم کیا۔ انبیاءؑ کے بعد جب اور جہاں بھی کوئی دینی تحریک اُٹھی ہے ایک شخصیت کے بل پر اُٹھی ہے' اور بڑی بڑی شخصیتوں نے کسی دنیوی غرض کے لیے نہیں بلکہ خدا کے دین کی خاطر یہ ایثار کیا ہے کہ اپنا سارا وزن اس کے وزن میں شامل کر کے اس کا وزن بڑھایا اور گردوپیش کی دنیا میں اس کا اثر قائم کیا۔ پچھلی ہی صدی میں خود ہمارا ملک ایک عظیم الشان تحریک جہاد کا نظارہ کر چکا ہے۔ اس نے جو کارنامہ

انجام دیا اور جس وسیع پیمانے پر لاکھوں انسانوں کو متاثر کیا وہ اس کے کارکنوں کی خوبی سے زیادہ ایک شخصیت کے جادو کا اثر تھا اور اس جادو کو فروغ دینے میں شاہ اسماعیل شہید اور مولانا عبدالحئی اور بہت سی دوسری عظیم شخصیتوں نے حصہ لیا تھا۔ اسی صدی میں دو خالص دنیوی تحریکیں ہمارے برعظیم میں چل چکی ہیں۔ ایک نے برطانوی حکومت کا تختہ اُلٹ کر ہندوستان کو آزاد کرایا اور دوسری نے ہندوؤں کے حلق سے پاکستان اگلوالیا۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ یہ جو کچھ بھی کامیابی ان دونوں تحریکوں کو نصیب ہوئی' ایک ایک شخصیت کے بل پر ہی ہوئی؟ اور یہ دیکھ لیجئے کہ وقت کے کیسے کیسے بڑے لوگوں نے اپنی شخصیتوں کو ان دونوں لیڈروں کی شخصیتوں میں گم کر دیا تھا۔ یہ تحریکوں کا فطری مزاج ہے۔ کسی کو دین عزیز ہو یا وطن عزیز ہو' یا قوم عزیز' بہرحال جس کو بھی کسی مقصد عزیز کے لیے کوئی تحریک چلانی ہو اسے دل کی آمادگی کے ساتھ' یا سینے پر پتھر رکھ کر' ایک شخصیت گوارا کرنی پڑے گی' بلکہ خود بنانی اور دوسروں سے بنوانی پڑے گی۔ جمہوریت اس سے انکار کرتی ہے اور تحریک اس کا تقاضا کرتی ہے۔

میں نے تفصیل کے ساتھ یہ تجزیہ آپ کے سامنے اس لیے کیا ہے کہ آپ اس اجتماعِ ضدین کو اچی طرح سمجھ لیں جس پر جماعت اسلامی نے اپنے نظام کا ڈھانچہ اور اپنے کام کا نقشہ مرتب کیا ہے' اور ان مشکلات کو بھی سمجھ لیں جو آپ کی جماعت کے امیر کے دو بالکل مختلف و متضاد حیثیتیں نباہنے میں لازماً پیش آتی ہیں۔ آپ ایک طرف تو ایک جمہوری جماعت ہیں جس کا سارا کام ایک لگے بندھے ضابطے اور ایک مقرر دستور پر چلتا ہے۔ اور دوسری طرف آپ ایک تحریک لے کر چلتے ہیں جو بہت سی مزاحم طاقتوں کے مقابلے میں ایک ہمہ گیر اصلاح و انقلاب کے لیے برسرِ پیکار ہے۔ ان دونوں کاموں کی سربراہی آپ ایک آدمی کے سپرد کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جمہوری ادارے کے ناظم کی حیثیت سے وہ جمہوریت کے سارے تقاضے پورے کرے' اور تحریک کے رہنما کی حیثیت سے ان تقاضوں سے بھی عہدہ برآ ہو جو جمہوری تقاضوں کی عین ضد ہیں۔ آپ جماعت جس روز سے بنی ہے میں آج تک ان دونوں حیثیتوں کو بھلی طرح یا بُری طرح' بہرحال کسی نہ کسی طرح نباہتا رہا

ہوں، اور اس پر کسی داد کا نہ طالب ہوں نہ مستحق۔ جب تک میرے لیے کام کرنے کی کچھ بھی گنجائش رہی، میں نے خدمت سے منہ نہیں موڑا اور ہر طرح کے دردِ سر برداشت کیے۔ لیکن اب میرے لیے اس اجتماعِ ضدین کو نباہنا قریب قریب ناممکن ہو چکا ہے۔ میں کسی نظریے اور قیاس کی بنا پر نہیں بلکہ مسلسل تجربات کی بنا پر پوری طرح غور و خوض کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جماعت اسلامی میں جمہوریت اور تحریکیت کا تضاد، اور جماعت کی امارت میں نظم کی سربراہی اور تحریک کی رہنمائی کا تضاد، جواب تک کسی نہ کسی طرح ایک مزاج میں سمویا جاتا رہا ہے، اب اس حد کو پہنچ گیا ہے کہ اگر حکمت اور معاملہ فہمی کے ساتھ اس کا علاج بروقت نہ کیا گیا تو یہ جماعت اور تحریک دونوں کو لے ڈوبے گا۔ اس معاملے میں میری ذمہ داری دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، آپ سب لوگوں سے زیادہ سخت اور نازک ہے۔ میں بیس پچیس سال سے اس تحریک کو چلاتا آ رہا ہوں۔ اور پندرہ سال سے جماعت کی سربراہی کا بار بھی میرے اوپر رہا ہے حتیٰ کہ قید کے زمانے میں بھی اس بار سے میں پوری طرح سبکدوش نہیں ہو سکا ہوں۔ میرے لیے یہ برداشت کرنا ممکن نہیں ہے کہ خدا کے دین کی خاطر اس کے بہت سے مخلص بندوں نے جس چیز کی تعمیر کا سربراہ کار مجھے بنایا تھا، اب میری ہی سربراہی میں اس کی تخریب ہو۔ میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اولین فرصت میں تمام رفقائے جماعت کے سامنے وہ وجوہ بھی رکھ دوں جن کی بنا پر منصب امارت کی دوگونہ اور متضاد ذمہ داریاں میرے سپرد رہنا اس کام کے لیے تباہ کن ہے، اور یہ بھی بتا دوں کہ میرے نزدیک اب اس تضاد کے نقصانات سے جماعت اور تحریک کو بچانے کی کیا صورتیں ممکن ہیں۔

جماعت میں جمہوری میلانات اب اس رُخ پر چل پڑے ہیں کہ جدوجہد ہی کے مرحلے میں اس کے اندر مختلف الخیال افراد کی گروہ بندی شروع ہو گئی ہے۔ جمہوری نقطۂ نظر سے یہ چیز کسی طرح بھی قابل اعتراض نہیں، بلکہ عین تقاضائے جمہوریت ہے۔ آخر چند افراد، جو ایک خیال رکھتے ہوں، کیوں نہ ایک دوسرے سے ربط قائم کریں؟ کیوں نہ تحریر و تقریر اور بحث و گفتگو کے ذریعہ سے اپنے خیالات کی تبلیغ کریں؟ کیوں نہ زیادہ سے زیادہ

لوگوں کو اپنا ہم خیال بنائیں؟ کیوں نہ جماعت کے عام ارکان اور با اثر لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کریں؟ کیوں نہ باہمی تعاون کے ساتھ جماعتی مشوروں پر اپنا اثر ڈالیں؟ ان میں سے کوئی چیز بھی نہ جمہوریت کے خلاف ہے' نہ اسے ناجائز ہی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن جدو جہد کے مرحلے میں کسی تحریک کی علمبردار جماعت کے اندر جمہوریت کا یہ تجربہ سخت نقصان دہ' بلکہ مہلک ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ایک گروہ کے مقابلہ میں دوسرے گروہ بھی منظّم ہوں' جماعت کے اندر گروہوں کی کشمکش برپا ہو' امیر جماعت پوری تحریک اور جماعت کا لیڈر نہ رہے' بلکہ عملاً جماعت کے اندر اکثریت کا لیڈر بن کر رہ جائے' ایک جگہ اس کی ہدایات پر عمل ہو تو دوسری جگہ ان پر تنقید ہو رہی ہو اور ان کی تعمیل میں کم از کم سرد مہری برتی جائے' جماعت کے عام کارکنوں میں تذبذب' بے اطمینانی اور دودلی کی کیفیت پیدا ہو جائے' عوام الناس کے سامنے جماعت کے لوگ خود اپنے ان اختلافات کو پیش کر کے اپنی تحریک کی ہوا اکھاڑ دیں' امیر جماعت اس حالت کو فروغ پانے دے تو ایک ایسے کام کی بربادی کا مظلمہ اپنی گردن پر لے جو بیس پچیس سال کی مسلسل کوششوں سے اس ملک میں خدا کے دین کے لیے اس درجے کو پہنچا ہے کہ اب نہ صرف یہاں' بلکہ بیرونی دنیا میں بھی اسلام پسند لوگوں کی امیدیں اس کی کامیابی سے وابستہ ہو رہی ہیں' اور اگر وہ اسے روکنے کی کوشش کرے تو اس پر آمریت اور استبداد کے الزامات عائد ہوں' جماعت کے اندر اس کے اپنے دست و بازو اس کے خلاف خم ٹھونک کر کھڑے ہو جائیں' جماعت کے باہر علی الاعلان اس کے خلاف پروپیگنڈہ شروع ہو جائے' اچھے اچھے ذمہ دار لوگ جماعت سے نکلنے پر تیار ہو جائیں' اور مخالف طاقتیں اس پھوٹ کو دیکھ کر جماعت کے ان عناصر کی پیٹھ ٹھونکنے لگیں جن کے طرز فکر کو وہ اپنے مفاد کے لیے زیادہ مفید سمجھیں۔ جدوجد کے دَور میں جمہوریت کا یہ تجربہ ان نتائج کے سوا کوئی دوسرا نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا' اور بدقسمتی سے یہ نتائج رونما ہونے شروع ہو گئے ہیں۔

میں نے خوب غور کر کے یہ رائے قائم کی ہے' اور آپ حضرات بھی جذبات سے قطع نظر کر کے غور کریں گے تو اسی رائے پر پہنچیں گے کہ اس حالت میں میرا امیر جماعت رہنا

جماعت اور تحریک کے لیے بہت خطرناک ہے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ ابتداء سے اس تحریک اور اس جماعت کے ساتھ میرے تعلق کی نوعیت کیا رہی ہے' اور جماعت کے اندر ہی نہیں' باہر سارے ملک میں' اور ملک سے بھی باہر دنیا میں مجھ کو کیا حیثیت دی جاتی رہی ہے۔ یہ حیثیت بجا ہے یا بیجا' اس سے یہاں بحث نہیں ہے' بہرحال یہ ایک امر واقعہ ہے' اور اس کی موجودگی میں یہ بات آپ کے لیے غور طلب ہے کہ اگر میری یہ حیثیت مجروح ہو جائے تو اس سے جماعت کی ساکھ اور اس تحریک کے نفوذ و اثر کو جو نقصان پہنچے گا اس کی تلافی آپ اور کس طرح کر سکیں گے۔ میں امیر جماعت نہ رہوں اور میرے پاس میرے اخلاقی اثر اور میری دلیل کی طاقت کے سوا کوئی دوسری طاقت نہ ہو' تو میں بتدریج جماعت کو سمجھا کر جمہوریت کے اس قبل از وقت تجربے سے باز رکھ سکتا ہوں۔ لیکن نظام جماعت کا سربراہ بھی اگر اس وقت میں ہی رہوں تو اس حالت کی اصلاح کے لیے جو کوشش بھی کروں گا وہ محض ایک اخلاقی سعی نہ ہوگی بلکہ اس کے ساتھ نظم و ضبط کی طاقت بھی ہوگی۔ اس صورت میں لاکھ جتن بھی کروں تو میں نہ ایک فریق بننے سے بچ سکتا ہوں اور نہ اس شبہ ہی سے محفوظ رہ سکتا ہوں کہ اس وقت جمہوریت سے جماعت کو بچانے کے لیے میری کوشش اس دینی تحریک کے مفاد کے لیے نہیں بلکہ اپنی آمریت برقرار رکھنے کے لیے ہے۔ بیس پچیس سال تک اس تحریک کی خدمت کرنے سے میری جو کچھ بھی حیثیت بن گئی ہے وہ اسی صورت میں مفید ہو سکتی ہے جبکہ جماعت اور اس کے حلقۂ اثر کے ہر شخص کو مجھ پر اعتماد ہو' اور ہر ایک کے ساتھ میرا تعلق یکساں محبت و اخلاص کا ہو اور میرا اخلاقی اثر ان لوگوں پر بھی باقی رہے جو میری رائے سے اختلاف رکھتے ہوں۔ ایک فریق بن جانے اور طرح طرح کے شبہات و الزامات سے متہم ہو جانے کے بعد مجھے یہ چیز حاصل نہ رہے گی' اور اس کا نقصان اس سے بہت زیادہ ہوگا جو بظاہر آپ میرے امارت سے ہٹ جانے میں محسوس کرتے ہیں۔

ایک اور وجہ جو اس سے بھی زیادہ اہم' بلکہ میرے نزدیک سب سے زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ میری جو کچھ بھی شخصیت دین کی تھوڑی سی خدمت کرنے کی وجہ سے بن گئی ہے وہ اب دین کے کام آنے کے بجائے دین کی راہ میں حائل ہوتی نظر آ رہی ہے۔ بہت سی

باتیں جو پہلے جماعت کے حلقوں سے باہر‘ زیادہ تر مخالفین کی زبانوں سے سنی جاتی تھیں‘ اور خلافِ واقعہ بدگمانی سمجھ کر نظر انداز کر دی جاتی تھیں‘ اب وہ خود جماعت میں اچھے اچھے ذمہ دار لوگوں کی زبان و قلم پر آنے لگی ہیں‘ اور یہ ممکن نہیں رہا ہے کہ ان کو بھی نظر انداز کیا جائے۔ جو خیالات ظاہر کیے گئے ہیں، اور جن کو میں یقینی ذرائع سے جانتا ہوں وہ یہ ہیں کہ میری وجہ سے جماعت اسلامی میں شخصیت پرستی پیدا ہو رہی ہے۔ میری امارت دراصل ایک پیری کی گدی ہے اور یہ جماعت میرے مریدوں کی جماعت ہے۔ اس جماعت میں میری بات میری دلیل کی طاقت اور میری رہنمائی پر ہوشمندانہ اعتماد کی وجہ سے نہیں چلتی بلکہ میری شخصیت کے ساتھ لوگوں کی اندھی عقیدت کی وجہ سے چلتی ہے۔ اس میں کسی آزاد فکر اور مستقل رائے رکھنے والے آدمی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے‘ کیونکہ وہ میرے مقابلے میں اپنی بات نہیں منوا سکتا۔ جماعت میں جو کوئی میری بات کی تائید کرتا ہے اس کی تائید کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ عقل و بصیرت کی بنا پر مجھ سے اتفاق رکھتا ہے‘ بلکہ دراصل یا تو وہ خوشامدی ہے یا اندھا مرید۔ مجھ سے اختلاف ایک خوبی ہے‘ کیونکہ وہ اخلاقی جرأت اور استقلال رائے کی علامت ہے‘ اور میری تائید ایک برائی ہے کیونکہ اس کی وجہ خوشامد یا اندھی عقیدت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس حالت میں ضمیر اور عقل و علم رکھنے والوں کے لیے دو ہی راستے رہ گئے ہیں۔ یا تو وہ جماعت کو چھوڑ کر چلے جائیں‘ یا پھر جماعت میں رہ کر اس شخصیت کے بت کو توڑنے کی فکر کریں۔

اپنے بہترین اور عزیز ترین رفقاء کے یہ خیالات جب سے میرے علم میں آئے ہیں‘ میں اس فکر میں لگ گیا ہوں کہ اس بت کے توڑنے کا اجر و ثواب ان سے پہلے میں خود لُوٹ لے جاؤں۔ خدا کی لعنت اس شخصیت پر جو خدا کی راہ میں کام آنے کے بجائے اس کے راستے میں بُت بن کر کھڑی ہو جائے۔ اس کو توڑنے کے لیے پہلا کام تو میں یہ کرتا ہوں کہ اس پیری کی گدی کو آپ کے سامنے لات مار کر عام ارکان کی صف میں آ رہا ہوں۔ اس سے بھی کام نہ چلے گا تو زبان و قلم پر قفل چڑھا کر کسی گوشے میں بیٹھ جاؤں گا۔ پھر بھی یہ شخصیت راہِ خدا میں حائل رہی تو ملک چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں گا۔ میں اس شخصیت کو ختم کرنے کے

لیے خودکشی تو نہیں کرسکتا، کیونکہ یہ جائز نہیں ہے' اور یہ بھی نہیں کرسکتا کہ کسی گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کرکے اسے ذلیل کروں۔ البتہ دوسری ہر وہ تدبیر اختیار کرنے کے لیے تیار ہوں جس سے شخصیت کا یہ بُت خد کے راستہ سے ہٹ سکے۔

محترم رفقاء! یہ ہیں وہ وجوہ جنہوں نے مجھے اس بات پر مطمئن کردیا ہے کہ میرا اب جماعت کی امارت سے ہٹ جانا ضروری ہے' اور اس پر ٹھہرنا نقصان دہ۔ کسی کو یہ غلط فہمی لاحق نہ ہونی چاہیے کہ مجھ سے کوئی قصور ہوگیا ہے جس کی جوابدہی سے میں ڈرتا ہوں۔ اس لیے استعفاء دے کر اس پر پردہ ڈال رہا ہوں۔ جو شخص بھی ایسا خیال رکھتا ہو میں اسے قسم دیتا ہوں کہ میری ذاتی زندگی کا جو عیب بھی اسے معلوم ہے' یا میرے زمانہ امارت کے جس کام کو بھی وہ انصاف' یا دیانت' یا دستور جماعت کے خلاف سمجھتا ہے' اسے یہاں پوری جماعت کے سامنے علی الاعلان پیش کردے۔ میں اس وقت تک یہاں سے نہ ہٹوں گا جب تک اس کی جوابدہی نہ کرلوں۔ اور جماعت کو خدا کا واسطہ دے کر کہوں گا کہ وہ میرے ساتھ کسی رعایت سے کام نہ لے' بلکہ اگر میرے اوپر کوئی الزام ثابت ہو تو میرا استعفاء قبول کرنے کے بجائے عدم اعتماد کی تجویز پاس کرکے مجھے معزول کرے۔

اسی طرح اگر کسی کا یہ خیال ہو کہ میں اپنی کچھ باتیں منوانے کے لیے استعفاء کو دھمکی کے طور پر استعمال کررہا ہوں تو وہ بھی اپنے دل سے یہ خیال نکال دے۔ میں پہلے یہ کہہ چکا ہوں اور پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ میں نے یہ استعفاء واپس لینے کے لیے نہیں دیا ہے۔ خوب سوچ سمجھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میرا امیر جماعت رہنا اب اس کام کے لیے مفید نہیں بلکہ اُلٹا نقصان دہ ہے' اور اس رائے کے وجوہ میں نے بے کم و کاست آپ کے سامنے پیش کردیئے ہیں۔ اس پر بھی یہ بدگمانی باقی رہ جائے کہ جب دلیل نہیں چلتی تو میں استعفے کی دھمکی سے کام نکالتا ہوں' تو میرے پاس اس کا کوئی علاج نہیں۔

اب میں وضاحت کے ساتھ آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میرے نزدیک آئندہ کے لیے کیا انتظام ہوگا۔

سب سے پہلے آپ کو یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ آپ جماعت کی قیادت کے لیے کس

طرح کا انتظام پسند کرتے ہیں۔

اس کی ایک شکل یہ ہے کہ آپ امیر جماعت کو صرف نظم جماعت کا سربراہ بنا کر رکھیں اور تحریک کسی ایک شخص کی راہنمائی میں نہ چلے بلکہ عام جمہوری اداروں کی طرح اجتماعی فیصلوں سے چلے' اور امیر جماعت کا کام ان فیصلوں کو نافذ کرنے سے زیادہ کچھ نہ ہو۔ اس طرز پر تحریک چلانے کا تجربہ آپ کرنا چاہیں تو کر لیں۔ آپ جماعت میں درجنوں ایسے آدمی پا سکتے ہیں جو اس حیثیت سے جماعت کے مرکزی صدر کی خدمت انجام دینے کی پوری قابلیت رکھتے ہیں۔ میرے ہٹ جانے سے اس صورت میں سرے سے کوئی خلا واقع نہیں ہوتا۔

دوسری شکل یہ ہے کہ آپ امیر جماعت کو بیک وقت اپنے جمہوری نظام کا سربراہ بھی رکھنا چاہیں اور تحریک کا رہنما بھی۔ یہ اگر آپ کی مرضی ہو تو آپ مجھے چھوڑ کر جماعت کے ذمہ دار لوگوں میں سے جس کو مناسب سمجھیں اپنا امیر چُن لیں۔ میں ہر اس شخص کی اطاعت اور وفادارانہ رفاقت کا عہد کرتا ہوں جسے آپ امیر بنائیں۔ جو خدمت بھی مجھ سے لی جائے گی اس کے بجالانے میں مجھے ذرہ برابر تامل نہ ہوگا۔ میری شخصیت اگر آپ کے منتخب کردہ امیر کی مددگار بن سکے گی تو یہاں پائی جائے گی' ورنہ اس سے نجات پانے کے لیے آپ کو کسی فکر کی ضرورت نہ پیش آئے گی۔ اس کا استیصال ان شاء اللہ میں خود کروں گا۔

تیسری شکل یہ ہے کہ آپ نظامِ جماعت کی امارت اور تحریک اسلامی کی رہنمائی کو ایک دوسرے سے الگ کر دیں۔ اس صورت میں جماعت کا سارا نظم دستور کے مطابق ایک امیر چلاتا رہے گا، اور تحریک بھی اسی جماعتی مشینری کے ذریعہ سے چلے گی' مگر تحریک کی رہنمائی ایک ایسا شخص کرے گا جس کے لیے دستور میں کوئی نام اور کوئی منصب اور کوئی ضابطے کا اختیار و اقتدار نہ ہوگا۔ اس کی جگہ اگر ہوگی تو آپ کے دستور میں نہیں بلکہ آپ کے دلوں میں ہوگی۔ آپ اسے باقاعدہ منتخب نہ کرینگے بلکہ محض اعتماد کی بنا پر اس کی رہنمائی قبول کریں گے۔ اس کے پاس اپنے فیصلے نافذ کرنے کے لیے کوئی طاقت نہ ہوگی بلکہ آپ کا امیر اور آپ کی مجلس شوریٰ اور آپ سب اپنی مرضی سے خود چاہیں گے تو اس کے مشوروں پر چلیں

گے اور اس کی قیادت میں کام کریں گے۔ جب تک آپ چاہیں اس کو رہنما بنا کر رکھیں اور اسے اپنا لیڈر مانتے رہیں۔ یہ بالکل آپ کا اپنا اختیاری فعل ہوگا۔ اور جب کبھی آپ اس سے جان چھڑانا چاہیں تو یہ بات بالکل کافی ہوگی کہ اس کے کہے پر چلنا چھوڑ دیں۔ اس کے لیے سرے سے کسی جھگڑے اور کسی ضابطے کی کارروائی کا سوال پیدا ہی نہ ہوگا۔

اس آخری صورت کا تجربہ آپ کرنا چاہیں تو نظم جماعت کے لیے بس ایک میر چُن لیجئے۔ رہا رہنمائے تحریک تو وہ آپ کی رائے عام سے خود اس مقام پر آ جائے گا۔ اس معاملہ میں کسی رائے دہی اور کسی انتخاب کی کوئی حاجت نہیں' کیونکہ یہ کوئی دستوری چیز نہیں ہے۔

لیکن ضروری تنبیہہ کے طور پر میں دو باتیں پہلے ہی آپ سے عرض کیے دیتا ہوں۔ ایک یہ کہ جماعت کی موجودہ شخصیتوں میں سے جس کسی کو بھی آپ رہنمائی کا مقام دیں وہ اسی صورت مُں اس تحریک کی کوئی خدمت انجام دے سکے گا جبکہ باقی تمام شخصیتیں اس کی پیش روی کو خواستہ یا ناخواستہ گوارا کرنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ دینی لحاظ سے قطع نظر' دنیوی وجاہت و قابلیت اور ناموری کے لحاظ سے ہمارے درمیان شاید ہی کوئی شخصیت اس پائے کی ہو جس پائے کی شخصیت کانگرس میں جمع ہوئی تھیں۔ مگر آپ نے دیکھا کہ ان لوگوں نے خدا کی خاطر نہیں' کسی اَجر آخرت کی اُمید رنہیں' صرف آزادی وطن کی خاطر گاندھی کی شخصیت کا نہ صرف تابع ہونا گوارا کیا بلکہ اس کی بڑائی خود قائم کی۔ اور اس کا نتیجہ آپ سب لوگ دیکھ چکے ہیں۔ ہم بھی اگر دنیا میں خدا کا کلمہ بلند کرنا چاہتے ہیں۔ تو کسی ایک آدمی کو آگے کر کے سب کو اس کے پیچھے چلنا ہوگا' اور خدا ہی کی خاطر اس کی شخصیت میں اپنی شخصیتوں کو گم کر دینا پڑے گا۔ یہ قربانی دینے کے لئے کوئی تیار ہو یا نہ ہو' میں اس کے لیے سچے دل سے تیار ہوں۔ آپ جس کو بھی بالاتفاق اپنا رہنما مان لیں گے' میں خدا کو اور آپ سب کو گواہ کر کے اعلان کرتا ہوں کہ اپنا سب کچھ لا کر اس کے قدموں میں ڈال دوں گا۔

دوسری بات جو یہ کام کرنے سے پہلے آپ کو خوب سمجھ لینی چاہیے وہ یہ ہے کہ کشمکش کے دَور میں ایک تحریک کی رہنمائی کا کام ایک ڈرائیور کے کام سے ملتا جلتا ہوتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں آپ موٹر کا اسٹیرنگ وہیل دے رہے ہوں اس کے متعلق اچھی طرح اطمینان کر

لیجئے' اور چلنے سے پہلے یہ بھی طے کر لیجئے کہ کہاں جانا ہے اور کس طرف سے جانا ہے۔

مزید جو مشورے یا ہدایات بھی آپ دینا چاہیں آغازِ سفر میں دے دیجئے۔ لیکن جب ڈرائیور اسٹیرنگ وہیل سنبھال کر پُر ہجوم راستوں سے گاڑی لیے جا رہا ہو' اس وقت گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگ چاہے بجائے خود کیسے ہی ماہر ڈرائیور ہوں' اور چاہے خود موٹر کے بنانے والے انجنیئر ہی کیوں نہ ہوں' ڈرائیور کو بار بار مشوروں اور ہدایات اور احکام اور نقد و تبصرے سے نواز کر صرف حادثہ ہی مول لے سکتے ہیں، بخیریت منزل پر نہیں پہنچ سکتے۔ اس لیے کہ اس وقت صرف ڈرائیور ہی کی قوت فیصلہ یہ طے کر سکتی ہے کہ کس ہجوم سے گاڑی کو کس طرح نکالے' آتی جاتی گاڑیوں سے اپنی گاڑی کو کیسے بچائے' کس گاڑی کو آگے نکلنے دے اور کس سے خود آگے نکل جائے، اور ایک طرف سے اگر راستہ بند ہو تو دوسری طرف سے کس طرح اپنا راستہ نکالے۔ ایسے مواقع پر مشورے کی ضرورت ہو گی تو ڈرائیور خود اسے محسوس کر کے مشورہ لے گا، کچھ پوچھنا ہو گا تو وہ خود پوچھے گا، کوئی ہدایت طلب کرنی ہو گی تو وہ خود طلب کر لے گا، دوسروں کے لیے' اگر وہ بخیریت سفر کرنا چاہتے ہوں' اس کے سوا کوئی کام نہیں ہے کہ وہ صبر کے ساتھ چلے چلیں۔ حتیٰ کہ اگر حادثہ بھی ہوتا نظر آئے تو ضبط سے کام لیں' اس لیے کہ خطرے کے موقع پر شور مچانے یا اسٹیرنگ وہیل پر ہاتھ ڈالنے کے معنی یہ ہیں کہ حادثہ نہ ہوتا ہو تو ہو جائے۔ آپ ڈرائیور بدلنا چاہیں تو بدل دیں' مگر جسے بھی ڈرائیور بنائیں اس کو اطمینان کے ساتھ گاڑی چلانے دیجئے۔ جو شخص اسے آمریت سمجھ کر اس پر صبر نہ کر سکتا ہو اس کا گاڑی سے اُتر جانا اس سے بہتر ہے کہ وہ خود بھی حادثے سے دوچار ہو اور پوری موٹر کو بھی اس کے مسافروں سمیت خطرے میں مبتلا کرے۔ تاہم اگر آپ لوگ ایک دفعہ تمام موٹر نشینوں کی مشترک ڈرائیوری کا تجربہ کرنا چاہیں تو میں آپ کو اس سے منع نہیں کرتا۔ میں اس میں بھی آپ کے ساتھ ہوں۔ جو کچھ آپ سب کا حشر ہو گا میرا بھی ہو جائے گا۔ البتہ اس صورت میں اسٹیرنگ وہیل ہاتھ میں لینے کی ذمہ داری آپ مجھ پر ڈالنا چاہیں گے بھی تو میں اسے کبھی قبول نہ کروں گا۔ اس اسکیم میں میری جگہ محض ایک خاموش مسافر کی ہو گی جو گاڑی اور اس کے مسافروں کی سلامتی کے لیے دعا کرنے کے سوا کچھ نہ کرے گا۔"

ضمیمہ ۲

میاں طفیل محمد امیر جماعت اسلامی پاکستان

کی جانب سے

مسئلہ خواتین' اور ''الھدٰی'' کے ضمن میں تائید کا شکریہ

اور ''دعوتِ اتحاد'' پر ''تعاون علی البر'' کی پیشکش!

(شائع شدہ ''میثاق'' جولائی ۱۹۸۲ء)

محترمی و مکرمی میاں صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

مزاج گرامی!

مسلمان معاشرے میں خواتین کے فرائض اور دائرہ کار کے بارے میں میری ایک رائے کے خلاف جو مظاہرہ کراچی کی کچھ مغرب زدہ خواتین کی جانب سے ہوا تھا اس پر آپ کا جو مومنانہ ردّ عمل سامنے آیا اور میرے ٹی وی پروگرام ''الھدٰی'' کو جاری رکھنے کا جو پُر زور مطالبہ آپ نے کیا اس پر میری جانب سے ہدیۂ تشکر قیم تنظیم اسلامی قاضی عبد القادر صاحب نے آپ کو پہنچا دیا تھا اور اس پر آپ کا جواب بھی جناب اسلمی سلیمی صاحب کی وساطت سے مجھے مل گیا تھا۔ یعنی یہ کہ آپ نے جو کچھ کیا نصح دینی کے جذبے کے تحت اور اپنا فرض سمجھ کر کیا جس پر کسی شکریے کی آپ کو ضرورت نہیں ہے۔ میرے نزدیک یہ بھی آپ کے خلوص و اخلاص ہی کا مظہر ہے! (حال ہی میں مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے ایک بزرگ

رفیق کار شیخ جمیل الرحمٰن صاحب نے بھی آپ کو شکریے کا خط لکھا تھا اور اُن کے نام جوابی خط میں بھی آپ نے ان ہی جذبات کا اظہار فرمایا ہے)۔

اس وقت ملک میں خواتین کو مردوں کے ''شانہ بشانہ'' لانے کا جو عمل اسلامی حدود و تعزیرات کے نفاذ اور ملکی قوانین خصوصاً عدالتی نظام کو ''اسلامیانے'' کے ''شانہ بشانہ'' جاری ہے، میرے خیال میں اسی پر زیادہ سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے بالخصوص اس تازہ خبر کا نوٹس ضرور لیا جانا چاہیے کہ خواتین کو تمام یونین کونسلوں کی سطح پر نمائندگی ملے گی۔ اور اس طرح ایک اخباری اندازے کے مطابق سیاسی میدان میں فعال خواتین کی تعداد ایک دم دس گنا ہو جائے گی۔

میرے اس عریضے کی تحریر کا اصل محرک آپ کی اُس تقریر کی اخباری رپورٹ ہے جو آپ نے پچھلے دنوں لاہور میں ''تعلیم القرآن کانفرنس'' میں کی تھی جس میں اس اخباری اطلاع کے مطابق آپ نے جملہ مسلمانانِ پاکستان کو دعوت دی تھی کہ وہ اسلام اور قرآن کی اساس پر متحد ہو جائیں ----- اس ضمن میں، میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اگر یہ اخباری اطلاع درست ہے تو آپ کے پاس اس ''اتحاد'' کے لیے تفصیلی پروگرام کیا ہے؟ اور آیا اس سے مراد (کالعدم) جماعت اسلامی میں شمولیت کی دعوت ہے یا یہ کسی وسیع تر دینی اتحاد کی پیشکش ہے؟ اور اگر یہ وسیع تر دینی اتحاد کی دعوت ہے تو بالفرض اگر میں آپ کی اس پکار پر لبیک کہوں تو ایک طرف مجھے کیا تقاضے پورے کرنے ہوں گے اور آپ کی مجھ سے توقعات کیا ہوں گی، اور دوسری طرف اس مجوزہ ''تعاون علی البر والتقویٰ'' کے ضمن میں اشتراکِ عمل کے لیے کونسا میدان کار آپ کے سامنے ہے؟

میں چونکہ یہ سوال محض سرراہے، یا برسبیل شغل نہیں کر رہا ہوں بلکہ اس میں پوری طرح سنجیدہ ہوں لہٰذا اس کے باوصف کہ میرا گمان ہے کہ تحریک اسلامی کے قائد ہونے کے ناطے آپ ان امور سے ناواقف نہیں ہوں گے، تاہم اپنے بارے میں چند وضاحتیں کیئے دیتا ہوں:

ا۔ مولانا مودودی مرحوم و مغفور کے مجموعی دینی فکر میں دین کے باطنی عنصر (یعنی وہ

Esoterie Element جو عام طور پر ''تصوف'' کے عنوان سے جانا پہچانا جاتا ہے) کی کمی کو شدت کے ساتھ محسوس کرنے کے باوجود دین کا جو انقلابی اور تحریکی تصور انہوں نے پیش فرمایا اور خصوصاً فرائض دینی کی جو نشان دہی انہوں نے کی اُس کا میں نے صرف یہ کہ پوری طرح قائل ہوں بلکہ اپنی بساط بھر اُس پر عامل بھی ہوں۔ فللہ الحمد!!

۲۔ جماعت اسلامی کی قبل از تقسیم ہند پالیسی کو مجموعی اعتبار سے میں آج بھی صحیح سمجھتا ہوں۔ البتہ جماعت اسلامی پاکستان کی بعد از تقسیم پالیسی کو میں صرف غلط ہی نہیں سابقہ موقف سے انحراف کا مظہر سمجھتا ہوں، اور اپنے مقدور بھر کوشش اس امر کی کر رہا ہوں کہ اس سابقہ نہج پر ایک تحریک دوبارہ اُٹھے۔ اور اگرچہ میں خوب جانتا ہوں کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے اور تحریکیں روز روز نہیں اُٹھا کرتیں لیکن اپنے شعورِ فرض کے مطابق کوشش کرتے ہوئے جان جاں آفریں کے سپرد کر دیے میں' میں کامیابی کی واحد صورت مضمر دیکھتا ہوں۔ لہٰذا جیسے تیسے کوشش میں لگا ہوا ہوں تا کہ اور کچھ نہیں تو اللہ تعالیٰ کے حضور ''معذرت'' تو پیش کر سکوں!

۳۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ثلث صدی کی سیاسی جدو جہد کے حاصل اور دو بار کے شدید مایوس کن اور تلخ تجربوں کے بعد اب جماعت کا مجموعی رخ سیاست سے دعوت و تبلیغ کی طرف مڑ رہا ہے۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ اگر اس تبدیلی میں انقلابی رنگ شعوری اور واضح طور پر اجاگر نہ ہوا تو یہ تبدیلی مفید نہیں بلکہ مضر ہو گی۔ اور اس انقلابی رنگ کو شعوری اور واضح طور پر از سر نو اجاگر کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ سابقہ غلطی کا واضح اور برملا اعتراف واعلان ہو اور یہی وہ اصل شکل ہے جس کے حل کی کوئی امید نہیں' بقول اقبال ؏ ''منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں!'' تاہم اس سب کے باوجود اگر کسی وسیع تر دینی اتحاد اور اشتراکِ عمل کا کوئی واضح پروگرام آپ کے سامنے ہو تو انشاء اللہ العزیز آپ مجھے اور میرے ساتھیوں کو اس ضمن میں 'انا اول المسلمین' کی سی شان کے ساتھ پیش قدمی کرتے ہوئے پائیں گے!!

امید ہے کہ آپ جواب سے جلد نوازیں گے۔

اگر آپ اس سلسلے میں مجھ سے کسی گفتگو یا تبادلہ خیال کی ضرورت محسوس فرمائیں تو بلا جھجک جب چاہیں طلب فرمالیں، میں بخوشی حاضر ہو جاؤں گا۔

فقط والسلام

خاکسار

اسرار احمد عفی عنہ

میاں طفیل محمد صاحب کا جواب (بلاتبصرہ!)

محترمی ومکرمی ڈاکٹر صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ گرامی نامہ ملا۔ یاد فرمائی کا شکریہ۔ قطع نظر اس اخباری رپورٹ کے جس کا حوالہ آپ نے اپنے خط میں دیا ہے' تحریک اسلامی کے بنیادی نکاتِ دعوت میں سے ایک نکتہ امت مسلمہ کا اتحاد ہے' اسی بنا پر ہم مسلمانانِ پاکستان کو بھی اتحاد واتفاق کی دعوت دیتے ہیں اور اس کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ اسلام کے بنیادی عقائد اور اصولی احکام متفق علیہ ہیں اس لیے سب کو انہی کو بنیاد بنا کر کام کرنا چاہیے اور انہی پر زور دینا چاہیے۔ فروعی اختلافات کو جائزہ حدود کے اندر رکھنا چاہیے اور انہیں تفرقہ اور جدال کا سبب نہیں بننا چاہیے۔ اگر اس بات پر اتفاق کر لیا جائے اور اس کے مطابق عمل کیا جائے تو وہ آویزش اور کشیدگی جو آج مسلمانوں کے مختلف فرقوں' گروہوں اور جماعتوں کے مابین پائی جاتی ہے وہ ''تعاون علی البر والتقویٰ'' میں بدل سکتی ہے اور اقامت دین کی منزل جو ہر مسلمان کا مقصود ہونا چاہیے بہت قریب آ سکتی ہے۔

جہاں تک اشتراک عمل کا تعلق ہے اس کے لیے اس بنیادی اتفاق کے بعد طریق کار اور حکمت عملی کی یکسانی بھی درکار ہے۔ اب آپ خود ہی غور فرما لیں کہ تحریک یا جماعت اسلامی کے بارے میں جب آپ یہ فرماتے ہیں۔ ''البتہ جماعت اسلامی پاکستان کی بعد از تقسیم پالیسی کو میں صرف غلط ہی نہیں سابقہ موقف سے انحراف کا مظہر سمجھتا ہوں''۔ تو اس کے بعد اشتراک عمل کی کیا بنیاد باقی رہ جاتی ہے۔ ایسی صورت میں جب تک طریق کار اور حکمت عملی پر اتفاق نہ ہو جائے دین کے مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے اپنے طریق کار اور پالیسی کے مطابق اقامت دین کا مثبت کام کیا جائے اور کسی دوسرے کے کام کو پبلک پلیٹ فارم پر یا پریس میں ہدف ملامت ونکتہ چینی نہ بنا جائے۔

والسلام

خاکسار

(طفیل محمد)